ہجری اسلامی سال کے بارہ مہینوں سے متعلق اسلامی تعلیمات پر مشتمل مفید کتابوں کا بہترین مجموعہ جس میں اسلامی تہواروں اور وقتی دینی عبادات کے فضائل و مسائل قرآن و حدیث اور فقہ کی روشنی میں پوری تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں اور بتلایا گیا ہے کہ ایک مسلمان کو ان مواقع پر کیا کرنا چاہیے اور وہ کون سے رسوم و رواج ہیں جن سے بچنا ہمارے لیے ضروری ہے۔

بارہ ۱۲ مہینوں کے فضائل و احکام

محرم الحرام
صفر المظفر
ربیع الاول
ربیع الثانی
جمادی الاولیٰ
جمادی الثانیہ
رجب المرجب
شعبان المعظم
رمضان المبارک
شوال المکرم
ذوالقعدہ
ذوالحجہ

— مجموعہ رسائل —

(۱) حضرت مولانا مفتی سید عبدالکریم صاحب گمتھلوی رحمۃ اللہ علیہ
مجاز بیعت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

(۲) صاحبزادہ حضرت مولانا مفتی سید عبدالشکور ترمذی صاحب
مہتمم مدرسہ عربیہ حقانیہ ساہیوال ضلع سرگودھا

ناشر
اِدارۂ اِسلامیات ○ ۱۹۰۔ انارکلی ○ لاہور ۲

بارہ مہینوں کے فضائل و احکام

محرم الحرام
صفر المظفر
ربیع الاول
ربیع الثانی

جمادی الاولیٰ
جمادی الثانیہ
رجب المرجب
شعبان المعظم

رمضان المبارک
شوال المکرم
ذوالقعدہ
ذوالحجہ

ہجری اسلامی سال کے بارہ مہینوں سے متعلق اسلامی تعلیمات پر مشتمل مفید کتابوں کا بہترین مجموعہ جس میں اسلامی تہواروں اور وقتی دینی عبادات کے فضائل و مسائل قرآن وحدیث اور فقہ کی روشنی میں پوری تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں اور بتلایا گیا ہے کہ ایک مسلمان کو ان مواقع پر کیا کرنا چاہیے اور وہ کون سے رسوم و رواج ہیں جن سے بچنا ہمارے لیے ضروری ہے۔

مجموعہ رسائل

مولانا مفتی سید عبد الکریم صاحب گمتھلوی رحمۃ اللہ علیہ

مجاز بیعت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب قدس سرہ

مفتی سید عبد الشکور ترمذی

مہتمم مدرسہ عربیہ حقانیہ ساہیوال ضلع سرگودھا

البشریٰ

ویلفیئر اینڈ ایجوکیشنل ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرات اہل علم، عزیز طلبہ اور معزز قارئین کی خدمت میں گذارش:

الحمدللہ! اس کتاب کی تصحیح کی حتی الوسع کوشش کی گئی ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی غلطی نظر آئے یا کوئی مفید تجویز ہو تو براہ کرم تحریر کر کے ہمیں ضرور ارسال فرمائیں تا کہ آئندہ اشاعت بہتر اور غلطی سے پاک ہو سکے۔

جزاکم اللہ تعالیٰ خیراً

البشریٰ ویلفیئر اینڈ ایجوکیشنل ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

برائے خط و کتابت: 9/2 سیکٹر 17، کورنگی انڈسٹریل ایریا بالمقابل محمدیہ مسجد، بلال کالونی کراچی۔

کتاب کا نام : بارہ مہینوں کے فضائل و احکام

مؤلف : مولانا مفتی سید عبدالکریم صاحب گمتھلوی رحمہ اللہ، مفتی سید عبدالشکور ترمذی

قیمت برائے قارئین: فہرست کتب ملاحظہ فرمائیں۔

سن اشاعت : ۱۴۳۶ھ/۲۰۱۵ء

ناشر : البشریٰ ویلفیئر اینڈ ایجوکیشنل ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

7/275 ڈی ایم سی ایچ سوسائٹی، بالمقابل عالمگیر روڈ، کراچی۔ پاکستان

فون نمبر : (+92) 21-35121955-7

ویب سائٹ : www.maktaba-tul-bushra.com.pk
www.albushra.edu.pk

ای میل : info@maktaba-tul-bushra.com.pk
info@albushra.edu.pk

ملنے کا پتہ : البشریٰ ویلفیئر اینڈ ایجوکیشنل ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، کراچی۔ پاکستان

موبائل نمبر : (+92) 0321-2196170, 0334-2212230, 0302-2534504, 0314-2676577, 0346-2190910

اس کے علاوہ تمام مشہور کتب خانوں میں بھی دستیاب ہے۔

فہرست مضامین

الفضائل والأحكام

للشهود والأيّام

از

حضرت مولانا سید مفتی عبدالکریم صاحب گمتھلوی رحمۃ اللہ علیہ
مفتی خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون۔ وخلیفہ ارشد حکیم الامت
حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى

عاشورا
یعنی
محرم کی فضیلت اور منکرات مروجہ کی مذمت

ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ سب روزوں سے افضل رمضان کے بعد اللہ تعالیٰ کا مہینہ محرم ہے (یعنی اس کی دسویں تاریخ کو روزہ رکھنا رمضان کے سوا اور سب مہینوں کے روزے سے زیادہ ثواب رکھتا ہے)۔[1] اور جب آں حضرت ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو یہود کو عاشورا کا روزہ رکھتے ہوئے پایا۔ اس لیے آپ نے اُن سے فرمایا: یہ کیا دن ہے جس میں تم روزہ رکھتے ہو؟ انھوں نے کہا: یہ بڑا دن ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قوم کو نجات عطا فرمائی اور فرعون اور اس کی قوم غرق ہوئی۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے اس کا روزہ بطورِ شکر کے رکھا تو ہم بھی اس کا روزہ رکھتے ہیں۔ پس ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: تو ہم زیادہ حق دار اور قریب ہیں موسیٰ علیہ السلام کے تم سے۔ پھر حضور ﷺ نے اس کا روزہ رکھا اور (دوسروں کو) اس کے روزے کا حکم دیا۔[2]

ونیز ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: میں امید رکھتا ہوں حق تعالیٰ جل شانہٗ سے کہ عاشورا کا روزہ کفارہ ہوجاتا ہے اُس سال کا (یعنی اس سال کے چھوٹے گناہوں کا) جو اس سے پیشتر (گزر چکا) ہے۔[3] اور حدیث شریف میں ہے کہ جب رسولِ خدا ﷺ نے روزہ رکھا اور اس کے روزہ کا حکم دیا تو انھوں نے (یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم نے) عرض کیا کہ یہ ایسا دن ہے جس کو یہود اور نصاریٰ معظم سمجھتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں آیندہ سال تک زندہ رہا تو نو ۹ تاریخ کو (بھی) ضرور روزہ رکھوں گا۔[4] اور ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: روزہ رکھو تم عاشورا کا اور

---
[1] مسلم [2] متفق علیہ [3] مسلم [4] مسلم

مخالفت کرو اس میں یہود کی اور (وہ اس طرح کہ) روزہ رکھو اس سے ایک دن پہلے کا یا ایک دن بعد کا (غرض تنہا عاشورا کا روزہ نہ رکھو، اس سے ایک دن پہلے کا یا بعد کا ملا لینا چاہیے)۔[1]

اور حدیث شریف میں ہے کہ عاشورا کا روزہ رمضان (کے روزے فرض ہونے) سے پیشتر (بطورِ فرضیت) رکھا جاتا تھا۔ پس جب رمضان (کے روزوں کا حکم) نازل ہوا تو جس نے چاہا (عاشورا کا روزہ) رکھا اور جس نے چاہا نہ رکھا۔[2] اور ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: جس شخص نے فراخی کی اپنے اہل وعیال پر خرچ میں عاشورا کے دن، فراخی کرے گا اللہ تعالیٰ اس پر (رزق میں) تمام سال۔[3] پس یہ دو باتیں تو کرنے کی ہیں: ایک روزہ رکھنا کہ وہ مستحب ہے۔ دوسرے مصارف میں کچھ فراخی کرنا (اپنی حیثیت کے موافق) اور یہ مباح ہے۔ اس کے علاوہ اور سب باتیں جو اس دن میں کی جاتی ہیں خرافات ہیں۔

لوگ اس دن میلہ لگاتے ہیں اور حضرات اہلِ بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مصائب کا ذکر کرتے ہیں اور ان کا ماتم کرتے ہیں اور مرثیہ پڑھتے ہیں اور روتے چلاّتے بھی ہیں۔ اور بعض لوگ تو تعزیہ اور علم وغیرہ بھی نکالتے ہیں اور اُن کے ساتھ شرک وکفر کا معاملہ کرتے ہیں۔ یہ سب باتیں واجب الترک ہیں، شریعت میں اس ماتم وغیرہ کی کوئی اصل نہیں ہے بلکہ ان سب امور کی سخت ممانعت آئی ہے۔

تنبیہ: بعض لوگ اس روز مسجد وغیرہ میں جمع ہوکر ذکرِ شہادت وغیرہ سناتے ہیں۔ اس میں ثقہ لوگ بھی غلطی سے شریک ہوجاتے ہیں، اور بعض اہلِ علم بھی اس کو جائز سمجھنے کی عظیم غلطی میں مبتلا ہیں۔ درحقیقت یہ بھی ماتم ہے، گو مہذب طریقہ سے ہے کہ سینہ وغیرہ وحشی لوگوں کی طرح نہیں کوٹتے، لیکن حقیقت ماتم کی یہاں بھی موجود ہے۔ واللّٰہ أعلم بالصواب.

اور ارشاد فرمایا حق تعالیٰ جل شانہٗ نے: پس جس شخص نے ذرّہ کے برابر نیکی کی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرّہ کے برابر برائی کی وہ اس کو دیکھ لے گا۔

---

[1] جمع الفوائد عن أحمد و البزار بلين، وإليه ذهب فقهاء فكرهوا انفراد عاشوراء بالصوم.

[2] جمع الفوائد عن الستة إلا النسائي. [3] رزين والبيهقي. وفي المرقاة: قال العراقي: له طرق بعضها صحيح و بعضها على شرط مسلم.

چوں کہ حضرت حکیم الامّت مولانا تھانوی مُدَّ فُیُوضُھُمْ نے ''اصلاح الرسوم'' میں منکراتِ مروّجہ کی نہایت عمدہ طریق پر تفصیل کے ساتھ اصلاح فرمائی ہے، اس واسطے ''اصلاح الرسوم'' باب سوم کی فصل سوم سے عشرۂ محرم کی رسومِ قبیحہ کا بیان لکھا جاتا ہے۔ یہ رسوم دو قسم کی ہیں: ایک وہ جو فی نفسہٖ حرام ہیں۔ دوسری وہ جو فی نفسہٖ مباح تھیں مگر فسادِ عقیدہ کے سبب حرام ہوگئیں۔ دونوں کو جدا جدا بیان کیا جاتا ہے۔

قسم اوّل کے منکرات

۱۔ تعزیہ بنانا: جس کی وجہ سے طرح طرح کا فسق وشرک صادر ہوتا ہے۔ بعض جُہلا کا اعتقاد ہوتا ہے کہ (نعوذ باللہ) اس میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ رونق افروز ہیں اور اس وجہ سے اس کے آگے نذر ونیاز رکھتے ہیں، جس کا ﴿ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ﴾[1] میں داخل ہو کر کھانا حرام ہے۔ اس کے آگے دست بستہ تعظیم سے کھڑے ہوتے ہیں، اس کی طرف پشت نہیں کرتے اس پر عرضیاں لٹکاتے ہیں، اس کو دیکھنے کو زیارت کہتے ہیں اور اس قسم کے واہی تباہی معاملات کرتے ہیں جو صریح شرک ہیں، ان معاملات کے اعتبار سے تعزیہ اس آیت کے مضمون میں داخل ہے ﴿ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ﴾[2] یعنی کیا ایسی چیز کو پوجتے ہو جس کو خود تراشتے ہو۔ اور طرفہ ماجرا یہ ہے کہ یا تو اس کی بے حد تعظیم وتکریم ہو رہی تھی اور یا دفعتہً اس کو جنگل میں لے جا کر توڑ پھوڑ کر برابر کردیا، معلوم نہیں آج وہ ایسا بے قدر کیوں ہوگیا؟ واقعی جو امر خلافِ شرع ہوتا ہے وہ عقل کے بھی خلاف ہوتا ہے۔ بعضے نادان یوں کہتے ہیں کہ صاحب اس کو حضرت امام عالی مقام کے ساتھ نسبت ہوگئی اور ان کا نام لگ گیا اس لیے تعظیم کے قابل ہوگیا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ نسبت کی تعظیم ہونے میں کوئی کلام نہیں مگر جب کہ نسبت واقعی ہو۔ مثلاً: حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا کوئی لباس ہو یا اور کوئی ان کا تبرّک ہو، ہمارے نزدیک بھی وہ قابلِ تعظیم ہیں اور جو نسبت اپنی طرف سے تراشی ہوئی ہو وہ ہرگز اسبابِ تعظیم سے نہیں

[1] البقرة: ۱۷۳ [2] الصّٰفّٰت: ۹۵

ورنہ کل کو کوئی خود امام حسین رضی اللہ عنہ ہونے کا دعویٰ کرنے لگے تو چاہیے کہ اس کو اور زیادہ تعظیم کرنے لگو، حالاں کہ بالیقین اس کو گستاخ و بے ادب قرار دے کر اس کی سخت توہین کے درپے ہو جاؤ گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نسبتِ کاذبہ سے وہ شے معظّم نہیں ہوئی بلکہ اس کذب کی وجہ سے زیادہ اہانت کے قابل ہوئی ہے۔ اس بنا پر انصاف کرلو کہ تعزیہ تعظیم کے قابل ہے یا اہانت کے؟

۲۔ معازف ومزامیر کا بجانا: جس کی حرمت حدیث میں صاف صاف مذکور ہے اور باب اوّل میں وہ حدیث لکھی گئی ہے اور قطع نظر خلافِ شرع ہونے کے عقل کے بھی تو خلاف ہے، معازف ومزامیر تو سامانِ سرور ہیں، سامانِ غم میں اس کے کیا معنیٰ؟ یہ تو در پردہ خوشی منانا ہے۔

برچنیں دعوائے الفت آفریں

۳۔ مجمع فساق وفجار کا جمع ہونا: جس میں وہ فحش واقعات ہوتے ہیں کہ ناگفتہ بہ ہیں۔

۴۔ نوحہ کرنا: جس کے بارے میں سخت وعیدیں آئی ہیں۔

ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لعنت فرمائی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوحہ کرنے والے اور اس کی طرف کان لگانے والے کو۔[1]

۵۔ مرثیہ پڑھنا: جس کی نسبت حدیث میں صاف ممانعت آئی ہے۔ ''ابنِ ماجہ'' میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرثیوں سے منع فرمایا۔

۶۔ اکثر موضوع روایت پڑھنا: جس کی نسبت احادیث میں سخت وعیدیں آئی ہیں۔

۷۔ ان ایام میں قصداً زینت ترک کرنا: جس کو سوگ کہتے ہیں۔ اور حکم اس کا شریعت میں یہ ہے کہ عورت کو صرف خاوند پر چار ماہ دس دن یا وضعِ حمل تک واجب ہے اور دوسرے عزیزوں کے مرنے پر تین دن جائز ہے باقی حرام، سو اب تیرہ سو سال کے بعد یہ عمل کرنا بلاشک حرام ہے۔

۸۔ کسی خاص لباس یا کسی خاص رنگ میں اظہارِ غم کرنا: ''ابن ماجہ'' میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما

[1] روایت کیا اس کو ابوداؤد نے۔

سے ایک قصے میں منقول ہے کہ ایک جنازہ میں رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو دیکھا کہ غم میں چادر اُتار کر صرف کُرتا پہنے ہیں، یہ وہاں غم کی اصطلاح تھی۔ آپ نہایت ناخوش ہوئے اور فرمایا: کیا جاہلیت کا کام کرتے ہو؟ یا جاہلیت کی رسم کی مشابہت کرتے ہو؟ میرا تو یہ ارادہ ہوگیا تھا کہ تم پر ایسی بددُعا کروں کہ تمھاری صورتیں مسخ ہو جاویں۔ پس فوراً ان لوگوں نے اپنی چادریں لے لیں اور پھر کبھی ایسا نہیں کیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ کوئی خاص وضع وہیئت اظہارِ غم کے لیے بنانا حرام ہے۔

۹۔ بعض لوگ اپنے بچوں کو امام حسین رضی اللہ عنہ کا فقیر بناتے ہیں اور ان سے بعضے بھیک بھی منگواتے ہیں۔ اس میں اعتقادی فساد تو یہ ہے کہ اس عمل کو اس کی طویل حیات میں مؤثر جانتے ہیں، یہ صریح شرک ہے، اور بھیک مانگنا بلا اضطرار حرام ہے۔

۱۰۔ حضرات اہلِ بیت کی اہانت برسرِ بازار کرتے ہیں، اگر ایامِ غدر کے واقعات جس میں کسی خاندان کی عورتوں کا ہتک ہوا ہو، اس طرح علی الاعلان گائے جاویں، اس خاندان کے مردوں کو کس قدر غیض وغضب آئے گا۔ پھر سخت افسوس ہے کہ حضرات اہلِ بیت کے حالات اعلان کر۔ نے میں غیرت بھی نہ آئے۔

اور اس طرح کے بہت سے امورِ قبیحہ ہیں جو اِن دنوں میں کیے جاتے ہیں، ان کا اختیار کرنا اور ایسے مجمع میں جانا سب حرام ہے اور یہی تمام ترفضیحتیں پھر چہلم کو دہرائی جاتی ہیں۔

قسم دوم کے منکرات

۱۔ کھچڑا یا اور کچھ کھانا پکانا: احباب یا مساکین کو دینا اور اس کا ثواب حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو بخش دینا۔ اس کی اصل وہی حدیث ہے کہ جو شخص اس دن میں اپنے عیال پر وسعت کرے، اللہ تعالیٰ سال بھر تک اس پر وسعت فرماتے ہیں۔ وسعت کی یہ بھی ایک صورت ہوسکتی ہے کہ بہت سے کھانے پکائے جاویں خواہ جدا جدا یا ملا کر، کھچڑے میں کئی جنس مختلف ہوتی ہیں اس لیے وہ اس وسعت میں داخل ہوسکتا تھا۔ چناں چہ ''درمختار'' میں ہے: ولا بأس

بالمعتاد خلطا ویؤجر. جب اہل وعیال کو دیا کچھ غریب غُرَبا کو بھی دے دیا۔ حضرات امامین کو بھی ثواب بخش دیا۔ مگر چوں کہ لوگوں نے اس میں طرح طرح کی رسوم کی پابندی کرلی ہے گویا خود اس کو ایک تہوار قرار دے دیا ہے اس لیے رسم کے طور پر کرنے سے ممانعت کی جائے گی۔ بلا پابندی اگر اس روز کچھ فراخی خرچ میں کھانے پینے میں کردے تو مضایقہ نہیں۔

۲۔ شربت پلانا: یہ بھی اپنی ذات میں مباح تھا، کیوں کہ جب پانی پلانے میں ثواب ہے تو شربت پلانے میں کیا حرج تھا؟ مگر وہی رسم کی پابندی اس میں ہے اور اس کے علاوہ اس میں اہلِ رِفض کے ساتھ تشبّہ بھی ہے، اس لیے یہ بھی قابل ترک ہے۔ تیسرے اس میں ایک مُضمَر خرابی یہ ہے کہ شربت اس مناسبت سے تجویز کیا گیا ہے کہ حضرات شہدائے کربلا پیاسے شہید ہوئے تھے اور شربت مُسکِنِ عطش[۱] ہے، اس لیے اس کو تجویز کیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے عقیدہ میں شربت پہنچتا ہے جس کا باطل اور خلافِ قرآن مجید ہونا فصلِ دوم میں مذکور ہو چکا ہے اور اگر پلانے کا ثواب پہنچتا ہے تو ثواب سب یکساں ہے، کیا صرف شربت دینے کو ثواب میں تسکینِ عطش کا خاصہ ہے۔ پھر یہ بھی اس سے لازم آتا ہے کہ ان کے زعم میں اب تک شہدائے کربلا (نعوذ باللہ) پیاسے ہیں، یہ کس قدر بے ادبی ہے۔ ان مفاسد کی وجہ سے اس سے بھی احتیاط لازم ہے۔

۳۔ شہادت کا قصہ بیان کرنا: یہ بھی فی نفسہٖ چند روایات کا ذکر کردینا ہے۔ اگر صحیح ہوں تو روایات کا بیان کردینا فی ذاتہٖ جائز تھا مگر اس میں یہ خرابیاں عارض ہوگئیں:

الف۔ مقصود اس بیان سے ہیجان اور جلبِ غم اور گریہ وزاری کا ہوتا ہے، اس میں صریح مقابلہ شریعتِ مطہرہ ہے کیوں کہ شریعت میں ترغیبِ صبر مقصود ہے، اور تعزیت سے یہی مقصود ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ مزاحمت شریعت کی سخت معصیت اور حرام ہے، اس لیے گریہ وزاری کو بھی قصداً یاد کرکے لانا جائز نہیں۔ البتہ غلبۂ غم سے اگر آنسو آجائیں تو اس میں گناہ نہیں۔

ب۔ لوگوں کو اس لیے بلایا جاتا ہے، اور ایسے امور کے لیے تداعی واہتمام خود ممنوع ہے۔

---

[۱] مسکِنِ عطش: پیاس بجھانے والا

ج۔اس میں مشابہت اہلِ رفض کے ساتھ بھی ہے، اس لیے ایسی مجلس کا منعقد کرنا اور اس میں شرکت کرنا سب ممنوع ہے، چناں چہ ''مطالب المؤمنین'' میں صاف منع لکھا ہے اور قواعدِ شریعہ بھی اس کے مشاہد ہیں' اور یہ تو اس مجلس کا ذکر ہے جس میں کوئی مضمون خلاف نہ ہو اور نہ وہاں نوحہ و ماتم ہو اور جس میں مضامین بھی غلط ہوں، یا بزرگوں کی توہین ہو، یا نوحہ حرام ہو، جیسا کہ غالب اس وقت میں ایسا ہی ہے تو اس کا حرام ہونا ظاہر ہے، اور اس سے بدتر خود شیعہ کی مجالس میں جاکر شریک ہونا بیان سننے کے لیے یا ایک پیالہ فرنی اور دونان کے لیے۔

''إصلاح الرسوم'' کا مضمون ختم ہوا۔اب ''زوال السنة'' سے بعض رسومِ قبیحہ کی مذمت نقل کی جاتی ہے۔

۱۔بعض لوگ اُس بچے کو منحوس سمجھتے ہیں جو محرم میں پیدا ہو۔ یہ بھی غلط عقیدہ ہے۔

۲۔بعض لوگ ان ایام میں شادی کو بُرا سمجھتے ہیں۔ یہ عقیدہ بھی باطل ہے۔

۳۔بعض جگہ ان ایام میں گٹکہ، دھنیا، مصالحہ تقسیم کرتے ہیں یہ بھی واجب الترک ہے۔

۴۔بعض شہروں میں اس تاریخ کو روٹیاں تقسیم کی جاتی ہیں اور ان کی تقسیم کا یہ طریقہ نکالا ہے کہ چھتوں کے اوپر کھڑے ہو کر پھینکتے ہیں، جس سے کچھ تو لوگوں کے ہاتھ میں آتی ہیں اور اکثر زمین پر گر کر پیروں میں روندی جاتی ہیں جس سے رزق کی بے ادبی اور گناہ ہونا ظاہر ہے۔ حدیث شریف میں اکرامِ رزق کا حکم اور اس کی بے احترامی وبال سلب رزق آیا ہے۔ خدا سے ڈرو اور رزق برباد مت کرو (اور بے ادبی کے علاوہ بدعت اور ریا وغیرہ کا گناہ بھی اس رسم میں موجود ہے)۔

ماہِ صفر کا بیان

ارشاد فرمایا حق تعالیٰ جل شانُہٗ نے کہ بے شک مہینوں کا ہٹانا کفر میں ترقی (کا باعث) ہے۔(یعنی منجملہ اور کفریات کے یہ حرکت بھی کفر ہے جو کفارِ قریش ماہِ محرم وغیرہ کے متعلق کیا کرتے تھے۔ مثلاً: اپنی غرض سے محرم کو صفر قرار دے کر اس میں لڑائی کو حلال کہہ دیتے تھے۔ وغیر ذلك.)

اور ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ نہ (مرض کا) تعدیہ ہے (بلکہ جس طرح اولاً حق تعالیٰ جل شانہٗ کسی کو مریض بناتے ہیں، اسی طرح دوسرے کو اپنے مستقل تصرف سے مریض کردیتے ہیں۔ میل جول وغیرہ سے کوئی مرض کسی کو نہیں لگتا یہ سب وہم ہے) اور نہ (جانور اُڑنے سے) بدشگونی لینا کوئی چیز ہے (جیسا کہ لوگوں میں مشہور ہے کہ داہنی جانب سے تیتر وغیرہ اُڑے تو اس کو اچھا سمجھتے ہیں اور بائیں جانب سے اڑے تو منحوس جانتے ہیں، یہ سب ڈھکوسلے ہیں) اور نہ اُلو کی نحوست کوئی چیز ہے (جیسا کہ عام طور پر اس کو لوگ منحوس خیال کرتے ہیں) اور نہ صفر کی نحوست کوئی چیز ہے۔[1]

فائدہ: آج کل بھی بہت جگہ ماہِ صفر کو منحوس سمجھتے ہیں، یہ بالکل من گھڑت بات ہے اور حدیث شریف کے صریح خلاف ہے، اور اس کی نحوست سے محفوظ رہنے کے واسطے تیرھویں تاریخ کو گھونگنیاں تقسیم ہوتی ہیں۔ اس کا بناء الفاسد علی الفاسد ہونا ظاہر ہی ہے۔ اور اگر کسی کو نحوست کا خیال نہ ہو تب بھی گھونگنیاں پکانا مباح میں التزام اور پابندی کی وجہ سے بدعت اور گمراہی تو ہے ہی۔ (کما لا یخفی) اور ایک رسم اس ماہ میں آخری چہار شنبہ کی مروجہ ہے یہ بھی بالکل بے اصل اور بدعتِ سیئہ ہے۔

اور ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بدفالی ایک شرک ہے۔ اس کو تین مرتبہ فرمایا۔ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم میں ایسا کوئی نہیں جس کو خیال نہ آتا ہو، لیکن اس کو توکل کے ذریعہ بھگا دیتا ہے۔[2]

فائدہ: جو بات مشہور ہو اس کا خیال وقت پر ہی آجاتا ہے، لیکن اُس خیال پر عمل کرنا یا اس کو دل میں جمانا جائز نہیں ہے، بلکہ توکّل کے خیال کو غالب کرے تو وہ خیالِ باطل فوراً رفع دفع ہوجائے گا۔

اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے عورت اور مکان اور گھوڑے میں نحوست ہونا جو ''بخاری''، ''مسلم'' میں مروی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی چیز میں نحوست ہوتی تو اُن میں ہوتی۔[3]

بعض مقامات پر صفر کے آخری چہار شنبہ کو تہوار مناتے ہیں اور ایک عیدی بھی دیتے ہیں

---

[1] بخاری [2] ابوداؤد اور ترمذی [3] جیسا کہ ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

جس کا یہ مضمون ہے:

آخری چہار شنبہ آیا ہے
غسلِ صحت نبی نے پایا ہے

اور مکتبوں میں چھٹی بھی ہوتی ہے، سو یہ سب ایجاد فی الدّین ہے۔

لطیفہ: ایک نواب زادے نے اپنے معلّم سے جو کہ محقّق تھے اس تاریخ میں عیدی مانگی، انھوں نے عیدی کے پیرایہ میں اس رسم کی خوب نفی کی ہے:

آخری چہار شنبہ ماہِ صفر
ہست چوں چہار شنبہ ہائے دگر
نہ حدیثی شدہ در آں وارد
نہ در وعید کرد پیغمبر

اضافہ بر مضمون سابق: بعض کتبِ تصوّف میں ایک حدیث لکھ دی ہے کہ

مَنْ بَشَّرَنِيْ بِخُرُوْجِ صَفَرٍ بَشَّرْتُهُ بِالْجَنَّةِ.

یعنی حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص مجھ کو ماہ صفر کے گزرنے کی بشارت دے گا میں اس کو جنت کی بشارت دوں گا۔

آہ! اس سے بعض نے اس ماہ کی نحوست پر استدلال کیا ہے۔ مگر یہ دلیل ثبوتاً و دلالۃً دونوں طرح مخدوش ہے۔ یعنی نہ تو یہ حدیث ثابت ہے اور نہ ہی اس مضمون پر دال ہے۔ اس کا مدلول بر تقدیرِ قطع نظر از عدم ثبوت یہ ہے کہ آپ ﷺ کی وفات ماہِ ربیع الاوّل میں ہونے والی تھی اور آپ لقاء اللہ مسبوق بالموت کے مشتاق تھے اور اس وجہ سے ربیع الاوّل کی ابتدا اور صفر کے انقضا کی خبر کا آپ ﷺ کو انتظار تھا۔

پس اس خبر کے لانے پر آپ ﷺ نے بشارت کو مرتب فرمایا۔ چناں چہ کتبِ تصوّف میں اسی مقصود کے اثبات و تائید کے لیے اس کو وارد کیا ہے۔ بہر حال یہ دلیل ثابت ہے اور نہ اس کی دلالت ثابت ہے۔ پس دعوائے نحوست منہدم و منعدم ہوگیا۔

ربیع الاوّل اور ربیع الثانی کے افعالِ مروّجہ کا حکم

اکثر لوگ ربیع الاوّل کے مبارک مہینے میں ذکر میلاد شریف کی عادت رکھتے ہیں اور بارہویں تاریخ کو خاص طور پر اہتمام کیا جاتا ہے۔ بعض تو اس روز وفات نبوی ﷺ کی وجہ سے رنج وغم کرتے ہیں (حالاں کہ اس روز وفات ہونے کی روایت بھی کسی طرح صحیح نہیں)۔ اور بعض ولادتِ نبویہ ﷺ کے سبب اس کو یومِ عید قرار دیتے ہیں، مگر شریعت سے نہ تو ذکر میلاد ہیئت مروّجہ پر جائز، خواہ وہ اس ماہ میں ہو یا کسی دوسرے ماہ میں اور نہ ربیع الاوّل کے متعلق کوئی خاص عمل منقول نہ اُس روز کو ماتم بنانا جائز نہ عید منانا، یہ سب امور مُحدَثات ہیں اور قابلِ ترک۔ اور اسی طرح ربیع الثانی میں جو پیرانِ پیر کی گیارہویں کا رواج ہے یہ بھی سراسر بے اصل ہے اور اکثر عوام کا جو عقیدہ ہے اس کے بارے میں وہ کھلم کھلا شرک ہے۔ اب ہم ان سب رسومِ مروّجہ کے بارے میں قولِ فیصل "افادۃ العوام ترجمہ خطبات الاحکام" سے نقل کرتے ہیں۔

ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: پڑھو مغرب سے پہلے دو رکعت۔ تین بار ارشاد فرمایا اور تیسری مرتبہ جو چاہے کا لفظ بھی فرمایا بوجہ ناپسند فرمانے اس بات کے کہ لوگ اس کو سنت سمجھ لیں۔[1]

اس حدیث شریف سے معلوم ہوگیا کہ جو چیز شرعاً ضروری نہ ہو اُس کو ضروری قرار دے لینا بھی شریعت کے خلاف اور ناجائز ہے اور اس پر محققین کا اتفاق ہے اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ اگر کسی غیر ضروری چیز کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا گیا جس سے ضروری سمجھنے کا شبہ ہوتا ہو تو یہ بھی اُسی کے مشابہ ہے، لہٰذا ایسا برتاؤ بھی ممنوع ہے۔

اور اس میں اکثر لوگ ذکر میلاد کی عادت رکھتے ہیں، اس کا حکم بھی اس سے معلوم ہوگیا۔ وہ یہ کہ اگر اس میں کوئی قید اور تخصیص (دن اور ماہ وغیرہ کی) نہ ہو تو وہ مباح کے درجہ

[1] بخاری ومسلم

میں ہے اور اگر اس میں کچھ قیود اور تخصیصات بھی ملی ہوئی ہوں تو دو حالتیں ہیں: ایک یہ کہ اُن قیود کو لازم سمجھتا ہو تب تو اس کے بدعت ہونے میں کوئی کلام ہی نہیں۔ اور اگر اُن قیود کو ضروری اور ثواب نہ سمجھتا ہو (بلکہ مباح سمجھ کر کسی مصلحت سے کرتا ہو) تو بدعت کے مشابہ ضرور ہے، لہٰذا اپنے اپنے درجہ کے موافق دونوں کو منع کیا جائے گا۔

پس جس عالم نے ذکر میلاد کرنے والوں کے ساتھ یہ گمان رکھا کہ وہ اس کو ضروری اور قربت خیال کرتے ہیں اُس نے اس کو منع کیا، اور جس عالم نے اس اعتقادِ فاسد کی طرف دھیان نہیں کیا وہ جائز کہتا ہے، (اس سے اختلافِ علما کی اصل وجہ معلوم ہوگئی)۔ اور جو شخص عوام کی حالت کو بغور دیکھے کہ وہ ان قیود یا اس فعل غیر ضروری کے تاک پر ایسی بری طرح ملامت اور اعتراض کرتے ہیں کہ ایسی ملامت نماز روزہ ترک کرنے پر بھی نہیں کرتے وہ شخص منع کرنے والوں کے فتوے کو بلاشبہ ترجیح دے گا، اور یہ اختلاف علما کا ایسا ہے جیسا کہ سلف میں ہو چکا ہے کہ بعض نے ان میں سے تنہا جمعہ کا روزہ رکھنے کو منع قرار دیا ہے اور بعض نے اس کو جائز کہا ہے، اور اسی طرح مُحَصَّب میں ٹھہرنے کو (حج کرنے والے کے واسطے) سنت کہا ہے، اور بعض نے کہا کہ یہ کوئی چیز نہیں۔ اور اسی طرح بہت احکام ہیں۔ (پس اس اختلافِ علما کو جو دربارہ ذکر مولد شریف وغیرہ ہو رہا ہے ہوّا بنانا سخت نادانی ہے) اور اگر ذکر میلاد میں کوئی بات کھلم کھلا خلافِ شرع ہے تو پھر اس میں کسی کو اختلاف کی گنجایش ہی نہیں وہ سب کے نزدیک منع ہے۔ اور اس تحقیق سے گیارہویں کا حکم بدرجۂ اولیٰ معلوم ہوگیا جو ربیع الثانی میں خصوصاً (نیز دیگر مہینوں میں عموماً) کی جاتی ہے۔

یہ مختصر اور جامع تحریر بالکل کافی وشافی ہے۔ لیکن زیادت بصیرت کے واسطے ''زوال السَّنَةِ عن أعمال السُّنَّةِ'' میں سے ہر دو ماہ کے واسطے مضمون ذیل میں درج کیا جاتا ہے جو نہایت مفید ہے۔

اس ماہِ مبارک کو یہ فضیلت ہے کہ یہ زمانہ ہے تولد شریف حضور پُر نور سید بنی آدم فخرِ عالم ﷺ کا اور جس قدر زیادہ فضیلت کسی زمانہ کی ہوتی ہے اس زمانہ میں حدودِ شرعیہ سے تجاوز کرنا

عنداللہ والرسول ﷺ اُسی قدر زیادہ ناپسندیدہ ہوتا ہے، اور حدود سے تجاوز کرنے کا معیار صرف علم ہے۔ اُن حدود کا بواسطہ ادلہ اربعہ شرعیہ یعنی کتاب وسُنت واجماع وقیاس مجتہد مقبول الاجتہاد وعند اکابر الامۃ کے اور اُن ادلہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس ماہِ مبارک میں جو بعض اعمال بعض عمال میں رائج وشائع ہوگئے ہیں مثل اہتمام وانعقادِ مجلس مولد شریف بہ تخصیصات معروضہ وقیودِ معلومہ خصوص انضمام دیگر منکرات، ومثل اعتیاد عید میلاد، یہ سب منجملہ افرادِ تجاوز عن الحدود الشرعیہ کے ہیں۔ پس لامحالہ غیر مرضی عنداللہ والرسول ﷺ ہوئے اور بوجہ فضیلت اس زمانہ کے غیر مرضی ہونے میں بھی اوکد ہوئے۔ پس لابدّ واجب الاحتیاط ہوئے۔ البتہ حدود کے اندر رہ کر ذکر مبارک رسول مقبول ﷺ منجملہ اعظم البرکات افضل القربات ہے کہ کسی مؤمن کو خصوص ساعی فی اتباع السنۃ کو اس میں کلام نہیں ہوسکتا:

اگر ان مقدماتِ مذکورہ کے مفصل دلائل اور اس ذکر مبارک کے مشروع طریقہ کے اور خود معتدبہ حصہ سِیَر وسوانح نبویہ ﷺ کے معلوم کرنے کا شوق ہو تو رسائل ذیل ضرور ملاحظہ فرمایئے کہ حق بالکل واضح اور التباس بالکل زائل ہو جائے۔

نام رسائل: ۱۔ طریقۂ مولد شریف۔ ۲۔ النور۔ ۳۔ الظہور۔ ۴۔ السرور۔ ۵۔ نشر الطیب۔ ۶۔ الحبور۔ ۷۔ الشذور۔

اور بلا تحقیق کسی عمل پر یا کسی عمل کے متعلق بے دلیل کسی حکم لگانے والے پر کوئی حکم لگانا منذرِ آخرت ہے۔

ربیع الثانی

اس ماہ میں ایک عملِ مروّج گیارہویں کا ہے جس میں چند امور قابلِ تحقیق ہیں:

اوّل: اس عمل کی حقیقت: سو رواجِ حال کے موافق یہ عمل حضرت غوثِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ایصالِ ثواب کے لیے موضوع ہوا ہے اور احقر نے چند ثقات سے سُنا ہے کہ یہ عمل خود حضرت قدس سرہٗ کا تھا، جس سے آپ ﷺ کو ایصالِ ثواب فرماتے تھے اور چوں کہ کوئی روایت حضرت قدس سرہٗ

کی وفات کی گیارہویں تاریخ میں واقع ہونے کی نہیں، چناں چہ ایک قول ربیع الآخر کی نو تاریخ کا ہے اور ایک قول سترہ تاریخ کا ہے۔ اور شیخ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے "ما ثبت بالسنۃ" میں اول کو راجح اور دوسرے کو بے اصل کہا ہے اور اہلِ اعراس کی عادت تاریخ کی رعایت کی ہوتی ہے۔ سو اوّل تغیّر تو اس عمل میں باوجود دعوائے محبت واتباع کے لوگوں نے یہ کیا ہے۔

امرِ دوم: اس عمل میں عقیدت: اس عمل کے اکثر ملتزمین کا یہ اعتقاد ہے کہ اس عمل سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی روح خوش ہو کر ہماری حاجات دنیویہ مالیہ وانفسیہ، مثل: ترقیٔ معاش و حفظ النفس و أولاد من الآفات میں امداد فرمادے گی۔ نیز بعض کا یہ اعتقاد ہے کہ اس کے ناغہ کرنے سے حضرت کی روح مبارک ناخوش ہوگی اور اس سے کسی آفت میں ابتلا ہو جاوے گا اور ایسے اعتقادات کا بوجہ استلزام اعتقادِ استقلال فی التصرف نقلاً وعقلاً منکر ہونا ظاہر ہے، اسی طرح یہ اعتقاد ہے کہ تعیّنِ تاریخ کی شرط ہے خاص ثمرات مقصودہ کی، اور غیر لازم کو لازم سمجھنا ظاہر ہے کہ خود تجاوز ہے حدودِ شرعیہ سے، اور بعض متکلمین جو ایسے تعینات کی کچھ اصلیں بیان کیا کرتے ہیں سو تحلیل محض وتمحل حجّت ہے۔ چناں چہ شیخ دہلوی قدس اللہ سرہ نے بعض متاخرینِ مقاربہ سے اوّل کچھ نقل کیا، پھر شیخ متقی رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے اس پر استدراک فرمادیا کہ لَمْ يَكُنْ فِي زَمَنِ السَّلَفِ شَيْءٌ مِنْ ذٰلِكَ.[1]

امرِ سوم: اس عمل میں نیت: ان عاملین میں کل پاکیزگیٔ نیت اغراض ومصالح دنیویہ کی درستی کی ہوتی ہے۔ حالاں کہ طاعت مالیہ کے ایصالِ ثواب کا حاصل باعتبارِ ابتدا کے صدقہ ہے کہ کچھ مال کسی مسکین پر تصدق کیا اور باعتبار انتہا کے ہدیہ ہے کہ اس تصدق کا ثواب کسی روح کو پہنچا دیا جیسا کہ خود وہ میت کچھ صدقہ دیتا اور اس کا ثواب اس کے پاس ذخیرہ رہ جاتا اور صدقہ وہدیہ دونوں نیت مذکورہ کے منافی ہیں۔ مثلاً: اگر خود حضرت قدس اللہ سرہ کسی کو کچھ صدقہ دیتے تو کیا آپ کا مقصود دُنیا ہوتی یا محض ثواب ہوتا، آپ کی شان تو بہت ارفع ہے، ادنیٰ درجہ کا اخلاص بھی کسی کو ہوگا وہ طاعت میں دنیا کو مقصود نہیں بنا سکتا، یہ تو صدقہ کے پہلو میں نظر

---

[1] متقدمین کے زمانے میں ان چیزوں میں سے کچھ نہ تھا۔

تھی۔ اب ہدیہ کے پہلو کو دیکھ لیا جاوے، اگر حضرت قُدِّسَ سِرُّہٗ زندہ ہوتے اور آپ کی خدمت میں کوئی ہدیہ پیش کرتا تو کیا آپ سے دنیا کا کوئی کام نکالنے کی نیت سے ہوتا یا محض محبّت اور حضرت کا دل خوش کرنے کے لیے ہوتا؟ پھر اب اس نیت کو کیوں بدلا جاتا ہے اور اس نیت کے ہوتے ہوئے حضرت قُدِّسَ سِرُّہٗ کے ساتھ محبّت وخلوص کا دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے؟

امرِ چہارم: اس عمل کی ہیئت: بجائے مساکین کے اپنے گھر والوں کو یا اغنیا کو حصّہ تقسیم کیا جاتا ہے جس سے صاف شبہ ہوتا ہے کہ ایصالِ ثواب مقصود ہی نہیں محض خاص ہیئت کو اغراضِ مخصوصہ میں دخیل ہونے میں کافی سمجھا جاتا ہے، خاص تعینات مثل تخصیص اَطعمہ وتخصیص قدرِ فلوس یا روپیوں کو ضروری سمجھتے ہیں جن کا اولاً بے اصل ہونا اور ثانیاً مزاحمِ اصولِ شرعیہ ہونا ظاہر ہے۔ بعضے اُن اطعمہ کے احترام میں اتنا مبالغہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نام کی چیز کا اس سے عشیر بھی احترام نہیں کرتے، کیا اس کو غلو نہ کہا جاوے گا؟ یہ تفریطات تو عوام کی تھیں۔

امرِ پنجم: اس امر میں بعض خواص کی ذلت: بعض مشتغلین بالباطن اس عمل کے امتثال سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ ان حضرات کی ارواح ہم سے خوش ہو کر مقاصدِ سلوک میں امداد کریں گی اور فیوض باطنی پہنچاویں گی سو اس میں بھی مثل امرِ دوم کے محذورِ اعتقادِ استقلال فی التصرف کا لازم ہے اور اس میں جو تاویلیں محتمل ہیں اس کی تحقیق ''تتمہ ثانیہ امداد الفتاویٰ: ۸۔ ۱۳'' میں خوب کر دی گئی ہے جو قابلِ ملاحظہ ہے۔ اس امرِ پنجم اور امرِ دوم میں بجز اس کے کہ وہاں مقاصدِ جسمی اور یہاں روحی ہیں، اعتقادی حالت میں کچھ تفاوت نہیں جو اصل منشا ہے احتیاط کا۔

رفعِ شبہ: اس سے اصل عمل پر انکار کا گمان نہ کیا جاوے۔ اگر کوئی مخلص عقیدہ بھی درست، اور نہ عمل کو لازم سمجھے، نہ اس کی کسی قید کو، نہ حضرت کو متصرف بلاتخلّف قرار دے، نہ تاریخ کی تعیین کرے، نہ اَطعمہ وغیرہ کی اور مقصود صرف حضرت کی محبّت اور آپ کے دینی احسانوں کے صلہ میں آپ کو ثواب بخشنا ہو، تاکہ آپ کو ترقیٔ مدارج کا قرب کا نفع ہو، پھر اس خدمت ثواب رسانی پر حق تعالیٰ جَلَّ شَانُہٗ جو چاہے نعمت دے دیں، جس میں حضرت کے علم وتصرف کو دخل بھی نہ ہو، ایسے شخص کو اس کی اجازت ہے اور اس کے ساتھ ہی مصلحتِ شرعیہ یہ ہے کہ ایسی بات سے

احتیاط رکھے جس سے ظاہر بینوں کو شبہ اور سند ہو سکے۔ یعنی اوّل تو کسی پر اس کا اظہار نہ کرے اور نفلِ طاعت ویسے بھی خفیہ افضل ہے۔ دوسرے اگر مخفی نہ رہ سکے تو اس کا مروج نام گیارہویں نہ رکھے، ثواب رسانی مناسب اور صحیح اور حقیقت پر دلالت کرنے کے لیے کافی عنوان ہے۔

اضافہ: مزید تحقیق اس مسئلہ میں ''رأس الربیعین'' کے جزوِ ثانی مسمّٰی بہ ''الحضور لأمور الصدور'' میں ملاحظہ ہو۔ اہلِ انصاف کے واسطے یہ تفصیل بالکل کافی ہے، اس واسطے اس پر بس کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ تفصیل کا شوق ہو تو ان رسالہ جات کا مطالعہ کریں جن کا حوالہ اس مضمون میں دیا گیا ہے۔ ''اصلاح الرسوم'' باب سوم کی فصل اوّل ضرور ملاحظہ فرمالیں۔

ماہِ رجب کے فضائل اور احکام

بعد حمد وصلوٰۃ ناظرین کی خدمت میں التماس ہے کہ ماہِ رجب ایک مبارک مہینہ ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ رجب کا مہینہ آتا تو آں حضرت ﷺ دعا مانگتے کہ اے اللہ! برکت دے ہمارے لیے رجب میں اور شعبان میں، اور پہنچا ہم کو رمضان تک۔ [1] اور اس ماہِ مبارک میں سرورِ کائنات علیہ أفضل الصّلاۃ والتسلیم کو حق تعالیٰ جَلَّ شَانُہٗ نے معراج کا عظیم الشان رُتبہ عطا فرمایا جو آں حضرت ﷺ کے سوا کسی پیغمبر کو نہیں ملا۔ یعنی اس انسانی جسم سمیت آپ مکّہ معظّمہ سے بیت المقدس اور پھر وہاں سے ساتوں آسمانوں کو طے کر کے ایسی بارگاہِ قرب تک پہنچے کہ جہاں بشر تو بشر کسی فرشتہ کی بھی رسائی نہ ہو سکی، حتیٰ کہ تمام ملائکہ کے سردار جبریل امین نے بھی سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچ کر آگے بڑھنے سے معذوری کا اعتراف کیا۔ چناں چہ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

بدو گفت سالار بیت الحرام — کالے حامل وحی برتر خرام
بگفتا مجالم نماند — مجالم نماند
اگر یکسر موئے برتر پرم — فروغ تجلّی بسوزد پرم

---

[1] بیہقی

اور بعض کم عقل لوگ جو کہتے ہیں کہ جسدِ عنصری کا آسمان پر جانا محال ہے، وہ ایک بے ہُودہ بکواس ہے۔ افسوس ہے کہ وہ لوگ محال کے معنی تو جانتے نہیں ویسے ہی اٹکل پچو جس چیز کو چاہا محال کہہ دیتے ہیں۔ اکثر یہ لوگ مستبعد کو محال کہہ دیا کرتے ہیں۔ جس کو ان کی کم سمجھی اوران کے لچر شبہات اور بے بنیاد دعوؤں کی تردید دیکھنے کا شوق ہو وہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی دامت برکاتہم کا رسالہ ''انتباہاتِ مفیدہ'' ضرور دیکھ لے جو اس مبحث میں نہایت جامع ہے اور اگر زیادہ تفصیل درکار ہو تو اس کی شرح ''حل الانتباہات'' دیکھیں، جس میں جناب حکیم مولوی مصطفیٰ صاحب بجنوری (مقیم مکان ۹، محلّہ کرم علی، میرٹھ شہر) نے نہایت وضاحت کے ساتھ تمام شبہات کا قلع قمع کر دیا ہے۔ یہاں معراج شریف کے متعلق صرف ایک شعر لکھا جاتا ہے جس میں اس استبعاد کو بالکل دفع کر دیا جو عروج جسد کے متعلق نادانوں کو ہوگیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

تن او کہ صافی تراز جان ماست
اگر آمدو شد بیکدم رواست

اور جو شخص معراج شریف کی بابت پوری تحقیق کا شوق رکھتا ہو اس کو لازم ہے کہ ''تنویر السراج في ليلة المعراج''[۱] کا مطالعہ کرے جس میں حضرت حکیم الامت دام مجدهم نے خوب مبسوط مضامین درج فرمائے ہیں، نقلی تحقیقات بھی ہیں اور شبہات کا عقلی جواب بھی، اور فوائد محکمیہ بھی تحریر فرمائے ہیں اور فوائدِ حکیمہ بھی۔ یہاں صرف اتنا بیان کرنا مقصود ہے کہ آں حضرت ﷺ کو ایسی نعمتِ عظمیٰ جس ماہ میں عطا ہوئی وہ یقیناً خاص فضیلت رکھتا ہے اور یہ امر ظاہر ہے کہ جو وقت فضیلت رکھتا ہو اس میں عبادت کرنا زیادہ درجہ ہے، مگر یہ بھی مسلّم ہے کہ فضیلت کی کوئی مقدار بدوں تصریح خدا اور رسول ﷺ معیّن نہیں ہوسکتی اور اسی طرح کسی عمل کی تعیین بھی موقوف ہے حکم خدا اور رسول ﷺ پر، پس اب دیکھنا چاہیے کہ اس ماہ کے متعلق جو اعمال مشہور ہیں ان کی بابت شریعتِ مقدسہ میں کیا حکم ہے؟ اس ماہ میں

---

[۱] ''نشر الطیب'' میں شامل ہے۔

دو عمل مشہور و مروّج ہیں: ایک رجبی اور دوسرے ہزارہ روزہ۔ ان دونوں کا الگ الگ بیان کیا جاتا ہے۔

رجبی کا بیان: رجب کی ستائیسویں رات کو معراج شریف کا تذکرہ کیا جاتا ہے اور دھوم دھام سے جلسے ہوتے ہیں جن میں فضول خرچی اور بے جا زینت اور ضرورت سے کہیں بڑھ کر روشنی وغیرہ ہوتی ہے۔ شریعت میں اس ہیئتِ متعارفہ کی کوئی اصل نہیں بلکہ فضول خرچی وغیرہ کی صاف طور پر ممانعت اور سخت مذمت وارد ہوئی ہے اور اگر کوئی مجمع ان خرافات سے پورا پرہیز رکھ کر کیا جاوے تب بھی کم از کم دن کی تعیین کا تو گناہ ہے ہی، کیوں کہ اس تذکرہ کے واسطے شریعت نے کوئی دن معین نہیں فرمایا۔

دوسرے قاعدہ ہے کہ اگر کسی غیر ضروری فعل سے دوسرے لوگوں کے عقائد بگڑنے کا اندیشہ ہو تو اس فعل کو بالکل ترک کر دیا جائے گا۔ اس واسطے ترکِ منکرات کے باوجود بھی ایسی مجلسوں کی اجازت نہیں ہوسکتی جیسا کہ ہم ربیع الاول کے بیان میں مفصل لکھ چکے ہیں۔

اور بعض لوگ جو کہہ دیا کرتے ہیں کہ فضیلت کے ایام کا دھیان نہیں رہتا اور نہ فضیلت ذہن نشین ہوتی ہے جب تک کہ موقع پر اس کی تفصیل نہ کی جاوے، اس واسطے جن دنوں میں کوئی فضیلت ہو ان کا بیان خاص خاص موقعوں پر مفصل سنانے کی ضرورت ہے تاکہ بے خبر لوگوں کو پتہ لگ جائے اور جو پیشتر سے واقف ہیں ان کو یاد دہانی ہو جاوے۔ سو اس کا ایک جواب تو وہی ہے جو ابھی مذکور ہوا یعنی اگر اس یاد دہانی سے کسی خرابی کا اندیشہ نہ ہوتا اور کوئی امر منکر بھی شامل نہ ہوتا تو اس میں فی نفسہٖ مضایقہ نہ تھا لیکن جب خرابیٔ عقائد کی نوبت آ گئی تو منع کرنا لازم ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یاد دہانی کے واسطے نہ کسی دن کو خاص کرنے کی ضرورت نہ کسی ہیئتِ خاصہ کی حاجت ہے نہ اہتمام مجمع کی، جب موقع ہوا اہلِ علم اپنے طور پر وعظ وغیرہ میں ذکر کر دیں جیسا کہ شبِ قدر وغیرہ کے متعلق معمول ہے۔

غرض یہ کہ ذکر معراج شریف تو باعثِ ثواب ہے اور اس سے حضور ﷺ کی عظمت اور

محبت بڑھتی ہے اور واقعۂ معراج سے جو احکام معلوم ہوتے ہیں اور اس میں جو جو حکمتیں ہیں اگر ان کا بیان بھی کیا جاوے تو سونے پر سہاگہ ہو جائے، لیکن اس کے واسطے خاص ماہِ رجب کی تخصیص کرنا بلکہ ستائیسویں شب کو لازم قرار دینا حدودِ شرعیہ سے تجاوز اور بدعت ہے، و کل بدعة ضلالة و کل ضلالة في النار. اور اگر اس میں ریا، تفاخر، اسراف وغیرہ شامل ہو جائیں تو ''کریلا اور نیم چڑھا'' کا مصداق بن جاتا ہے۔ خوب سمجھ لو، حق تعالیٰ فہمِ سلیم اور اتباعِ سنت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

ہزاری روزے کا بیان: عام لوگ رجب کی ستائیسویں تاریخ کو روزہ رکھنے کا ثواب ایک ہزار روزہ کے برابر سمجھتے ہیں، اسی واسطے اس کو ہزاری روزہ کہتے ہیں، مگر یہ فضیلت ثابت نہیں کیوں کہ اکثر روایات تو اس بارے میں موضوع ہیں، اور بعض جو موضوع نہیں وہ بھی بہت ضعیف ہیں، اس لیے اس روزہ کے متعلق سنت ہونے کا اعتقاد نہ رکھا جاوے۔ فضائلِ اعمال میں جو ضعیف روایت پر عمل جائز ہے اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ اس فضیلت کا اعتقاد نہ کرے صرف احتمال کی بنا پر توقع رکھ کر عمل کر لے۔ اگر کوئی شخص ہزار روزے کے برابر ثواب نہ سمجھے بلکہ ویسے ہی فضیلت کا دن ہونے کے سبب روزہ رکھے تو اس میں مضایقہ نہیں جیسا کہ ''شامی'' وغیرہ میں تصریح ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جو روایت ہے کہ وہ ۲۷ رجب کو روزہ رکھنے سے منع کرتے تھے حتیٰ کہ اس روز لوگوں کو ہاتھ پکڑ کر کھانا کھانے پر مجبور کرتے تھے، اس کی یہی وجہ ہے کہ عام طور پر کسی فعل کو کرنے سے عوام اس کو سنت ہی سمجھنے لگتے ہیں۔ اس واسطے اس روزہ کا اہتمام ان روزوں کی طرح نہ کرنا چاہیے جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں۔ مثلاً: محرم اور شبِ براءت کا روزہ۔

بعض لوگوں سے معلوم ہوا ہے کہ اس مہینے میں تبارک کی روٹیاں بھی پکتی ہیں، سو اس کی شریعت میں کوئی بھی اصل نہیں محض من گھڑت بات ہے، اس سے احترازِ کلی لازم ہے۔ بلا سند شرعی کسی بات کو باعثِ عذاب یا باعثِ ثواب سمجھنا احداث فی الدین اور گمراہی ہے۔ خدا سب مسلمانوں کو تمام بدعات سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

ماہِ شعبان کے متعلق احکام اور فضائل

یہ ماہِ مبارک مقدمہ ہے رمضان شریف کا، جیسا کہ ماہِ شوال تتمہ ہے رمضان کا۔

قرآن شریف میں حق تعالیٰ نے جو ارشاد فرمایا ہے:

﴿حٰمٓ ۝ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ۭ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۝﴾ [1]

قسم ہے کتاب واضح کی کہ ہم نے اس (کتاب) کو ایک برکت والی رات میں اُتارا ہے، بے شک ہم آگاہ کرنے والے ہیں ایسی رات میں ہر حکمت والا معاملہ ہمارے حکم سے طے کیا جاتا ہے، بے شک ہم (آپ کو) پیغمبر بنانے والے ہیں۔

اس آیت میں برکت والی رات سے شعبان کی پندرہویں رات مراد ہے۔ [2] پس اس آیت سے اس ماہ کی اور خاص کر پندرہویں رات کی بہت بڑی فضیلت ثابت ہوگئی اور اس ماہ کے متعلق شریعتِ مقدسہ کے چند احکام ثابت ہوئے ہیں:

۱۔ اس کے چاند کا بہت اہتمام کرنا چاہیے۔

۲۔ پندرہویں شب کو عبادت کرنا اور پندرہویں تاریخ کو روزہ رکھنا مستحب ہے۔

۳۔ نصف شعبان کے بعد روزہ رکھنا خلافِ اولیٰ ہے۔

۴۔ یومِ شک میں روزہ رکھنا منع ہے۔

یہ سب احکام احادیث میں مصرح ہیں مختصر طور پر کچھ درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: شمار رکھو شعبان کے چاند کا رمضان کے لیے۔ یعنی جب ماہِ شعبان کی تاریخ صحیح ہوگی تو رمضان میں اختلاف کم ہوگا۔ [3]

۲۔ رسول اللہ ﷺ شعبان کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ کسی ماہ (کے چاند) کا اتنا خیال نہ فرماتے تھے۔ [4] ان دو روایتوں سے قولاً وفعلاً اس ماہ کے چاند کا اہتمام ثابت ہوگیا۔

---

[1] الدخان: ۱ - ۵ [2] هكذا فسرهٗ عكرمة. رواه ابن جرير وغيره.

[3] ترمذی [4] ابوداؤد

۳۔اور ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ جب آدھے شعبان کی یعنی پندرہویں رات ہوتو اس رات کو شب بیداری کرو اور اس کے دن میں روزہ رکھو کیوں کہ اللہ تعالیٰ اس رات غروب آفتاب کے وقت ہی سے آسمانِ دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے اور فرماتا ہے کہ کیا کوئی مغفرت چاہنے والا ہے کہ میں اس کو بخش دوں؟ کیا کوئی روزی مانگنے والا ہے کہ میں اس کو روزی دوں؟ کیا کوئی مصیبت زدہ ہے (کہ عافیت کی دعا مانگے اور) میں اس کو عافیت دوں؟ کیا کوئی ایسا ہے؟ کیا کوئی ایسا ہے؟ رات بھر یہی رحمت کا دریا بہتا رہتا ہے، یہاں تک کہ صبح صادق ہوجاوے۔[1]

۴۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے روایت کی ہے کہ میں نے اس رات (نفل) نماز کے سجدہ میں آں حضرت ﷺ کو یہ دعا مانگتے ہوئے سنا:

أَعُوْذُ بِعَفْوِكَ مِنْ عِقَابِكَ وَأَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ جَلَّ وَجْهُكَ لَا أُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلىٰ نَفْسِكَ.[2]

تیرے غصہ سے تیری رضامندی کی پناہ لیتا ہوں، اور تیرے عقاب سے تیرے درگزر کرنے کی پناہ لیتا ہوں، اور تجھ سے تیری ہی پناہ مانگتا ہوں، برتر ہے تو میں تیری تعریف پوری نہیں کرسکتا، تو ویسا ہی ہے جیسے تو نے اپنی تعریف کی ہے۔

پھر جب صبح ہوئی تو میں نے اس دعا کا آپ ﷺ سے ذکر کیا۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے عائشہ (رضی اللہ عنہا)! اس کو سیکھ لے اور دوسروں کو بھی سکھا دے، کیوں کہ جبرائیل علیہ السلام نے مجھ کو سکھائی ہے اور کہا ہے کہ اسے سجدہ میں بار بار پڑھوں۔

فائدہ: اسی روایت کے دوسرے طریق میں اور دعا بھی ہے بخوف طوالت نقل نہیں کی گئی، جس کو شوق ہو "ما ثبت بالسنة" دیکھ لے۔ حدیث سوم سے اس رات کی اور اس میں عبادت کرنے کی و نیز روزہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

اور حدیثِ چہارم سے ایک خاص دعا معلوم ہوگئی اور روایت مذکورہ کے علاوہ اور روایات

---

[1] ابن ماجہ [2] ما ثبت بالسنة عن البيهقي وسنن النسائي.

بھی اس شبِ مبارک کی فضیلت میں وارد ہوئی ہیں۔

۵۔ چناں چہ آں حضرت ﷺ نے شعبان کی پندرہویں رات کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ اس رات میں وہ سب بنی آدم بھی لکھ لیے جاتے ہیں جو اس سال میں مریں گے، اور اسی رات میں ان کے اعمال اٹھائے جاتے ہیں، اور اسی میں ان کے رزق نازل ہوتے ہیں۔[1]

فائدہ: اعمال اٹھائے جانے سے مراد ان کا پیش ہونا ہے، اور رزق نازل ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس سال میں جو رزق ملنے والا ہے وہ سب لکھ دیا جاتا ہے، اور یہ سب چیزیں پیشتر سے لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی ہیں، مگر اس رات کو لکھ کر فرشتوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ واللّٰہ أعلم.

۶۔ اور ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ اللہ تعالیٰ متوجہ ہوتا ہے شعبان کی پندرہویں رات میں، پس مغفرت فرما دیتا ہے سب مخلوق کی مگر شرک اور کینہ والے شخص کے لیے (مغفرت نہیں فرماتا)۔[2]

ایک اور روایت میں ہے: مگر دو شخص، ایک کینہ رکھنے والا اور ایک قتلِ ناحق کرنے والا۔ اور ایک روایت میں ہے: یا قطع رحم کرنے والا۔[3] اور ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نظر (رحمت) نہیں کرتا ہے اس رات میں (بھی) مشرک کی طرف، اور نہ کینہ والے کی طرف، اور نہ قاطع رحم (یعنی رشتہ ناتہ والوں سے بلاوجہ شرعی تعلّق توڑنے والے) کی طرف، اور نہ پائے جامہ (وغیرہ) ٹخنے سے نیچے لٹکانے والے کی طرف، اور نہ ماں باپ کی نافرمانی کرنے والے کی طرف، اور نہ ہمیشہ شراب پینے والے کی طرف۔ (البتہ اگر کوئی توبہ کر چکا ہے تو رحمتِ خداوندی اس پر بھی متوجہ ہو جاتی ہے)۔[4]

ان کے علاوہ اور گناہ گاروں پر بھی نظرِ رحمت نہ ہونا دوسری روایتوں میں آیا ہے۔ پس سب گناہوں سے توبہ کرنا چاہیے۔ سب روایتوں پر نظر ڈالنے سے احقر کی فہمِ ناقص میں یہ آتا ہے: کبائر بدوں توبہ معاف نہیں ہوتے اور صغائر سب اس رات کی برکت سے حق تعالیٰ جَلَّ شَانُہٗ

---

[1] بیہقی [2] ابن ماجہ [3] عن ما ثبت بالسنة عن سعید بن منصور.

[4] عن ما ثبت بالسنة عن البیهقي.

معاف کردیتا ہے۔ واللہ أعلم.

۷۔ ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ (اس رات میں) کلب کی بکریوں کے عدد سے بھی زیادہ (لوگوں) کی مغفرت فرمادیتا ہے۔ رواہ ابن أبي شيبة والترمذي وابن ماجه والبيهقي. قال في "جامع الأصول": وزاد رزين: "ممن استحق النار" وليس فيه حديث في الباب إلا هذا، وجاء نحوه بطرق متعددة.

یعنی ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ وہ لوگ اتنی کثیر تعداد میں ایسے ہیں جو (ارتکابِ معاصی کے سبب) عذاب النار کے مستحق ہو چکے ہیں۔

فائدہ: اس رات کا نام شبِ براءت (یعنی آزادی کی رات) اسی واسطے رکھا گیا ہے کہ اس میں حق تعالیٰ گناہ گاروں کو عذابِ جہنم سے آزاد کردیتا ہے۔[1]

۸۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب شعبان آدھا ہوجاوے تو روزہ نہ رکھو۔[2]

۹۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہے کہ میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شعبان سے زیادہ روزہ رکھتے ہوئے کسی ماہ میں نہیں دیکھا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ (کُل) ماہِ شعبان میں روزہ رکھتے تھے سوائے تھوڑے دنوں کے۔[3] اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شعبان کے نصف اخیر میں بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم روزہ رکھتے تھے، اور اس سے پہلی روایت میں اس کی ممانعت آئی ہے، اس لیے یوں کہا جائے گا کہ امت کے واسطے تو نصف اخیر کے روزے خلافِ اولیٰ ہیں، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے مستثنیٰ تھے۔ اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جس کو نصف اخیر میں روزے رکھ کر ضعف ہوجاوے کہ رمضان کے روزے رکھنا دشوار ہوں اس کے لیے ممانعت ہے اور جس کو ضعف نہ ہو اس کے واسطے مضایقہ نہیں۔

۱۰۔ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تم میں سے کوئی شخص رمضان کے ایک یا دو دن پہلے سے روزہ نہ رکھے، مگر یہ کہ وہ شخص کسی (خاص) دن کا روزہ رکھا کرتا ہو (اور رمضان کے

---

[1] وجاء الحديث في البيهقي بلفظ: "ولله عتقاء من النار".

[2] ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی [3] متفق علیہ

ایک دن پہلے وہ دن ہو۔ مثلاً: ہر پیر کو روزہ رکھنے کا معمول ہے اور ۲۹ شعبان کو پیر کا دن ہے) تو وہ شخص اس دن بھی (نفل) روزہ رکھ لے۔ [1] اس سے یوم شک کے روزہ کی ممانعت ثابت ہوگئی اور ایک یا دو دن کا یہ مطلب ہے کہ بعض مرتبہ تو شعبان کا چاند بلا اختلاف نظر آجاتا ہے، ایسے موقع پر صرف ۳۰ شعبان کے متعلق شبہ ہوتا ہے، اور بعض مرتبہ شعبان میں بھی اختلاف ہوجاتا ہے، اس موقع پر ۲۹ کو بھی شبہ ہوتا ہے۔

غرض یہ ہے کہ شبہ کی وجہ سے نہ ۲۹ کو روزہ رکھے نہ ۳۰ کو بلکہ جب شریعت کے مطابق ثابت ہو جاوے تب رمضان کو شروع سمجھا جاوے البتہ یومِ شک میں یہ مستحب ہے کہ ضحوۂ کبریٰ [2] تک خبر کا انتظار کیا جائے۔ اگر کہیں سے معتبر شہادت آجائے تو روزہ کی نیت کرلے ورنہ کھاپی لے۔

''تتمہ عالمگیری'' میں تصریح ہے کہ شبِ براءت کو قبرستان میں جانا دوسرے اوقات میں جانے سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ اس لیے اس رات کو قبرستان میں جاکر مؤمنین اور مؤمنات کے واسطے دعا مانگنا چاہیے۔

منکراتِ ماہ ہٰذا: اس شبِ مبارک میں صرف دو تین باتیں ثابت ہیں، عبادت کرنا اور قبرستان میں جاکر دعائے مغفرت کرنا۔ اس کے علاوہ شریعت میں کچھ وارد نہیں ہوا، حتیٰ کہ اس رات کو ایصالِ ثواب وغیرہ کی بھی کوئی اصل نہیں۔ اگر مفصّل دلائل مطلوب ہوں تو ''ترجیح الراجح'' حصہ سوم، فصل سوم ضرور قابل ملاحظہ ہے۔ مگر جاہل لوگوں نے عبادت کی جگہ بہت سی بے ہودہ رسمیں ایجاد کر رکھی ہیں جن کو سیدی مرشدی حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی دامت برکاتہم نے ''اِصلاح الرسوم'' میں بخوبی بیان فرمایا ہے۔ لہٰذا بعینہٖ ''اِصلاح الرسوم'' کی عبارت درج ذیل ہے:

شب براءت میں حدیث شریف سے اس قدر ثابت ہے کہ حضور ﷺ بحکم حق تعالیٰ جنّت البقیع میں تشریف لے گئے اور اموات کے لیے استغفار فرمایا۔ اس سے آگے سب ایجاد

---

[1] متفق علیہ۔ اور اگر وہ شخص بھی اس روز رمضان کا احتمال ہونے کی بنا پر روزہ رکھے تو اس کو بھی جائز نہیں۔

[2] صبح صادق سے غروب آفتاب تک جتنا وقت ہوتا ہے اس کے وسط وقت کو ضحوۂ کبریٰ کہتے ہیں۔ اس سے پہلے روزے کی نیت درست ہے، بعد میں نیت کرنا بے کار ہے۔

ہے جس میں مفاسدِ کثیرہ پیدا ہو گئے ہیں:

۱۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضور سرورِ عالم ﷺ کا دندان مبارک جب شہید ہوا تھا آپ ﷺ نے حلوہ نوش فرمایا تھا۔ یہ بالکل موضوع اور غلط قصہ ہے، اس کا اعتقاد کرنا ہرگز جائز نہیں بلکہ عقلاً بھی ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ یہ واقعہ شوال میں ہوا نہ کہ شعبان میں۔

۲۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت ان دنوں میں ہوئی ہے، یہ اُن کی فاتحہ ہے۔ یہ بھی محض بے اصل ہے اور اوّل تو تعیینِ تاریخ کی ضرورت نہیں، دوسرے خود یہ واقعہ بھی غلط ہے۔ آپ کی شہادت بھی شوال میں ہوئی تھی، شعبان میں نہیں ہوئی۔

۳۔ بعض لوگ اعتقاد رکھتے ہیں کہ شبِ براءت وغیرہ میں مُردوں کی روحیں گھروں میں آتی ہیں اور دیکھتی ہیں کہ کسی نے ہمارے لیے کچھ پکایا یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا امر مخفی بجز دلیلِ نقلی کے اور کسی طرح ثابت نہیں ہوسکتا اور وہ یہاں ندارد ہے۔

۴۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ جب شبِ براءت سے پہلے کوئی مر جاوے تو جب تک اس کے لیے فاتحہ شبِ براءت نہ کیا جاوے وہ مُردوں میں شامل نہیں ہوتا۔ یہ بھی محض تصنیف یاراں اور بالکل لغو ہے، بلکہ رواج ہے کہ اگر تہوار سے پہلے کوئی مر جاوے تو کنبہ بھر میں پہلا تہوار نہیں ہوتا۔ حدیثوں میں صاف مذکور ہے کہ جب مُردہ مرتا ہے، مرتے ہی اپنے جیسے لوگوں میں جا پہنچتا ہے، یہ نہیں کہ شبِ براءت تک اٹکا رہتا ہے۔

۵۔ حلوے کی ایسی پابندی ہے کہ بدوں اس کے سمجھتے ہیں کہ شبِ براءت ہی نہیں ہوئی۔ اس پابندی میں اکثر فسادِ عقیدہ بھی ہو جاتا ہے کہ اس کو مؤکد ضروری سمجھنے لگتے ہیں، فسادِ عمل بھی ہو جاتا ہے، فرائض وواجبات سے زیادہ اس کا اہتمام کرنے لگتے ہیں اور ان دونوں کا معصیت ہونا فصل اوّل میں بالتشریح مذکور ہو چکا ہے۔

ان خرابیوں کے علاوہ تجربہ سے ایک اور خرابی ثابت ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ نیت بھی فاسد ہو جاتی ہے، ثواب وغیرہ کچھ مقصود نہیں رہتا ہے، خیال ہو جاتا ہے کہ اگر اب کے نہ کیا تو لوگ کہیں گے کہ اب کی خست اور ناداری نے گھیر لیا ہے۔ اس الزام کو رفع کرنے کے لیے جس طرح بن پڑتا ہے مر مار کر کرتا ہے۔ ایسی نیت سے صَرف کرنا محض اسراف وتفاخر ہے جس

کا گناہ ہونا بار ہا مذکور ہو چکا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کے لیے قرض سودی لینا پڑتا ہے، یہ جدا گناہ ہے۔

۶۔ جو لوگ مستحقِ اعانت ہیں ان کو کوئی بھی نہیں دیتا یا ادنیٰ درجہ کا پکا کر ان کو دیا جاتا ہے، اکثر اہلِ ثروت و برادری کے لوگوں کو بطورِ معاوضہ کے دیتے لیتے ہیں اور نیت اس میں یہی ہوتی ہے کہ فلاں شخص نے ہمارے یہاں بھیجا ہے اگر ہم نہ بھیجیں گے تو وہ کیا کہے گا۔ غرض اس میں بھی ریا و تفاخر ہو جاتا ہے۔

۷۔ بعض لوگ اس تاریخ میں مسور کی دال ضرور پکاتے ہیں، اس ایجاد کی وجہ آج تک معلوم نہیں ہوئی، لیکن اس قدر ظاہر ہے کہ مؤکد سمجھنا بلا شک معصیت ہے۔ یہ تو کھانے پکانے میں مفاسد ایجاد کرتے ہیں، ان کے علاوہ آتش بازی کی رسم اس شب میں شایع ہے۔ اس کی نسبت بابِ اوّل میں بیان ہو چکا ہے حاجتِ اِعادہ نہیں۔ تیسرے زیادتی اس میں یہ کی گئی ہے کہ بعض لوگ شب بیداری کے لیے فرائض سے زیادہ اس میں لوگوں کو جمع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، ہر چند کہ اجتماع سے شب بیداری سہل تو ہو جاتی ہے مگر نفلی عبادت کے لیے لوگوں کو ایسے اہتمام سے بلانا اور جمع کرنا یہ خود خلافِ شریعت ہے جیسا کہ اسی باب کی فصلِ اوّل میں بیان ہو چکا ہے۔ البتہ اتفاقاً کچھ لوگ جمع ہو گئے اس کا مضایقہ نہیں۔

۸۔ بعض لوگوں نے اس میں برتنوں کا بدلنا اور گھر لیپنا اور خود اس شب میں چراغوں کا زیادہ روشن کرنا عادت کر لی ہے۔ یہ رسم بالکل کفار کی نقل ہے اور حدیثِ تشبہ سے حرام ہے۔

چوں کہ حضرت والا آتش بازی کا بیان بابِ اوّل کی فصلِ سوم میں تحریر فرما چکے ہیں اس واسطے دوبارہ اس کو تحریر کرنے کی حاجت نہ تھی مگر اس جگہ تمیمِ فائدہ کی غرض سے اس رسم کے رد کو ضروری سمجھ کر ''ما ثبت بالسنة'' سے کچھ مضمون لکھا جاتا ہے جو خاص طور پر حضرت شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی قدس اللہ سرہٗ مؤلفِ ''ما ثبت بالسنة'' نے شبِ براءت میں آتش بازی کا بے ہودہ مشغلہ کرنے والوں کے متعلق تحریر فرمایا ہے۔ وھو ھٰذا:

اور بدعتِ شنیعہ میں سے وہ رسم ہے جس کا اکثر بلادِ ہند میں لوگوں نے رواج دے رکھا ہے، یعنی چراغ جلانا اور ان کو مکانوں اور دیواروں پر رکھنا اور اس پر فخر کرنا اور آتش بازی کے ساتھ لہو و

لعب کے لیے جمع ہونا۔ کیوں کہ یہ وہ امر ہے جس کی معتبر کتابوں میں کوئی اصل نہیں بلکہ غیر معتبر کتابوں میں بھی نہیں، اور کوئی ضعیف اور موضوع روایت تک بھی اس کے بارے میں وارد نہیں ہوئی اور نہ اس کا بلادِ ہند کے سوا کسی ملک میں رواج، نہ حرمین شریفین میں (زادھما اللّٰہ تعالیٰ تعظیمًا وتشریفًا) اور نہ ان کے سوا عرب کے دیگر حصص میں اور نہ بلادِ عجم میں، سوائے ہندوستان کے، بلکہ ممکن ہے اور یہی ظنِ غالب ہے کہ ہندوؤں کی رسم دیوالی سے اس رسم کو لیا گیا ہے کیوں کہ ہندوستان میں عموماً رسومِ بدعیہ زمانۂ کفر ہی کی باقی ہیں اور مسلمانوں میں (کفار کے ساتھ) میل جول کرنے اور کفار (کی نسل) میں سے باندیاں اور بیویاں رکھنے کے سبب پھیل گئی ہیں۔

بعض علمائے متاخرین نے فرمایا ہے کہ خاص خاص راتوں میں بکثرت چراغ جلانے کا رواج بدعاتِ شنیعہ سے ہے۔ کیوں کہ حاجت سے زیادہ چراغ جلانے کے رواج میں کسی موقع پر بھی کوئی اثرِ شرعی منقول نہیں۔ اور علی بن ابراہیم نے کہا ہے کہ روشنی کی بدعتِ اوّل برامکہ سے شروع ہوئی، وہ لوگ آتش پرست تھے۔ پس جب مسلمان ہوئے تو انھوں نے اسلام میں وہ بات داخل کرلی جس کو اپنی ملمع سازی سے اسلامی طریقہ قرار دے دیا اور (اس سے) ان کی اصل غرض صرف آتش پرستی تھی۔ جب کہ مسلمانوں کے ساتھ ان چراغوں کی طرف سجدہ کرتے تھے، یعنی مسجد میں صف سے آگے چراغ ہوں گے تو آتش پرستی بھی ہوجاوے گی، (نعوذ باللہ) مسلمان ہوکر بھی شرک کا روگ دلوں میں رہا اور پھر اس کو جاہل اماموں نے صلوٰۃِ غائب وغیرہ کی طرح عوام کو جمع کرنے کا اور ریاست و وجاہت حاصل ہونے کا جال بنالیا اور قصہ خوانوں نے اپنی مجلسوں کو اس کے ذکر سے پُر کردیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ائمۂ ہدیٰ کو ایسے منکرات دور کرنے کے لیے کھڑا کیا تو وہ مٹ گئے۔ اور آٹھویں صدی کے شروع میں بلادِ مصر وشام سے بالکل اٹھ گئے۔

فائدہ: اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ روشنی اور آتش بازی کی رسمِ قبیح، اسرافِ بے جا وغیرہ کی وجہ سے سخت حرام ہونے کے علاوہ رسومِ شرکیہ میں سے ہے، اور جو شخص رسومِ شرکیہ کا ارتکاب کرلے اس کے متعلق بموجبِ حدیث مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ سخت اندیشہ ہے کہ ان

مشرکین کے ساتھ اس کا حشر ہو جنھوں نے یہ رسومِ شرکیہ جاری کی تھیں۔

کیا اب بھی لوگ ان خرافات سے باز نہ آئیں گے؟ حق تعالیٰ تمام رسومِ بدعیہ وشرکیہ کو دنیا سے جلد مٹا دے اور اسلامی سنت کو جاری فرما دے۔ آمین ثم آمین۔

رمضان شریف اور عید مبارک کے احکام

ماہِ رمضان کی فضیلت: حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ شعبان کے آخری روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ میں فرمایا (غالباً اخیر تاریخ کو جمعہ واقع ہوا ہوگا یا جمعہ نہ ہوگا تو ویسے ہی وعظ فرمایا ہوگا) اے لوگو! تحقیق سایہ ڈالا تم پر ایک بڑے مہینے نے، برکت والے مہینے نے، وہ ایسا مہینہ ہے کہ اس میں ایک رات ایسی (آتی) ہے جو کہ ہزار مہینے سے بڑھ کر ہے (یعنی لیلۃ القدر) اللہ تعالیٰ نے اس (ماہ) کے روزے فرض کیے اور رات کا قیام تطوع قرار دیا (تطوع کا لفظ کبھی سنتِ مؤکدہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ چناں چہ یہاں سنتِ مؤکدہ ہی مراد ہے کیوں کہ تراویح کا سنتِ مؤکدہ ہونا ثابت ہے جیسا کہ تراویح کے بیان میں آئے گا) جس نے اس (ماہ) میں کوئی نیک خصلت (از قبیل نوافل) ادا کی وہ اس کے مانند ہوتا ہے جس نے رمضان کے سوا (کسی دوسرے ماہ) میں فرض ادا کیا ہو، اور جس نے اس ماہ میں فرض ادا کیا وہ ایسا ہوتا ہے جیسا کہ اور دنوں میں ستّر فرض ادا کیے ہوں، اور وہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر ایسی چیز ہے کہ اس کا بدلہ جنّت ہے، اور غم خواری کا مہینہ ہے (کہ اس میں فقرا کی زیادہ غم خواری کی جاتی ہے) اور ایسا مہینہ ہے کہ اس میں مؤمن کا رزق زیادہ کیا جاتا ہے۔ جس میں اس نے روزہ دار کو افطار کرایا اس کو گناہوں سے بخشش اور دوزخ کی آگ سے نجات حاصل ہوتی ہے اور اس کو روزہ دار کے برابر ثواب ملتا ہے۔ بدوں اس کے کہ روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی کی جاوے۔ ہم نے عرض کیا: اے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! ہم میں ہر شخص ایسا نہیں جو روزہ دار کو افطار کرانے کی مقدور رکھتا ہو۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ ثواب تو اللہ تعالیٰ اس کو عطا فرماتا ہے جو کہ روزہ دار کو دودھ کا ایک گھونٹ، یا ایک کھجور، یا ایک پانی کا گھونٹ (وغیرہ) سے افطار کرادے اور جو شخص روزہ دار کو پیٹ بھر کھانا کھلاوے اس کو اللہ تعالیٰ میرے حوض

(یعنی حوضِ کوثر) سے سیراب کرے گا کہ پھر اس کو جنّت میں داخل ہونے تک پیاس ہی نہ لگے گی اور یہ معلوم ہی ہے کہ جنّت میں پیاس نہیں ﴿وانک لا تظمأ فیھا﴾ پس پیاس سے ہمیشہ کے لیے بے فکری ہوجاتی ہے۔حق تعالیٰ جلّ شانُہٗ ہم سب کو یہ دولتِ لازوال نصیب فرماوے۔آمین ثم آمین۔

اور وہ ایسا مہینہ ہے کہ اس کا اوّل (حصّہ) یعنی عشرۂ اولیٰ رحمت ہے اور درمیان اس کا مغفرت ہے اور اخیر حصّہ اس کا آگ سے آزادی ہے، اور جس نے اپنے باندی غلام سے بوجھ ہلکا کیا اس ماہ میں اس کو اللہ تعالیٰ بخش دیتا ہے، اور (دوزخ کی) آگ سے آزاد کردیتا ہے۔[1]

اور ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تمھارے پاس رمضان آگیا ہے مبارک مہینہ، اللہ تعالیٰ نے اس کے روزے تم پر فرض کیے ہیں، اس میں آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور جہنّم کے دروازے بند کردیے جاتے ہیں اور سرکش شیطانوں کو طوق پہنائے جاتے ہیں۔ اللہ کی (بنائی ہوئی) اس میں ایک رات ہے جو ہزار ماہ سے بہتر ہے، جو شخص اس رات کی خیر (وبرکت) سے محروم رہا وہ بالکل ہی محروم رہا۔

ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (جب کہ رمضان شروع ہوچکا تھا): بے شک یہ مہینہ آیا تمھارے پاس اور اس میں ایک رات جو ہزار ماہ سے بہتر ہے جو اس سے محروم رہا پس وہ سب بھلائیوں سے محروم رہا، اور نہیں محروم ہوتا اس سے کوئی مگر ہر بے نصیب۔[2]

ارشاد فرمایا حق تعالیٰ شانہٗ نے: اے مؤمنو! فرض کیے گئے تم پر روزے جیسا کہ فرض کیے گئے تھے تم سے پہلے لوگوں پر تا کہ تم بچو (گناہوں سے اور دوزخ کی آگ سے)۔

روزے کے فضائل وآداب: ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: جب ماہِ رمضان کی پہلی رات ہوتی ہے تو قید کردیے جاتے ہیں شیطان اور سرکش جنات اور دوزخ کے دروازے بند کردیے جاتے ہیں، پس نہیں کھولا جاتا ان میں سے کوئی دروازہ (پورے مہینہ تک) اور جنّت

---

[1] بیہقی [2] ابن ماجہ

کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، پس ان میں سے کوئی دروازہ بند نہیں کیا جاتا۔ اور پکارتا ہے پکارنے والا: اے خیر کے طلب گار! آگے بڑھ۔ اور اے برائی کا ارادہ کرنے والے! رُک جا۔ اور خدا کے ہاں بہت سے لوگ (بہ برکت ماہِ رمضان) دوزخ سے آزاد کیے ہوئے ہیں۔ اور یہ (ندا اور پکار) ہر رات ہوتی ہے۔[۱]

اور ارشاد فرمایا آں حضرت ﷺ نے کہ بنی آدم کا ہر عمل بڑھایا جاتا ہے (اس طرح کہ) ایک نیکی دس گنا ہوتی ہے سات سو گنا تک۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے: مگر روزہ کہ وہ میرے لیے ہے اور میں خود اس کی جزا دوں گا۔ چھوڑتا ہے (روزہ دار) اپنی خواہش کو اور اپنے کھانے (پینے) کو میری وجہ سے۔ روزہ دار کے واسطے دو خوشیاں ہیں: ایک خوشی افطار کے وقت ہوتی ہے اور ایک خوشی اپنے رب سے ملنے کے وقت ہوگی۔ اور بالضرور روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک سے زیادہ اچھی ہے (اس سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ پھر مسواک کرنا اچھا نہ ہوگا کیوں کہ مسواک کے بعد بھی وہ بو جو خلوِّ معدہ کے باعث آتی ہے زائل نہیں ہوتی۔ مسواک سے تو فقط دانتوں کی بدبو دور ہو جاتی ہے) اور روزہ ڈھال ہے (دوزخ سے) اور جب تم میں سے کسی کے روزے کا دن ہو تو اس کو چاہیے کہ نہ فحش بات کہے اور نہ بے ہودہ چلّائے۔ پس اگر کوئی اس کو برا کہے یا اس سے کوئی جھگڑا کرنے لگے تو کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں۔[۲] اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس شخص نے (روزہ رکھ کر بھی) بے جا بات کہنا اور اس پر عمل کرنا نہیں چھوڑا اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانے اور پینے کو چھوڑنے کی حاجت نہیں ہے (یعنی اس روزہ کو قبول نہیں کرتا)۔[۳]

نیز ارشاد فرمایا کہ سحری کھایا کرو کیوں کہ سحری میں برکت ہے۔[۴] اور نیز ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی افطار کرے تو اس کو چاہیے کہ کھجور سے افطار کرے کیوں کہ وہ برکت (کا سبب) ہے۔ پس اگر کسی شخص کو کھجور نہ ملے تو اس کو چاہیے کہ پانی سے افطار کرے کیوں کہ وہ پاک کرنے والا ہے۔[۵]

---

۱ ترمذی وابن ماجہ واحمد ۲ متفق علیہ ۳ بخاری ۴ متفق علیہ ۵ ترمذی

اور آں حضرت ﷺ جب افطار فرماتے تو یہ دعا پڑھتے:

اَللّٰهُمَّ لَكَ صُمْتُ وَعَلىٰ رِزْقِكَ اَفْطَرْتُ.

اے اللہ! میں نے تیرے لیے روزہ رکھا اور تیرے رزق سے افطار کیا۔

اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے:

ذَهَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالىٰ.

پیاس گئی اور رگیں تر ہوئیں اور اجر ثابت ہو گیا، اگر خدا نے چاہا۔[1]

تراویح اور تلاوت قرآن شریف کے فضائل وآداب: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے رمضان کا روزہ فرض کیا ہے اور میں نے اس (کی راتوں) کا جاگنا (یعنی تراویح پڑھنا) مسنون کیا ہے۔ پس جس شخص نے صرف ایمان اور طلبِ ثواب کی وجہ سے اس کے روزے رکھے اور اس (کی راتوں) میں (تراویح کے واسطے) قیام کیا وہ گناہوں سے ایسا نکل جاتا ہے جیسا کہ اس دن تھا جس دن اس کو اس کی ماں نے جنا تھا۔[2]

اور نیز ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے ایمان اور طلبِ ثواب کی وجہ سے بخش دیے گئے اس کے گزشتہ گناہ، اور جس نے رمضان میں قیام کیا (یعنی تراویح پڑھی) ایمان اور طلبِ ثواب کی وجہ سے اس کے (بھی) گزشتہ گناہ بخش دیے گئے، اور جس شخص نے ایمان اور طلبِ ثواب کی وجہ سے لیلۃ القدر کو شب بیداری کی، اس کے (بھی) گزشتہ گناہ بخش دیے گئے۔[3]

اور ارشاد فرمایا رسولِ خدا ﷺ نے کہ روزہ اور قرآن بندے کی شفاعت کریں گے۔ روزہ کہے گا: اے میرے رب! میں نے اس کو کھانے سے اور خواہشوں سے دن بھر روکا، پس اس کے لیے میری شفاعت قبول فرما۔ اور قرآن شریف کہے گا: میں نے اس کو رات میں سونے سے روکا، پس اس کے بارے میں میری شفاعت قبول فرما۔ پس دونوں کی شفاعت قبول ہو جائے گی۔[4]

اور ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ بہت روزے دار ایسے ہیں کہ ان کو روزے سے

[1] ابوداؤد [2] عن ترغیب عن النسائي. [3] متفق علیہ [4] بیہقی

پیاس کے سوا کچھ حاصل نہیں، اور بہت شب بیدار ایسے ہیں کہ ان کو بے خوابی کے سوا کچھ حاصل نہیں۔[1] جو لوگ روزہ کے اور شب بیداری کے حقوق ادا نہیں کرتے اس حدیث شریف سے ان کو سبق حاصل کرنا چاہیے۔

اور ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ کوئی نمازی نہیں مگر ایک فرشتہ اس کے دائیں ہے اور ایک بائیں ہے۔ پس اگر وہ شخص نماز کو پورا کر دیتا ہے تو وہ دونوں اس کو لے کر (آسمان پر) چڑھ جاتے ہیں، اور اگر اس کو پورا نہ کیا تو اس نماز کو اس کے منہ پر مارتے ہیں (روزہ وغیرہ کا بھی اسی طرح حال ہوتا ہوگا)۔[2]

آں حضرت ﷺ سے قولِ خداوندی ﴿وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝﴾[3] کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا: اس کو خوب صاف صاف پڑھ اور کھجوروں کی طرح اس کو منتشر نہ کرو اور نہ شعر کی طرح جلدی پڑھو، اس کے عجائب میں ٹھہر کر غور کرو اور اس کے ساتھ دلوں کو متأثر کرو۔ اور تم میں سے کوئی شخص (بلا سوچے سمجھے) آخر سورت (تک پہنچنے) کا ارادہ نہ کرے۔[4] اور حق تعالیٰ شانہٗ نے ارشاد فرمایا ہے: اے کپڑوں میں لپٹنے والے نبی (ﷺ)! رات کو کھڑے رہا کرو مگر تھوڑی سی رات یعنی آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر دیجیے یا کچھ زیادہ کر دیجیے اور قرآن خوب صاف صاف پڑھا کرو۔ (اس حدیث شریف اور آیتِ مبارکہ پر ان لوگوں کو خاص طور سے خیال کرنا چاہیے جو تراویح میں قرآن شریف بے حد تیزی سے پڑھنے کو فخر سمجھتے ہیں)۔

شبِ قدر اور اعتکاف کے مسائل: ارشاد فرمایا حق تعالیٰ شانہٗ نے: اور نہ مباشرت کرو (یعنی بدن بھی نہ ملنے دو) عورتوں سے جس زمانہ میں کہ تم معتکف ہو مسجد میں۔

اعتکاف کرنا بھی سنت ہے خاص کر عشرۂ اخیرہ میں تو ہر بستی میں (خواہ وہ شہر ہو یا گاؤں) کم از کم ایک شخص کا اعتکاف میں بیٹھنا سنتِ مؤکدہ ہے۔ اگر بستی بھر میں کوئی بھی نہ بیٹھے تو سب کو ترکِ سنت کا گناہ ہوگا جس طرح جنازہ کی نماز ان مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے

[1] دارمی [2] ترغيب عن الأصبهاني [3] المزمل: ٤
[4] الدر المنثور عن العسكري في المواعظ عن علي ﷺ

جن کو اطلاع ہو اسی طرح ہر شہر اور گاؤں پر عشرۂ اخیرہ کا اعتکاف سنتِ کفایہ ہے۔

نیز ارشاد فرمایا حق تعالیٰ شانہٗ نے کہ لیلۃ القدر بہتر ہے ہزار ماہ سے۔ اور آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے قیام کیا شبِ قدر میں ایمان اور طلبِ ثواب کی وجہ سے بخش دیے گئے اس کے گزشتہ گناہ۔[۱] و نیز ارشاد فرمایا کہ رمضان میں ایک رات ہے جو ہزار ماہ سے بہتر ہے، جو اس کی خیر سے محروم رہا وہ بالکل ہی محروم رہا۔[۲]

اور سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جو شخص شبِ قدر کو عشا کی جماعت میں حاضر ہو گیا اس نے اس میں سے حصہ پالیا۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث شریف میں محروم ہونے والے سے وہ مراد ہے جو اس روز جماعت میں بھی شامل نہ ہوا ہو، اس سے بڑھ کر کیا آسانی ہوگی۔)[۳]

اور ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: جب شبِ قدر ہوتی ہے تو جبرائیل علیہ السلام فرشتوں کی ایک جماعت سمیت نازل ہوتے ہیں اور ہر اس شخص کے لیے دعا کرتے ہیں جو کھڑے یا بیٹھے اللہ کا ذکر کر رہا ہو۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کسی معتبر عالم سے روایت کی ہے کہ وہ یوں فرماتے تھے کہ آں حضرت ﷺ کو پہلے لوگوں کی عمریں یا ان میں سے جتنی خدا نے چاہا دکھلائی گئیں۔ پس گویا آپ ﷺ نے اپنی امت کو اتنے اعمال سے قاصر خیال فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے ایک رات یعنی لیلۃ القدر آپ ﷺ کو عطا فرمادی جو ہزار مہینے سے بہتر ہے۔[۴]

اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا معتکف کے بارے میں کہ وہ گناہوں سے بچتا ہے اور اس کے لیے نیک عمل (یعنی جن سے اعتکاف مانع ہو مثل عیادت وغیرہ) جاری کیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ان اعمال کے کرنے والے کو ثواب ملتا ہے (ایسا ہی معتکف کو بھی ملتا ہے)۔ اور رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے رمضان میں دس روز کا اعتکاف کیا وہ اعتکاف دو حج اور دو عمرے کے مانند ہے۔[۵]

اور ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ تلاش کرو تم شبِ قدر کو اخیر عشرہ میں رمضان کے۔[۶]

---

[۱] متفق علیہ [۲] احمد و نسائی [۳] موطأ امام مالک
[۴] ترغیب عن الموطأ [۵] ترغیب عن البیهقی [۶] بخاری

اور آں حضرت اللہ ﷺ کی عادت مبارک تھی کہ جب عشرۂ اخیرہ داخل ہوتا تو کمر مضبوط باندھ لیتے (یعنی عبادت کا بہت زیادہ اہتمام کرتے) اور شب بیداری کرتے اور اپنے گھر والوں (یعنی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن) کو اور صاحب زادیوں کو جگاتے۔[1] اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: اے رسول اللہ! اگر مجھے (کسی طرح)[2] شبِ قدر معلوم ہو جائے کہ فلاں رات میں ہے، تو میں اس میں کیا کہوں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ کہو۔ (اے اللہ! تو معاف کرنے والا ہے، معاف کرنے کو پسند رکھتا ہے۔ پس میرے گناہ معاف فرمادے۔)[3]

اور آں حضرت ﷺ سے سوال کیا گیا لیلۃ القدر کے بارے میں، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ ہر رمضان میں ہوتی ہے۔[4]

اور حق تعالیٰ جَلَّ شَانُہٗ نے ارشاد فرمایا ہے: قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی اور جفت کی اور طاق کی اور رات کی جب وہ چلے!۔

فائدہ: یہاں دس راتوں سے مراد عشرۂ اخیرہ کی دس راتیں ہیں۔[5] (پس ان کی قسم کھانے سے بڑی فضیلت معلوم ہوئی)۔

رمضان کے متعلق ضروری اور مختصر ہدایات

صوم:

۱۔ بلا وجہ شرعی روزہ کو ترک کرنا حرام اور سخت گناہ ہے۔

۲۔ روزہ کی غرض قوتِ بہیمیہ کے منکسر کرنے میں منحصر نہیں ہے جیسا کہ بعض نادانوں نے خیال کر کے روزہ کو غیر ضروری سمجھ لیا ہے۔ بلکہ اصل وجہ خدا اور رسول اللہ ﷺ کا حکم ماننا ہے جو ہر حال میں ضروری ہے۔

۳۔ روزہ کی نسبت تمسخر کے کلمات کہنا۔ مثلاً یہ کہ روزہ وہ رکھے جس کے گھر اناج نہ ہو،

---

۱ متفق علیہ ۲ یعنی کسی نشانی یا کشف وغیرہ سے معلوم ہو جاوے۔ ۳ احمد وابن ماجہ وترمذی
۴ ابوداؤد ۵ کما فسرہ ابن عباس رضی اللہ عنہما. کذا فی الدر المنثور.

یا یہ کہ ہم سے بھوکا نہیں مرا جاتا، کفر ہے۔

۴۔ بلاضرورت صرف روزہ چھوڑنے کے واسطے سفر کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح بعض لوگ خواہ مخواہ اپنے آپ کو بیمار بنا کر رمضان میں مسہل وغیرہ شروع کر دیتے ہیں یہ بھی سخت گناہ ہے۔

۵۔ اچھا تن درست آدمی روزہ کے بدلے فدیہ دے کر روزہ سے بَری نہیں ہوسکتا بلکہ فدیہ شیخِ فانی وغیرہ کے لیے ہے جس کی تفصیل کتبِ فقہ میں موجود ہے۔

۶۔ جو افطار شرعی عذر سے ہو اور اس عذر کے دفع ہونے کے وقت کچھ دن باقی رہے تو کھانے پینے وغیرہ سے رُکنا چاہیے۔

۷۔ بچوں کو بالغ ہونے سے پہلے تحمّل کے موافق روزہ رکھنے کی عادت ڈالو ورنہ بعد بلوغ کے ان کو روزہ رکھنا دُشوار ہوگا۔

۸۔ سفر میں یا مرض میں بعض لوگوں کی جان کو بن جاتی ہے، لیکن پھر بھی روزہ رکھتے رہتے ہیں، اس کی بھی ممانعت ہے۔

۹۔ اگر شیر خوار بچے کو والدہ کے روزہ رکھنے سے تکلیف وضرر ہو تو روزہ رکھنا بہتر نہیں بلکہ افطار کرنا چاہیے بعد میں قضا کرے۔

۱۰۔ محض خوشی منانے اور رسم افطاری میں اپنا حوصلہ نکالنے کے واسطے بہت کمزور اور بے سمجھ بچوں سے روزہ رکھوانا ممنوع ہے۔

روزہ میں غیبت:

۱۱۔ نگاہِ بد اور تمام معاصی سے بہت اہتمام کے ساتھ بچو۔ روزہ میں بعض لوگ دل بہلانے کے واسطے ان معاصی کے مرتکب ہوتے ہیں، اور اسی طرح چوسر، گنجفہ کھیلنا، ہارمونیم، گراموفون وغیرہ بجاتے ہیں، یہ سب امور روزہ میں اور دنوں کی نسبت اشد درجہ حرام ہیں۔

۱۲۔ جس طرح معاصی سے بچنا ضروری ہے اسی طرح لایعنی اور فضول کلام سے بھی پرہیز کرنا چاہیے۔

۱۳۔ رمضان المبارک میں خاص طور پر غذائے حلال کا بہت زیادہ خیال رکھو۔

۱۴۔ منجھلے روزہ کا زیادہ اہتمام کرنے کی کوئی اصل نہیں ہے۔

فائدہ: تجربہ اور مشاہدہ سے رمضان المبارک کا یہ خاصہ ثابت ہوا ہے کہ رمضان المبارک میں جن معاصی اور نفس کی ناجائز خواہشوں سے آدمی بچتا ہے، تمام سال اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ ان سے بچنا آسان ہوتا ہے۔ اس لیے ہمت کر کے اس ماہ میں تمام معاصی خواہ اعضائے ظاہری سے ان کا تعلق ہو یا قلب سے، سب سے بچو۔

سحور:

۱۵۔ بعض لوگ آدھی رات ہی سے سحور کھا لیتے ہیں، اس سے ثواب کامل سحور کا نہیں ہوتا۔

۱۶۔ اور بعض اس قدر تاخیر کرتے ہیں کہ صبح صادق ہونے کا شبہ ہو جاتا ہے اس سے بھی احتراز بہت لازم ہے۔

۱۷۔ بعض لوگ سحر تو مناسب وقت کھاتے ہیں مگر فضول حقہ و پان میں اس قدر دیر کرتے ہیں کہ اشتباہ ہو جاتا ہے۔ اس میں بھی سخت احتیاط کرنا ضروری ہے۔

افطار:

۱۸۔ افطاری کھانے میں اس قدر مشغولی کہ مغرب کی جماعت فوت ہو جائے بہت ہی خسارے کی بات ہے۔

۱۹۔ بہتر یہ ہے کہ روزہ مسجد میں افطار کیا کریں تا کہ جماعت نہ جاوے۔

۲۰۔ افطاری کی حرص سے گھر پر مغرب کی نماز پڑھنا اور مسجد و جماعت کے ثواب سے محروم رہنا بڑی کم ہمتی کی بات ہے۔

تراویح:

۲۱۔ فارغ ہونے کی جلدی میں وقت سے پہلے کھڑے نہ ہونا چاہیے ورنہ ترکِ فرض کا گناہ سر پر رہے گا۔

۲۲۔ عشا کی اذان بھی تراویح جلدی ہونے کے لیے وقت سے پہلے نہ کہلائیں ورنہ ترکِ اذان کا وبال گردن پر رہے گا۔

۲۳۔ قرآن شریف نہ بہت تیز پڑھیں کہ کچھ سمجھ میں نہ آوے، اور نہ اس قدر ٹھہر کر کہ مقتدیوں کو تکلیف ہو۔

۲۴۔ ثناوتسبیحات وتشہد ودرود، تراویح میں اطمینان کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔

۲۵۔ اُجرتِ مشروطہ یا معروفہ پر تراویح میں قرآن سنانا جائز نہیں ہے۔

۲۶۔ نابالغ لڑکوں کو امام نہ بناویں، بلکہ ایسے بالغ بچوں کو امام بنانا بھی مناسب نہیں کہ جن کو طہارت اور نماز کے مسائل معلوم نہ ہوں، یا باوجود علم کے احتیاط نہ کرتے ہوں۔

۲۷۔ ختم قرآن شریف پر شیرینی کا اہتمام والتزام نہ کرنا چاہیے۔ خاص کر چندہ کر کے شیرینی تقسیم کرنا تو اور بھی زیادہ مفاسد کو مشتمل ہے۔

۲۸۔ ختمِ قرآن شریف کے دن مسجد میں روشنی کا خاص اہتمام کرنا ثابت نہیں بلکہ معصیت واسراف ہے۔

۲۹۔ نامحرم حافظوں کو گھر میں بلا کر عورتیں قرآن سنتی ہیں، اس میں بہت مفاسد ہیں اس لیے اس سے پرہیز کریں۔

عیدالفطر کے فضائل واحکام

ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: جو شخص بیدار رہا عیدین کی دونوں راتوں میں طلبِ ثواب کے لیے اس کا دل نہ مرے گا جس دن سب دل مردہ ہوں گے۔[1]

اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ہر قوم کے لیے عید ہوتی ہے اور یہ ہماری عید ہے۔[2]

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ (مدینہ میں) تشریف لائے اور ان (اہلِ مدینہ) کے لیے دو روز تھے جن میں وہ کھیل کود کیا کرتے تھے۔ پس آپ ﷺ نے دریافت کیا: یہ دونوں دن کیا ہیں؟ انھوں نے عرض کیا: ان میں ہم کھیل کود کیا کرتے تھے زمانہ جاہلیت میں۔ پس رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم کو اللہ نے ان دو دنوں کے بدلہ میں ان سے اچھے دو دن عطا فرمائے ہیں: بقرعید کا دن اور عید کا دن۔[3]

---

[1] ترغيب عن ابن ماجه. ومعناه عن أوسط الطبراني والكبير.　[2] متفق علیہ　[3] ابوداؤد

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب ان کی عید الفطر کا دن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ فرشتوں پر فخر کرتا ہے، پس ارشاد فرماتا ہے: اے میرے فرشتو! کیا بدلہ ہے اس شخص کا جس نے اپنے کام کو پورا کر دیا ہو؟ وہ عرض کرتے ہیں: اے ہمارے رب! ان کا بدلہ یہ ہے کہ ان کا ثواب پورا دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے اور بندیوں نے میرے فرض کو پورا کر دیا جو ان پر ہے، پھر نکلے کہ فریاد کرتے ہوئے دعا کرتے ہیں، قسم ہے اپنی عزت وجلال کی! اور اپنے کرم کی! اور اپنے علو (شان) کی! اور اپنے مرتبہ کے بلند ہونے کی! میں ضرور ان کی دعا قبول کروں گا۔ پس (اپنے بندوں سے خطاب) فرماتا ہے کہ لوٹ جاؤ تم، تحقیق میں نے تم کو بخش دیا اور بدل دیا تمھاری برائیوں کو نیکیوں سے۔ (آں حضرت ﷺ نے) ارشاد فرمایا: پس وہ (نماز کے بعد) بخشے ہوئے لوٹتے ہیں۔[1]

اور ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: جب عید الفطر کا دن ہوتا ہے تو فرشتے راستہ کے دروازوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ پس پکارتے ہیں: اے مسلمانوں کے گروہ! چلو ربِ کریم کی طرف جو احسان کرتا ہے بھلائی کے ساتھ پھر اس پر بہت ثواب دیتا ہے، (یعنی خود ہی توفیقِ عبادت دیتا ہے، پھر خود ہی ثواب عنایت کرتا ہے،) اور تحقیق تم کو قیامِ لیل کا حکم دیا گیا تھا پس تم نے قیام کیا، اور تم کو روزے رکھنے کا حکم دیا گیا پس تم نے روزے رکھے اور اپنے پروردگار کی اطاعت کی۔ پس تم انعام حاصل کرو۔ پھر جب نماز پڑھ چکتے ہیں تو منادی پکارتا ہے: آگاہ ہو جاؤ، بے شک تمھارے رب نے تم کو بخش دیا، پس لوٹو تم اپنے گھروں کی طرف کامیاب ہو کر، پس وہ یوم الجائزہ ہے۔ اور اس دن کا نام آسمان میں یوم الجائزہ (انعام کا دن) رکھا جاتا ہے۔[2]

اور آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ (صدقۂ فطر) ایک صاع گیہوں کا دو شخصوں کی طرف سے ہے چھوٹا ہو یا بڑا، آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، سب کی طرف سے نصف نصف صاع ہے، بہرحال تم میں جو غنی ہو اس کو اللہ تعالیٰ پاک کر دیتا ہے (صدقۂ فطر ادا کرنے کی وجہ سے) اور تم میں جو فقیر ہو (اور پھر بھی صدقۂ فطر دے دے) تو اللہ تعالیٰ اس کو

[1] بیہقی [2] جمع الفوائد عن الکبیر

اس کے دینے سے بھی زیادہ عطا فرما دیتا ہے۔[1]

اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقۂ فطر کو فرض کیا ہے، روزے کو بے فائدہ اور فحش باتوں سے پاک کرنے کے واسطے اور مساکین کو کھلانے کے واسطے۔[2]

اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقۂ فطر کا ایک صاع مقرر فرمایا ہے کھجور سے، یا ایک صاع جو سے، اور حکم دیا ہے کہ وہ ادا کیا جاوے نماز (عید) میں جانے سے پیشتر۔[3]

پہلی روایت سے معلوم ہو چکا ہے کہ گیہوں نصف صاع دی جاتی ہے، کشمش بھی نصف صاع واجب ہے۔ اگر کوئی شخص علاوہ ان چار چیزوں کے (یعنی گندم، کشمش، تمر، جو) کے دینا چاہے تو قیمت کا اعتبار ہے۔ پس نصف صاع گندم کی، یا ایک صاع جو کی جو قیمت ہو اتنی قیمت کے چاول وغیرہ دیے جاویں، اور صاع دو سو تہتر تولہ کا ہوتا ہے اور نمازِ عید سے پیشتر صدقۂ فطر کا ادا کرنا مستحب ہے، اگر بعد میں دیا جائے تب بھی جائز ہے۔

اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم عید اور بقر عید کے روز عیدگاہ میں تشریف لے جاتے۔ پس اولاً نماز پڑھتے، پھر لوگوں کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاتے، اور لوگ صف باندھے بیٹھے رہتے، پس آپ خطبہ پڑھتے۔[4]

فائدہ: نماز کے بعد خطبہ میں خاموش بیٹھے رہنا واجب ہے۔ پس جو لوگ شور وغل مچاتے ہیں وہ سخت گناہ گار ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح جو لوگ خطبہ چھوڑ کر چل دیتے ہیں وہ بھی بُرا کرتے ہیں۔ اور جو لوگ بیٹھتے ہیں وہ بھی صف کا لحاظ نہیں رکھتے حالاں کہ صف باندھے رہنا چاہیے۔ البتہ اگر کوئی شخص بیچ میں سے اُٹھ کر چل دیا، اس واسطے صف ٹوٹ گئی ہو تو ان بیٹھنے والوں کو گناہ نہ ہوگا بلکہ جو چلا گیا ہے یہ صف توڑنا اس کا فعل ہے۔ واللّٰہ أعلم.

اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے پھر اس کے بعد چھ روزے شوال کے رکھے تو ایسا ہو گیا جیسا کہ ہمیشہ (یعنی سال بھر) روزے رکھے۔[5]

---

[1] ابوداؤد [2] ابوداؤد [3] متفق علیہ [4] متفق علیہ [5] مسلم

فائدہ: اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک نیکی کے بدلہ میں دس نیکیاں ملتی ہیں، پس رمضان کے روزے رکھنے سے دس ماہ کے روزوں کا ثواب مل چکا تھا۔ چھ روزے اور رکھے تو بقیہ دو ماہ کا ثواب حاصل ہوگا۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کے خطبہ میں تکبیر بکثرت پڑھا کرتے تھے۔[1]

اور ارشاد فرمایا حق تعالیٰ جل شانہ نے: بے شک نجات پائی اس شخص نے جس نے زکوٰۃ دی (یعنی صدقۂ فطر ادا کیا) پھر اللہ کا نام لیا (یعنی تکبیر پڑھی) پھر نماز پڑھی۔

عبید بن حمید اور ابن المنذر نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے زکوٰۃ سے مراد صدقۂ فطر اور نماز سے نمازِ عید مراد ہونا نقل کیا ہے۔[2]

اور حضرت مولانا تھانوی مد ظلہم نے فرمایا ہے کہ اس تفسیر پر اگر ﴿ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ﴾ سے راستہ میں تکبیر کہنا مراد لے لیا جاوے تو بعید نہیں ہے۔ فقط

کپڑوں کا لوگ بہت اہتمام کرتے ہیں حتیٰ کہ بعض لوگ قرض لے کر نئے کپڑے بنواتے ہیں، بعض مستعار کپڑے پہنتے ہیں، اس اہتمام کی بھی کوئی اصل نہیں ہے۔ بلکہ سنت یہ ہے کہ ہر شخص کے پاس جو کپڑے ہیں ان میں سے جو اچھے ہوں وہ پہنے۔

عیدالفطر کے دن بارہ ۱۲ چیزیں مسنون ہیں: ۱۔ شرع کے موافق آرائش کرنا۔ ۲۔ غسل کرنا۔ ۳۔ مسواک کرنا۔ ۴۔ عمدہ کپڑے جو پاس موجود ہوں پہننا۔ ۵۔ خوش بو لگانا۔ ۶۔ صبح سویرے اُٹھنا۔ ۷۔ عیدگاہ سویرے جانا۔ ۸۔ عیدگاہ جانے سے قبل کوئی شیریں چیز کھانا۔ ۹۔ عیدگاہ جانے سے قبل صدقۂ فطر دینا۔ ۱۰۔ عید کی نماز کے لیے عیدگاہ میں جاوے، بلا عذر شہر میں نہ پڑھے۔ ۱۱۔ جس راستہ سے جاوے اس کے علاوہ دوسرے راستہ سے واپس آنا۔ ۱۲۔ پیادہ جانا اور راستہ میں اَللّٰہُ أَکْبَرُ اَللّٰہُ أَکْبَرُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ آہستہ پڑھتا جاوے۔

عیدالفطر کی نماز پڑھنے کا یہ طریقہ ہے کہ اوّل یوں نیت کرے: میں دو رکعت واجب عیدالفطر مع چھ تکبیروں کے ادا کرتا ہوں۔ پھر یہ نیت کر کے تکبیرِ تحریمہ کہتے ہوئے ہاتھ باندھ

---

[1] ابن ماجہ　[2] كذا في الدر المنثور.

لے اور سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ..... وَلَا إِلٰهَ غَيْرُكَ تک پڑھ کر تین مرتبہ اَللّٰهُ أَكْبَرُ کہے اور ہر مرتبہ کانوں تک ہاتھ اُٹھاوے، اور پہلی دوسری تکبیر کے بعد ہاتھ چھوڑ دے مگر تیسری تکبیر کے بعد ہاتھ باندھ لے، اور امام قراءت شروع کرے اور مقتدی خاموش کھڑے رہیں اور حسب دستور رکوع سجدہ وغیرہ کریں۔ پھر جب دوسری رکعت میں امام قراءت کر چکے تو تین تکبیریں مثل سابق کے کہے، لیکن یہاں تیسری تکبیر کے بعد ہاتھ نہ باندھے بلکہ چھوڑ دے اور پھر ہاتھ اٹھائے بغیر چوتھی تکبیر کہہ کر رکوع میں جاوے۔

خطبہ عیدین کا سنت ہے اور حاضرین پر اُس کا سننا واجب ہے، اس وقت بولنا چالنا نماز پڑھنا وغیرہ حرام ہے۔

یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ بعد نمازِ عید آپس میں معانقہ اور مصافحہ کرتے ہیں اور اس کو ضروری خیال کرتے ہیں، یہ بالکل بدعت ہے ہاں جو لوگ باہر کے آئے ہیں اگر ان میں سے بوجہ ملاقات کے مثل اور ایام کے معانقہ یا مصافحہ کیا جاوے تو کچھ حرج نہیں۔

عید کے روز باہم ایک دوسرے کو اس لفظ سے تہنیت دینا تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَمِنْكُمْ یا اس کے ہم مضمون لفظ سے جیسا ''عید مبارک'' وغیرہ جائز اور فی الجملہ مستحب ہے، بشرطے کہ بطور رسم کے پابندی کے ساتھ نہ ہو۔

اگر عید جمعہ کے روز واقع ہو تو دونوں کی نماز لازم ہے، اوّل واجب، دوسری فرض۔ بعض بے علم جمعہ کے روز عید واقع ہونے کو نامبارک سمجھتے ہیں، یہ زعم بالکل باطل ہے بلکہ اس میں دو برکتیں جمع ہو جائیں گی۔ کسی نے خوب کہا ہے:

عِيْدٌ وَعِيْدٌ وَعِيْدٌ صِرْنَ مُجْتَمِعَه
وَجْهُ الْحَبِيْبِ وَيَوْمُ الْعِيْدِ وَالْجُمُعَه

ایک عید اور دوسری اور تیسری۔ روئے محبوب اور عید اور جمعہ بھی۔

تنبیہ اوّل: صدقۂ فطر صاحبِ نصاب پر جیسا اپنی طرف سے واجب ہے اسی طرح باپ کے ذمہ اپنے نابالغ بچوں کی طرف سے بھی واجب ہے، گو وہ کتنے ہی چھوٹے ہوں۔

تنبیہ دوم: بعض لوگ صدقۂ فطر مؤذنوں اور اماموں کو اس طرح دیتے ہیں کہ جب ان کو مسجد

میں رکھتے ہیں تو من جملہ اور اَشیا کے ایک صدقۂ فطر کو بھی ان کی اذان یا امامت کی اجرت میں شرط ٹھہرا لیتے ہیں کہ ہر سال صدقۂ فطر بھی ملا کرے گا، تو اس طرح شرط کر کے ان لوگوں کو صدقۂ فطر دینے سے ادا نہیں ہوتا۔ اگر ایسا کیا گیا ہے تو اس قدر دوبارہ فقرا پر صدقہ کرنا لازم ہے۔ ہاں، اگر بغیر کسی شرط کے صرف غریب سمجھ کر ان ہی کو دے دیا جاوے تو کچھ حرج نہیں ہے، اور اگر کسی جگہ مشروط تو نہ ہو مگر معروف ہو تو ایسی جگہ ان کو مسجد میں رکھتے وقت تصریحاً اس کی نفی کر دینا چاہیے کہ صدقۂ فطر نہ ملے گا۔

اضافۂ مفیدہ: ماہِ شوال میں چھ دن نفل روزہ رکھنے کی فضیلت اور دوسرے نفل روزوں سے بہت زیادہ ہے جن کو کہ ''شش عید کے روزے'' کہتے ہیں۔ لیکن اس میں بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ان کو عید کے اگلے ہی دن سے شروع کر دے تب تو وہ ثواب ملتا ہے ورنہ نہیں ملتا، تو یہ خیال غلط ہے بلکہ اگر مہینہ بھر میں بھی ان کو پورا کر لیا تو ثواب ملے گا خواہ عید کے اگلے ہی دن شروع کرے یا بعد کو شروع کرے اور خواہ لگاتار رکھے یا متفرق طور پر رکھے ہر طرح ثواب ملے گا۔

بعض لوگ ان چھ روزوں میں اپنے پچھلے قضا کے روزوں کو محسوب کر لیتے ہیں کہ ''شش عید کے روزے'' بھی ہوگئے اور قضا بھی ادا ہوگئی۔ تو خوب سمجھ لو کہ ان میں قضا کی نیت کرنے سے وہ فضیلت شش عید کی حاصل نہ ہوگی۔ قضا الگ ادا کرے اور ان کو ثواب کے لیے الگ رکھے۔ گو بعض کتابوں میں اس کو لکھ دیا ہے لیکن قواعد کے خلاف ہونے سے وہ صحیح نہیں، خوب سمجھ لو۔

زیارتِ حرمین شریفین کی تاکید اور فضیلت

ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے قولِ خداوندی: ﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ﴾[1] میں کہ وہ (یعنی حج کے معیّن مہینے) شوال اور ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے دس روز ہیں۔[2]

---

[1] البقرۃ: ۱۹۷

[2] الدر المنثور عن أوسط الطبراني والخطیب وابن مردویه، ونقل عن كثير من السلف.

فائدہ: شوال سے قبل حج کا احرام باندھنا مکروہ ہے، اور احرام کے علاوہ افعالِ حج میں سے کوئی فعل شوال سے قبل ہو تو وہ بالکل غیر معتبر ہے۔ مثلاً: کسی شخص نے طوافِ قدوم کے بعد سعی بین الصفا والمروہ رمضان میں کرلی تو سعی کافی نہیں، اور حق تعالیٰ جَلَّ شَانُہٗ نے فرمایا ہے: اللہ کے لیے لوگوں کے ذمہ بیت اللہ کا حج کرنا ہے ان پر جو کہ اس تک سبیل (یعنی زادِ راہ) کی طاقت رکھیں۔

اور ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ جو شخص حج کا ارادہ رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ جلدی کرے۔[۱] یعنی فرض ہونے کے بعد اوّل ہی سال جانا لازم ہے۔ اگر یہ نہ گیا تو تاخیرِ حج کا گناہ ہوگا، اور اگر کئی سال تک تاخیر کرتا رہا تو فاسق مردود الشہادۃ ہے۔[۲]

نیز ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ جس شخص کو کسی کھلم کھلا ضرورت، یا ظالم بادشاہ، یا رکاوٹ کے قابل مرض نے حج سے نہ روکا ہو اور پھر بھی (باوجود فرض ہونے کے) اس نے حج نہ کیا ہو، پس خواہ یہودی ہو کر مرے خواہ نصرانی۔[۳]

اور ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ جس شخص نے (خالص) اللہ کے لیے حج کیا اور اس میں فحش گوئی نہ کی اور نہ گناہ کیا تو وہ شخص اس دن کی مانند لوٹتا ہے جس دن کہ اس کی ماں نے اس کو جنا تھا۔[۴]

آں حضرت ﷺ نے چار عمرے کیے ہیں، وہ سب ذیقعدہ میں تھے، سوائے اس کے جو حجِ وداع کے ساتھ تھا (کہ وہ ذوالحجہ میں واقع ہوا تھا)۔[۵]

فائدہ (۱): عمرہ سنتِ مؤکدہ ہے، بلکہ بعض فقہا نے واجب کہا ہے۔ اور عمرہ اس کو کہتے ہیں کہ احرام میں عمرہ کی نیت کی جاوے اور طوافِ کعبہ اور صفا مروہ کے درمیان سعی کرے۔ پوری تفصیل مکتبۂ تھانوی کی ''معلم الحجاج'' میں دیکھیں۔

فائدہ (۲): اس جگہ ایک بات قابلِ تنبیہ یہ ہے کہ عام لوگ جو ماہِ ذیقعد کو منحوس سمجھتے ہیں یہ بڑی سخت بات ہے اور باطل عقیدہ ہے۔ دیکھیے آں حضرت ﷺ نے اس ماہ میں تین عمرے کیے ہیں اس سے کتنی برکت ثابت ہوتی ہے۔ نیز ماہِ ذیقعدہ حج کے مہینوں میں سے ہے

---

[۱] ابوداؤد ودارمی [۲] کما فی الدر وغیرہ. [۳] دارمی [۴] متفق علیہ [۵] متفق علیہ

جیسا کہ حدیث اوّل میں گزر چکا۔

ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ حج اور عمرہ ملا کر کیا کرو کیوں کہ وہ دونوں فقر اور گناہوں کو اس طرح دور کرتے ہیں جیسا کہ بھٹی لوہے اور چاندی اور سونے کے میل کو دور کرتی ہے۔ اور حجِ مبرور (یعنی مقبول) کی جزا جنّت کے سوا کچھ نہیں۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ شیطان کسی دن عرفہ کے دن سے زیادہ ذلیل و راندہ نہیں ہوا اور حقیر و رنجیدہ نہیں دیکھا گیا، اور نہیں ہے یہ مگر اسی کی وجہ سے جو کہ وہ رحمت کا نازل ہونا اور خدا تعالیٰ کا بڑے سے بڑے گناہ سے درگزر فرمانا دیکھتا ہے، سوائے جنگِ بدر کے (کہ اس میں تو یومِ عرفہ کے برابر یا زیادہ اس کی خواری وغیرہ دیکھی گئی) کیوں کہ (اس روز) اس نے جبرئیل علیہ السلام کو فرشتوں کی صفیں ترتیب دیتے ہوئے دیکھا تھا۔[2]

ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ (ایک) عمرہ (دوسرے) عمرہ تک کفارہ ہے ان دونوں کے درمیان (کے گناہوں) کا۔[3]

ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ حج کرنے والے اور عمرہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں، اگر وہ دعا مانگیں تو خدا قبول کرتا ہے اور وہ استغفار کریں تو وہ ان کی مغفرت کر دیتا ہے۔[4]

ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لیے میری شفاعت ضروری ہوگئی۔[5]

فائدہ: جن کو گنجایش ہو وہ حج کے ساتھ زیارتِ مدینہ کا شرف بھی ضرور حاصل کریں کہ اس کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے بلکہ تاکید بھی روایات میں آئی ہے۔ اور اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قبر شریف کی نیت سے جانا بھی مضایقہ نہیں رکھتا۔

اور حق تعالیٰ جل شانہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام سے بھی کہا گیا تھا کہ (لوگوں میں

---

[1] ترمذی ونسائی　[2] مالك مرسلا و شرح السنة

[3] ترغیب عن مالك والشیخین والترمذي والنسائي وابن ماجه.　[4] ترغیب، نسائی وابن ماجہ

[5] آثار السنن عن ابن خزيمة في صحيحه، والدارقطني وآخرين، و إسناده حسن.

حج کے فرض ہونے کا) اعلان کردو، لوگ تمھارے پاس (حج کے لیے) چلے آئیں گے، پیادہ بھی اور دبلی اونٹنی پر بھی جو کہ دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی۔

حج کے متعلق چند ضروری ہدایات

جس کے پاس ضروریات سے زائد اتنا خرچ ہو کہ سواری پر متوسط گزران سے کھاتا پیتا چلا جاوے اور حج کر کے چلا آوے اس کے ذمے حج فرض ہو جاتا ہے اور حج کی بہت بڑی بزرگی آئی ہے۔ جنابِ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو حج گناہوں اور خرابیوں سے پاک ہو اس کا بدلہ بجز بہشت کے اور کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح عمرہ پر بھی بڑے ثواب کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ چناں چہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ حج اور عمرہ گناہوں کو اس طرح دور کرتے ہیں کہ جیسے بھٹی لوہے کے میل کو دور کرتی ہے۔ اور جس کے ذمے حج فرض ہو اور وہ نہ کرے اس کے لیے بڑی دھمکی آئی ہے۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس کے پاس کھانے پینے اور سواری کا اتنا سامان ہو کہ وہ شخص بیت اللہ شریف تک جا سکے اور پھر وہ حج نہ کرے تو کچھ بعید نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے (نعوذ باللہ)۔

غرضے کہ حج کی بے حد فضیلت آئی ہے اور اس کے تارک پر جب کہ اس پر فرض ہو چکا ہو سخت وعید آئی ہے، سو اتنی بات تو اکثروں کو معلوم ہے، لیکن اس میں بعض غلطیاں عام ہو رہی ہیں، ان کو اس جگہ ظاہر کیا جاتا ہے۔

الف: جب حج کے خرچ کا حساب لگاتے ہیں تو اس میں زیارتِ مدینہ منورہ کے خرچ کا بھی حساب لگاتے ہیں۔ پس اگر مدینہ منورہ تک جانے کا خرچ ہوتا ہے تب تو حج کو فرض سمجھتے ہیں ورنہ فرض نہیں سمجھتے، تو یاد رکھو، اگر صرف سفرِ حج کے لیے جانے کا اور وہاں سے واپس چلے آنے کا خرچ ہو تو حج فرض ہو جاتا ہے، گو مدینہ منورہ کی زیارت کے لیے خرچ نہ ہو۔ البتہ اگر اس کی زیارت کا سامان یا ہمت ہو تو اس کا ثواب بھی بے حد و حساب ہے لیکن حج کا فرض ہونا اس پر موقوف نہیں۔ اگر ایسا شخص حج نہ کرے گا تو اس کے لیے وہی وعید ہے جو مرقومہ بالا حدیث میں آئی ہے۔

ب: راستہ میں اگر ذرا سا بھی شبہ ہوتا ہے تو لوگ حج کو فرض نہیں سمجھتے حالاں کہ معمولی اندیشہ کا اعتبار نہیں۔ پس اگر راستہ میں غالب گمان سلامتی کا ہے اور گمان بدامنی کا مغلوب ہے تو حج فرض ہو جاتا ہے۔

ج: بعض لوگوں کو حج کی گنجائش ہوتی ہے، لیکن تعمیرِ مکان یا شادی وغیرہ میں خرچ کرنے کو مقدم سمجھ کر حج سے اپنے آپ کو سبکدوش خیال کرتے ہیں اس کے متعلق یہ مسئلہ ہے کہ جس زمانہ میں عموماً لوگ حج کو جاتے ہیں (مثلاً: ہمارے ملک میں ماہِ شوال) اس سے قبل اگر کسی نے دوسرے کام میں رقم وغیرہ خرچ کردی تب تو حج فرض نہ ہوگا اور اگر سفرِ حج کا زمانہ آگیا تو حج فرض ہوگیا، اور تعمیرِ مکان یا شادی وغیرہ امورِ غیر ضروریہ عند الشرع میں خرچ کرنا جائز نہیں، گو انھیں اس تعمیر وغیرہ کی حاجت ہی ہو۔ اگر خرچ کرے گا گناہ گار ہوگا اور حج ذمہ رہے گا۔ خوب سمجھ لو۔

۱۔ جس پر حج فرض ہُوا اور اس کے والدین منع کرتے ہوں اس کو جانا فرض ہے، اس میں والدین کی اطاعت جائز نہیں۔

۲۔ جس طرح عورت پر حج فرض ہو اور اس کے ساتھ اس کا محرم بھی ہو، مگر اس کا شوہر منع کرتا ہو اس کو شوہر کا کہنا ماننا جائز نہیں۔

۳۔ بعض عورتیں بدوں محرم کے دوسری عورتوں کے ساتھ یا ثقہ مردوں کے ساتھ حج کو چلی جاتی ہیں، یہ جائز نہیں۔

۴۔ عورت اگر عدت میں ہو اس کا حج کا سفر کرنا بھی جائز نہیں، خواہ عدتِ وفات ہو، یا عدتِ طلاق، اور طلاق رجعی ہو، یا بائن، یا مُغلّظ۔ حتیٰ کہ اگر حج کے راستہ میں عدت واجب ہو جاوے یعنی تین منزل سفر کرنے کے بعد راستہ میں خاوند نے طلاق بائن دے دی ہو، یا اس کا انتقال ہو گیا ہو تو اسی جگہ عدت پوری کرے۔[1] البتہ اگر جہاز یا جنگل وغیرہ میں ایسا اتفاق پیش آجاوے تو ساحل تک یا قریبی آبادی تک پہنچنا جائز ہے۔

اور یہ تفصیل جب ہے کہ مقامِ طلاق یا وفات سے مکّہ معظمہ تین منزل ہو، اور اگر تین منزل

---

[1] اور اگر ابھی تک تین منزل سفر نہ ہوا تھا اور مکّہ معظمہ تک تین منزل باقی ہوں تو گھر واپس آنا ضروری ہے۔ اور اگر وہاں سے گھر بھی تین منزل سے کم ہو اور مکّہ معظمہ بھی تو اختیار ہے کہ واپس آجائے یا حج کو چلی جائے۔

سے کم ہو تو پھر حج کو چلی جائے۔ اور اگر خاوند نے طلاقِ رجعی دی ہے اور خاوند ساتھ جارہا ہے تو سفرِ حج موقوف کرنے کی ضرورت نہیں۔

۵۔ جس نے نابالغی میں حج کیا ہو اور پھر اس کو گنجایش سفرِ حج کی ہو جاوے تو پھر اس پر حج فرض ہوگا، وہ پہلا حج کافی نہیں۔

۶۔ اگر بلوغ کے بعد ناداری کی حالت میں حج کیا ہو اور پھر مال دار ہو جائے تو وہ پہلا حج کافی ہے۔

۷۔ حج بدل کے مسائل بہت نازک ہیں، جب کوئی حج بدل کے لیے جاوے یا کسی کو بھیجے تو کسی محقق عالم سے اس کے مسائل تحقیق کرلے۔[1]

۸۔ بعض لوگ تبرکات لانے کو ایسا لازم سمجھتے ہیں کہ اگر اس کے زیادہ خریدنے کے لائق خرچ نہ ہو حج ہی کو نہیں جاتے یا اسی طرح واپس آکر دعوت دینے کو بھی، سو ان امور کی وجہ سے حج کو ملتوی کرنا حرام ہے۔

۹۔ عوام الناس میں جمعہ کے روز کے حج کا لقب حجِ اکبر مشہور ہے، سو یہ شریعت میں لفظی تحریف کرنا ہے۔ کیوں کہ اطلاقاتِ شرعیہ میں حجِ اکبر مطلق حج کو کہتے ہیں، عمرہ سے ممتاز کرنے کے لیے، جس کو حجِ اصغر کہتے ہیں۔ اور قرآن مجید میں جو شروع سورۂ براءت میں ﴿يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ﴾[2] آیا ہے وہاں یہی تفسیر ہے۔ اب اس اصطلاحِ مخترع سے احتمال ہے تفسیر میں غلطی کا، اور عوام اس کے اہتمام میں بھی بہت غلو کرتے ہیں، یہ شریعت میں تحریفِ معنوی یعنی بدعت ہے۔ البتہ حج یومِ جمعہ کی فضیلت کا انکار نہیں۔ ایک بڑی فضیلت یہی ہے کہ حضور ﷺ کا حج جمعہ کے روز واقع ہوا تھا، مگر عوام کی زیادات یہ محض بے اصل ہیں۔

ایک نہایت ضروری مسئلہ: عام طور پر یوں سمجھا جاتا ہے کہ جب نقد روپیہ مصارفِ حج کے لیے کافی موجود ہو تب حج فرض ہوتا ہے، حالاں کہ جس کے پاس حاجت سے زائد اتنی زمین وغیرہ ہو جس کی قیمت مصارفِ حج کے واسطے کافی ہو اس پر بھی حج فرض ہے۔ لہٰذا ''عالمگیری''

---

[1] ''معلم الحجاج'' میں دیکھیں۔ [2] التوبة:۳

سے وہ صورتیں مفصل لکھی جاتی ہیں جن میں بدوں نقد کے بھی حج فرض ہوجاتا ہے:

۱۔ رہائشی مکان کے علاوہ کوئی زائد مکان ہو تو اس کو بیچ کر حج کرنا فرض ہے (یعنی جب کہ اس کی قیمت میں حج ہوسکے)۔ اسی طرح کسی کے پاس غلام ہو اور اس سے خدمت لینے کی ضرورت نہ ہو تب بھی فرض ہے کہ غلام کو فروخت کر کے حج کرے (یہی حکم جب ہے جب کہ ضرورت سے زائد گھوڑا وغیرہ کسی کے پاس ہو)۔

لیکن اگر کسی کے پاس صرف ایک مکان ہو اور وہ اتنا بڑا ہو کہ ایک حصّہ اس کی رہائش کے لیے کافی ہے اور باقی کی قیمت حج کے واسطے کافی ہوسکتی ہے تو اس کا حصّہ فروخت کرنا ضروری نہیں۔ اسی طرح اگر کسی کے پاس بہت قیمتی مکان ہے کہ اس کی قیمت میں بھی حج ہوسکتا ہے اور معمولی مکان بھی مل سکتا ہے تب بھی اس کے ذمہ حج فرض نہیں ہے، گو افضل یہی ہے کہ ان دونوں صورتوں میں حج کرے۔

۲۔ اگر کسی کے پاس قیمتی کپڑے ہیں جو استعمال میں نہیں لائے جاتے تو لازم ہے ان کو فروخت کر کے حج کیا جائے۔ زائد برتنوں کا بھی یہی حکم ہے، اور زیور تو شرعاً بالکل نقد کے حکم میں ہے۔

۳۔ اگر کسی جاہل کے پاس کتابیں ہوں تو ان کو حج کے واسطے فروخت کرنا ضروری ہے۔ البتہ اگر عالم کے پاس فقہ کی کتابیں ہوں[1] تو ان کو فروخت کرنا ضروری نہیں اور کتبِ تفسیر وحدیث وغیرہ کا بھی یہی حکم ہے، اور ''شامی'' میں ہے کہ علومِ آلیہ یعنی صرف ونحو وغیرہ کی کتابیں بھی کتبِ دینیہ کے ساتھ شمار کی جائیں گی۔

اور طب ونجوم (وغیرہ) کی کتابوں کو فروخت کرنا ہر حال میں ضروری ہے خواہ وہ جاہل کے پاس ہوں یا اہلِ علم کے، اور گو وہ استعمال ہی میں آتی ہوں، اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ منطق، فلسفہ وغیرہ کی کتابوں کا وہی حکم ہے جو طب کی کتابوں کا ہے۔ واللّٰہ أعلم.

---

[1] ''عالمگیری'' میں یہ قید بھی ہے کہ اس عالم کو ان کتابوں کی ضرورت بھی ہو، مگر ''شامی'' نے یہ قید نہیں لگائی۔ احقر کے خیال میں وجہِ تطبیق یہ ہے کہ قید کو اتفاقی کہا جائے، اسی لیے اس کو متن میں احقر نے نہیں لیا، لیکن جن صاحب کو اس مسئلہ کی ضرورت پیش آوے اس کو چاہیے کہ علمائے کرام سے تحقیق کرلے۔ فقط والسلام

۴۔ اگر کسی دکان دار کے پاس اتنا مالِ تجارت ہے کہ اگر کچھ مال فروخت کر کے حج ہوسکتا ہے اور باقی ماندہ مال سے بقدرِ ضرورت تجارت ہوسکتی ہے، تو حج کرنا فرض ہے۔

۵۔ جس پیشہ ور کے پاس ضروری اوزار وغیرہ کے علاوہ زائد سامان اتنا ہو کہ اس کی قیمت سے حج ہو سکے تب بھی حج فرض ہے۔

۶۔ جس زمین دار کے پاس اتنی زمین ہے کہ اگر مصارفِ حج کی مقدار فروخت کر دے تو باقی زمین کی آمدنی سے گزر ہوسکتا ہے تو اس پر زمین فروخت کر کے حج کرنا لازم ہے۔

۷۔ کاشت کار کے پاس اگر ہل اور بیل وغیرہ کے علاوہ اتنا سامان ہو کہ اس کی قیمت مصارفِ حج کے لیے کافی ہو سکتی ہے تو اس کے لیے بھی لازم ہے کہ زائد سامان کو فروخت کر کے حج کرے۔ فقط۔ واللہ أعلم.

عشرۂ ذوالحجہ کے احکام

اس ماہِ مبارک میں حج ہوتا ہے اس لیے اس کو ذوالحجہ کہتے ہیں (یعنی حج کا مہینہ)۔ لہٰذا اس سے واقف ہو کر اہتمام کیا جاوے اور وہ احکام یہ ہیں:

۱۔ ذوالحجہ کی یکم سے نہم تک روزے، اور دسویں تک شب بیداری۔ ۲۔ تکبیرِ تشریق۔ ۳۔ نمازِ عیدالاضحیٰ۔ ۴۔ قربانی۔ ان سب کا مختصر بیان کیا جاتا ہے۔

ان احکام میں تین مسئلے خاص طور پر پہلے ہی سے خیال رکھنے کے قابل ہیں:

اول یہ کہ قربانی کو خوب کھلا پلا کر موٹا کرنا مستحب ہے، اس لیے کچھ روز پیشتر ہی خرید لینا چاہیے۔

دوسرا یہ کہ جو قربانی کا ارادہ رکھتا ہو وہ ان دنوں میں یعنی پہلی ذوالحجہ سے قربانی ہونے تک ناخن اور بال نہ بنواوے۔

تیسرا یہ کہ ذوالحجہ کی چاند رات ہی سے شب بیداری اور پہلی ہی تاریخ سے روزہ رکھنا چاہیے۔ یہ سب اعمال مستحب ہیں۔

نو دن کے روزوں اور شب دسویں تک بیداری کی فضیلت: حق تعالیٰ جَلَّ شَانُہٗ نے ارشاد فرمایا:

قسم ہے فجر کی! اور دس راتوں کی! اور طاق کی! اور جفت کی!۔ اس آیت کے متعلق ”درِمنثور“ نے متعدد سندوں سے روایت درج کی ہے کہ آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس آیت میں دس راتوں سے عشرۂ ذی الحجہ مراد ہے اور طاق سے عرفہ کا دن اور جفت سے قربانی کا دن۔ واللّٰہ أعلم.

آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہے جس میں نیک عمل اللہ تعالیٰ کو ان دس دنوں [1] (کے عمل) سے زیادہ پسند ہو۔ [2]

حضرت رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی دن ایسے نہیں جن میں عبادت کرنا خدا تعالیٰ کو عشرۂ ذی الحجہ (کی عبادت) سے زیادہ پسند ہو، (کیوں کہ) ان میں سے ہر ایک دن کا روزہ ایک سال روزہ رکھنے کے برابر ہے، اور ہر ایک رات کا جاگنا شبِ قدر میں جاگنے کے برابر ہے۔ [3]

فائدہ: دسویں تاریخ سے تیرہویں تاریخ تک چار یوم کا روزہ حرام ہے، اس واسطے اس روزہ کی یہ فضیلت نو تاریخ تک کے لیے ہے۔

ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ میں اللہ تعالیٰ سے امید کرتا ہوں کہ عرفہ [4] (یعنی ذوالحجہ کی نو تاریخ) کا ایک روزہ ایک سال گزشتہ اور ایک سال آیندہ کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ [5]

نیز ارشاد فرمایا آں حضرت ﷺ نے کہ عرفہ کا روزہ ہزار روزہ کے برابر ہے۔ [6]

اور ایک روایت میں آیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ جس نے عرفہ کا روزہ رکھا اس کے پے در پے دو سال کے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔ [7]

فائدہ: یعنی ایک سال گزشتہ کے اور ایک سال آیندہ کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں جیسا کہ ”مسلم“ کی روایت میں گزر چکا۔

---

[1] اس میں اختلاف ہے کہ یہ عشرۂ ذوالحجہ افضل ہے یا رمضان شریف کا عشرۂ اخیرہ۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ مختار یہ ہے کہ اس عشرہ کے دن افضل ہیں اور عشرۂ اخیرہ کی راتیں۔ واللّٰہ أعلم.

[2] بخاری [3] ابن ماجه والترمذي. وقال: إسناده ضعيف.

[4] بعض جگہ عوام شبِ براءت کی تیرہویں اور چودہویں کو عرفہ کہتے ہیں، وہ بالکل غلط ہے۔ [5] مسلم

[6] ترغيب عن البيهقي والطبراني بإسناد حسن. [7] ترغيب عن أبي يعلى، ورجاله رجال الصحيح.

اس عشرہ کی فضیلت میں بہت احادیث وارد ہوئی ہیں، مگر ہم نے اختصار کی وجہ سے چند حدیثیں لکھی ہیں، اور ان ہی سے معلوم ہوگیا کہ یکم سے نہم تک ہر طرح کی عبادت میں خاص کوشش کرنا چاہیے اور حتی الوسع ان ایام کو صیام و قیام یعنی روزہ اور شب بیداری میں گزارنا چاہیے۔ بالخصوص نو تاریخ کا روزہ زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔

اب آگے ایک حدیث شریف لکھی جاتی ہے جس سے دسویں رات کو جاگنے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

فرمایا آں حضرت ﷺ نے کہ جو شخص عیدین (یعنی عید الفطر و عید الاضحیٰ) کی دونوں راتوں میں طلب ثواب کے لیے بیدار رہا اس کا دل اُس دن زندہ رہے گا جس دن سب کا دل مردہ ہوگا۔[1]

علاوہ ازیں جن روایتوں میں اس عشرہ میں نیک عمل اور صیام و قیام کی فضیلت گزر چکی ہے اس سے بھی ان کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ كما لا يخفى. والله أعلم.

تکبیر تشریق: ارشاد فرمایا آں حضرت ﷺ نے کہ نہ کوئی دن اللہ کے نزدیک اس عشرہ (ذی الحجہ) سے افضل ہے اور نہ کسی دن میں عمل کرنا ان میں عمل کرنے سے افضل ہے۔ پس تم ان میں (خصوصیت سے) لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ اور اَللّٰهُ أَكْبَرُ کی کثرت رکھو، کیوں کہ یہ دن تکبیر اور تہلیل کے ہیں۔[2]

فائدہ: یوں تو اس تمام عشرہ میں تکبیر و تہلیل کی زیادتی پسندیدہ ہے جیسا کہ اس روایت سے معلوم ہوا، لیکن نو تاریخ کی فجر سے تیرہویں کی عصر تک ہر نماز کے بعد بلند آواز سے[3] ایک مرتبہ تکبیر کہنا ضروری ہے۔[4]

جیسا کہ ”آثار السنن“ میں بحوالہ ابن ابی شیبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا معمول مروی ہے۔[5]

نیز ”سنن بیہقی“ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن

---

[1] ترغيب عن ابن ماجه، وقال: رواته ثقات إلا أن بقية مدلس، وقد عنعنه. [2] الدر المنثور عن البيهقي. [3] مگر عورتیں آہستہ کہیں۔ [4] تکبیر یہ ہے: اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ. [5] ونقل عن ابن حجر: أن إسناده حسن.

عباس رضی اللہ عنہما سے یہی روایت نقل کی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم یوم عرفہ کی فجر سے آخر ایام تشریق کی عصر تک تکبیر پڑھا کرتے تھے۔[1]

نمازِ عیدالاضحیٰ کے احکام

عید اور بقرعید کی نماز شہر اور قصبہ اور اس بڑے گاؤں کے لوگوں پر واجب ہے جو قصبہ کے مشابہ ہو، جیسا کہ جمعہ۔ اور جس طرح جمعہ چھوٹے گاؤں میں جائز نہیں اسی طرح عیدین کی نماز بھی جائز نہیں، اس لیے چھوٹے گاؤں میں ہرگز نہ پڑھی جائے۔[2] اور بقرعید کے روز سنت یہ ہے کہ نمازِ عید سے پہلے کچھ کھائیں پییں نہیں۔ جو لوگ قربانی کریں ان کے لیے یہ مسنون ہے کہ نماز کے بعد بھی نہ کھاویں بلکہ قربانی کے بعد اپنی قربانی میں سے کھاویں۔[3] اور نماز سے پیشتر غسل، مسواک کرکے اپنے موجودہ کپڑوں میں سے عمدہ ترین کپڑے پہنیں اور خوش بو لگائیں اور جہاں تک ہوسکے جلدی عیدگاہ پہنچیں اور پیدل جاویں۔ اور راستہ میں بآوازِ بلند تکبیر کہتے رہیں۔ تکبیر وہی جو ایامِ تشریق کے حاشیہ میں گزری۔ یعنی اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ۔

اور نماز کے بعد بلند آواز سے تکبیر پڑھیں کہ بعض فقہا نے اس کو واجب کہا ہے۔ اور خطبہ کے وقت اسی طرح صف بستہ چپ چاپ بیٹھے رہیں، اکثر لوگ خطبہ نہیں سنتے وہ بُرا کرتے ہیں اور ترکِ سنتِ متوارثہ کے وبال میں گرفتار ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ خطبہ کے وقت بولتے ہیں سخت گناہ گار ہوتے ہیں، کیوں کہ اس وقت چپ رہنا واجب ہے۔ پھر جب واپس ہوں تو جس راستے سے گئے تھے اس راستہ سے نہ آویں، بلکہ دوسرے راستہ سے لوٹیں اور واپسی میں اگر کسی چیز پر سوار ہو جائیں تو مضایقہ نہیں۔

---

[1] وقال: إسناده لا يحتج به. وقال أيضًا بعد سرد الطرق: وفي رواية الثقات كفاية. والله أعلم.

[2] اور عید الفطر میں نماز سے قبل کوئی شیریں چیز کھانا مسنون ہے، نیز یہ کہ صدقۂ فطر نماز سے پہلے ہی ادا کرے اور راستہ میں تکبیر آہستہ کہی جاوے، باقی سب سنتیں وہی ہیں جو بقرعید میں ہیں۔

[3] اور دیہاتی لوگ اگر صبح ہی قربانی کرکے شہر میں عید پڑھنے آویں تو وہ نماز سے پیشتر ہی قربانی میں سے کھالیں۔

تنبیہ اوّل: بعض جگہ دستور ہے کہ جب عیدگاہ میں مرد نماز کو جاتے ہیں تو عورتیں جمع ہوکر اپنے گھروں میں نفل نماز پڑھتی ہیں، پھر بعض جگہ تو جماعت کرتی ہیں اور بعض جگہ تنہا پڑھتی ہیں۔ حالاں کہ دونوں طرح کراہت سے خالی نہیں۔ کیوں کہ نمازِ عید سے قبل نفل پڑھنا مکروہ ہے، اور جماعت ہونے سے زیادہ کراہت ہوجاتی ہے کیوں کہ عورتوں کی جماعت بھی مکروہ ہے اور اہتمام سے نفل کی جماعت بھی مکروہ ہے۔ غرض جماعت میں تین مکروہات جمع ہوجاتے ہیں۔ ونیز ایک گناہ بے پردگی کا ہوتا ہے کیوں کہ یہ گمان کرتی ہیں کہ سب مرد چلے گئے اس لیے بے فکر نکلتی ہیں حالاں کہ بعض آدمی راستے میں مل جاتے ہیں اس لیے اس سے نہایت اہتمام کے ساتھ بچنا لازم ہے اور اگر کوئی نفل پڑھنا چاہے تو نماز عید کے بعد اپنے گھر میں تنہا ہی چار نفل چاشت کی نیت سے پڑھ لے تو ثواب ہے۔

تنبیہ دوم: عیدین کی نماز عیدگاہ میں پڑھنا مسنون ہے۔ اس واسطے اگر امامِ عیدگاہ دین دار ہو تو عیدگاہ میں جانا چاہیے، البتہ اگر بیماری ہے یا بڑھاپے کے سبب مسجد میں شریک ہوجاوے تو مضایقہ نہیں اور مسجدوں میں عیدین کی نماز معذور لوگوں ہی کے واسطے جاری ہوئی ہے۔ لیکن جب امامِ عیدگاہ ایسا ہو جس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہو تو پھر دین دار امام کے پیچھے مسجد میں پڑھ لیں۔ غرض بلاوجہ مسجدوں میں نماز عید نہ پڑھی جاوے۔

تنبیہ سوم: عید کی نماز کے بعد تو دعا مانگنے کی گنجایش ہے، لیکن خطبہ کے بعد دعا مانگنا محض بے دلیل ہے۔ اس واسطے خطبہ کے بعد دعا نہ مانگی جاوے۔

تنبیہ چہارم: نماز عیدین کے لیے اذان اور اقامت نہیں ہے اور یہ جو دستور ہے کہ الصلاۃ الصلاۃ! پکارتے ہیں، یہ بدعت ہے اس کو ترک کرنا چاہیے۔

تنبیہ پنجم: عیدالفطر کی نماز میں تاخیر بہتر ہے اور عیدالاضحیٰ میں تعجیل۔ اور معیار اس کا یہ ہے کہ شروع وقت سے اخیر تک یعنی اشراق سے نصف النہار تک کا حساب لگایا جاوے جتنا وقت ہوتا ہو اس کا آدھا کریں، آدھے سے پیشتر پڑھنا تعجیل ہے اور آدھے کے بعد پڑھنا تاخیر۔ اس

حساب سے بقر عید کی نماز چھوٹے دنوں میں طلوع آفتاب کے بعد اڑھائی گھنٹہ کے اندر اندر ہونا چاہیے۔ اور بڑے دنوں میں اس سے کچھ دیر بعد اور عید الفطر کا مستحب وقت چھوٹے دنوں میں طلوع سے اڑھائی گھنٹہ بعد شروع ہوجاتا ہے اور بڑے دنوں میں ساڑھے تین گھنٹے بعد۔

تنبیہ ششم: خطبہ صرف عربی میں پڑھا جاوے، اردو، فارسی وغیرہ کوئی زبان شامل نہ کی جاوے، اور اگر ضروری مسائل سنانا مقصود ہو تو خطبہ ختم کر کے ممبر سے اتر کر سناویں، بلکہ مجمع کی ہیئت بھی بدل دی جاوے اور اس کا بھی التزام نہ کیا جاوے، بلکہ کبھی سناویں کبھی نہیں۔

نمازِ عیدین کا طریقہ: امام یوں نیت کرے کہ میں دو رکعت واجب نماز عید[1] چھ زائد تکبیروں سمیت پڑھتا ہوں، منہ طرف کعبہ شریف کے۔ اور مقتدی اس کے ساتھ یہ نیت بھی کریں: پیچھے اس امام کے۔ یہ نیت کر کے اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ کر ہاتھ باندھ لیں اور پھر سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ پڑھیں۔ اس کے بعد تین تکبیریں اس طرح کہی جاویں کہ دو تکبیروں میں تو کانوں تک ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر چھوڑتے رہیں اور تیسری تکبیر میں بھی ہاتھ اُٹھاویں مگر چھوڑیں نہیں بلکہ باندھ لیں۔ بعد ازاں امام اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اور بِسْمِ اللّٰہِ آہستہ پڑھ کر بلند آواز سے قراءت یعنی الحمد اور سورت پڑھے۔ اور بہتر یہ ہے کہ سورۂ اعلیٰ و غاشیہ پڑھی جاویں، مگر اس پر ہمیشہ پابندی نہ کی جاوے اور مقتدی حسبِ معمول خاموش رہیں اور دوسری نمازوں کی طرح رکوع سجدہ وغیرہ کر کے دوسری رکعت میں اوّل امام بلند آواز سے قراءت پڑھے اس کے بعد تکبیریں کہی جائیں اور تینوں تکبیروں میں ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر چھوڑتے جائیں۔ پھر بغیر ہاتھ اٹھائے چوتھی تکبیر رکوع کے واسطے کہہ کر رکوع میں جاویں اور دوسری نمازوں کی طرح سجدوں کے بعد التحیات وغیرہ پڑھ کر سلام پھیر دیں۔ اور امام کو چاہیے کہ تکبیروں کے درمیان اتنا وقفہ کرلے کہ مقتدیوں کے فارغ ہونے کا گمان ہوجاوے اور جو شخص بعد میں آکر شامل ہو اس کی چند صورتیں ہیں، سب کو الگ الگ لکھا جاتا ہے۔

پہلی صورت: اگر کوئی شخص تکبیروں سے پہلے ہی آگیا تب تو نیت باندھ کر شامل ہوجائے، اور

---

[1] اگر عیدین میں عید الفطر اور بقر عید میں عید الضحیٰ کا لفظ کہہ لیں تو بہتر ہے، نیز امام کو امامت کی نیت بھی کرلینا چاہیے۔

اگر ایسے وقت پہنچا کہ تکبیریں ہو رہی ہیں تو جتنی تکبیریں مل جاویں اتنی ساتھ کہہ لے اور باقی ماندہ بعد میں اسی وقت کہہ لے، اور کُل تکبیریں ہو چکی ہوں تو نیت باندھتے ہی فوراً تینوں تکبیریں کہہ لے خواہ قراءت شروع ہو چکی ہو، اور ہاتھ اٹھانے اور باندھنے کا وہی طریقہ ہے جو اوپر گزر چکا۔

دوسری صورت: اگر کوئی شخص ایسے وقت آیا کہ امام رکوع میں جا چکا ہے تو اگر غالب گمان ہو کہ تکبیریں کہنے کے بعد رکوع مل جاوے گا تب تو طریقۂ مذکورہ کے موافق تکبیریں کہنے کے بعد رکوع کی تکبیر کہہ کر رکوع میں جاوے، اور اگر یہ اندیشہ ہو کہ رکوع نہ ملے گا تو رکوع میں شریک ہو جاوے اور رکوع ہی میں تسبیح کی جگہ بغیر ہاتھ اٹھائے تکبیریں کہہ لے، اور اگر ایک یا دو تکبیر کے بعد امام رکوع سے اٹھ جاوے تو یہ بھی ساتھ اٹھ جاوے، باقی تکبیر معاف ہے۔

تیسری صورت: جو شخص دوسری رکعت میں اس وقت آیا ہو جب امام رکوع میں جا چکا ہے تو اس کا بھی وہی حکم ہے جو پہلی رکعت کے رکوع کا ابھی لکھا گیا ہے، اور پہلی رکعت جو رہ گئی ہے جب امام کے سلام پھیر دینے پر اس کو پڑھے تو اوّل قراءت پڑھنا چاہیے، اس کے بعد تین تکبیریں زائد ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر کہنے کے بعد چوتھی تکبیر رکوع کے لیے بغیر ہاتھ اٹھائے کہتا ہوا رکوع میں جائے جیسا کہ دوسری رکعت میں حکم ہے۔

چوتھی صورت: اگر دوسری رکعت کے رکوع کے بعد کسی وقت آ کر ملے تو پھر دونوں رکعت اس طریقہ سے پڑھے جو شروع میں لکھا گیا ہے۔

چند ضروری مسائل

۱۔ اگر امام نے پہلی رکعت کی تکبیر بھول سے چھوڑ کر قراءت شروع کر دی ہو تو یہ حکم ہے کہ اگر الحمد پڑھتے پڑھتے یاد آ جائے تب تو تکبیریں کہہ کر دوبارہ[1] الحمد شریف پڑھی جائے اور اگر سورت شروع کر دی ہے تو پھر سورت پوری کرنے کے بعد دوسری رکعت کی طرح

[1] اگر الحمد پوری پڑھ لی تھی یا اکثر حصہ پڑھ لیا تھا تو اعادہ کرنے سے سجدۂ سہو واجب ہوگا مگر امام سجدۂ سہو نہ کرے جیسا کہ آگے آتا ہے اور مسبوق کرے۔

تین تکبیریں زائد اور چوتھی تکبیر رکوع کے لیے کہہ کر رکوع میں چلے جاویں، قراءت کا اعادہ نہ کیا جائے۔ اور اگر رکوع میں یاد آوے تو تکبیروں کے لیے رکوع سے اُٹھنا جائز نہیں بلکہ رکوع ہی میں آہستہ آہستہ کہہ لے۔[۱] اور مقتدیوں میں سے بھی جس کو یاد آئے اپنی اپنی تکبیریں کہہ لیں خواہ ان کو امام کے تکبیر کہنے کا پتہ لگا ہو یا نہ ہو۔ اور اگر کسی نے رکوع سے اٹھ کر تکبیریں کہنے کے بعد رکوع کیا تو نماز ہوگئی مگر بُرا کیا، اور یہی تفصیل اس مسبوق کے لیے ہے جس کی دونوں رکعت رہ گئی ہوں۔

۲۔ اسی طرح اگر دوسری رکعت میں امام تکبیریں بھول کر رکوع میں چلا جائے تب بھی تکبیروں کے واسطے رکوع سے واپس نہ ہو بلکہ رکوع ہی میں آہستہ آہستہ تکبیریں پڑھ لے، اور مقتدی بھی جیسا کہ ابھی (نمبر ا) میں گزرا، اور یہی حکم مسبوق کے بھول جانے کا ہے۔

۳۔ نمازِ عیدین میں اگر بھول سے تکبیر رہ جاویں یا اور کوئی بات سجدۂ سہو کی مُوجب ہوجائے تو امام کو چاہیے کہ سجدۂ سہو نہ کرے، کیوں کہ زیادہ مجمع کی وجہ سے لوگوں کو غلطی ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ البتہ اگر مجمع کم ہو اور غلطی کا اندیشہ نہ ہو تو سجدۂ سہو کرلے۔ اگر مسبوق سے اس کی رہی ہوئی نماز میں کوئی بات سجدۂ سہو کی موجب سرزد ہو تو اس کو سجدۂ سہو واجب ہے۔

۴۔ اگر نماز پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ کسی وجہ سے نماز بالکل نہیں ہوئی تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر مجمع متفرق ہونے سے پیشتر ہی پتہ لگ گیا تب تو دوبارہ نماز پڑھنی ضروری ہے، اور اگر مجمع متفرق ہونے کے بعد خبر ہوئی تو دوبارہ نماز میں مختلف روایات ہیں، مگر آسانی اس روایت کو لینے میں ہے کہ اب جماعت کا دہرانا ضروری نہیں بلکہ صرف امام نماز لوٹا لے۔[۲] ہاں اگر احتیاطاً اعلان کرکے دوبارہ پڑھ لی جائے تو بہتر ہے۔ اگر اس روز موقع نہ ملے تو عید الفطر میں دوسرے روز بھی لوٹا سکتے ہیں اور عید الاضحیٰ میں تیسرے روز بھی۔

یہ سب تفصیل امام کی نماز فاسد ہونے میں ہے اور اگر مقتدی یا مسبوق کی نماز فاسد ہو جائے تو کسی حال میں قضا نہیں ہے۔

---

[۱] کیوں کہ بلند آواز سے کہنے میں جماعت گڑبڑ کرے گی۔

[۲] وهو حكم الاستحسان. كما في الشامي عن البدائع.

۵۔ اگر کوئی شخص عیدگاہ میں ایسے وقت پہنچا کہ نماز ختم ہوچکی ہے تو یہ تنہا نماز عید نہیں پڑھ سکتا، بلکہ اگر دوسری جگہ نماز ہوتی ہو وہاں چلا جائے ورنہ چار رکعت چاشت کی نیت سے پڑھ لے، اور اگر چند آدمی رہ گئے ہوں[1] تو جائز ہے کسی دوسری جگہ جماعت کر کے نماز عیدین پڑھ لیں۔

قربانی کی تاکید وفضیلت: یہ تاکید وفضیلت کا مضمون ''حیات المسلمین'' سے کسی قدر تغیر واختصار کے ساتھ لیا گیا ہے جو شخص پورا مضمون دیکھنا چاہے وہ اصل کتاب ضرور دیکھ لے۔ بلکہ وہ پوری کتاب حرزِ جان بنانے کے قابل ہے بالخصوص دیباچہ کہ روح الارواح ہے۔ اور تاکید تو اسی کے لیے ہے جس پر واجب ہو لیکن جس پر واجب نہ ہو اگر وہ بھی کر دے یا کوئی شخص اپنے بچوں کی طرف سے بھی کر دے تو اس کو بھی بہت ثواب ملتا ہے۔ اور اگر کسی میت کی طرف سے کرے تو اس میت کو بھی بہت ثواب ملتا ہے۔ اب اس کے متعلق آیتیں اور حدیثیں لکھی جاتی ہیں۔

آیاتِ مبارکہ: ا۔ آیت ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَ انْحَرْ ۝﴾[2] یعنی آں حضرت ﷺ کو خطاب ہے کہ نماز پڑھیے اور قربانی کیجیے۔

فائدہ: اور یہ حکم امت کو بھی شامل ہے، کیوں کہ آں حضرت ﷺ کے لیے خاص ہونے کی دلیل کوئی نہیں بلکہ عام ہونے کی دلیل موجود ہے۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص قربانی کی گنجائش رکھتا ہو اور قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عیدگاہ میں نہ آوے۔[3] اس حدیث شریف سے کس قدر ناراضی معلوم ہوتی ہے، ان سے جو کہ باوجود واجب ہونے کے ترک کرتے ہیں، کیا اس کو وہ لوگ سن کر بھی بیدار نہ ہوں گے؟

۲۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ ہم نے ہر اُمت کے لیے قربانی کرنا اس غرض سے مقرر کیا تھا کہ وہ ان مخصوص چوپایوں پر (یعنی گائے، اونٹ، بکری، بھیڑ سب کے نر مادہ پر) اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو عطا فرمائے تھے۔

فائدہ (۱): اس آیت سے معلوم ہوا کہ قربانی بڑی مہتم بالشان عبادت ہے، جو کہ سب امتوں

---

[1] یعنی کم از کم چار آدمی ہوں۔ [2] الکوثر: ۲ [3] حاکم

کے لیے مشروع رہی ہے۔

فائدہ (۲): ﴿بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ﴾[1] جو اس آیت میں آیا ہے اردو میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو اس کا ترجمہ ہوسکے، اس لیے جن جن چوپایوں پر یہ لفظ بولا جاتا ہے ان سب کا نام لکھ دیا، اور گائے کے حکم میں بھینس بھی ہے، اور دنبہ بھیڑ کی قسم ہے۔ پس قربانی بارہ چیزوں کی جائز ہے: گائے، بیل، بھینس، بھینسا، اونٹ، اونٹنی، بکرا، بکری، بھیڑ، مینڈھا، دنبہ، دنبی۔ ان کے سوا اور کسی کی قربانی جائز نہیں ہے۔

۳۔ اور قربانی کے اونٹ اور گائے کو ہم نے اللہ (کے دین) کی یادگار بنایا ہے (کہ ان کی قربانی سے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور دین کی رفعت ظاہر ہوتی ہے)۔ اور اس حکمت کے علاوہ ان جانوروں میں تمھارے اور بھی فائدے ہیں۔ (مثلاً: دنیوی فائدہ کھانا اور کھلانا، اور اُخروی فائدہ ثواب۔)

فائدہ (۱): اگرچہ بکری، بھیڑ بھی قربانی کے جانور ہیں اور اس لیے وہ بھی دین کی یادگار ہیں۔ مگر آیت میں خاص اونٹ اور گائے کا ذکر فرمانا اس لیے ہے کہ ان کی قربانی بھیڑ بکری کی قربانی سے افضل ہے اور حدیث شریف میں جو آیا ہے کہ سب سے عمدہ قربانی سینگ والا مینڈھا ہے۔ سو اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی جنس میں مینڈھا سب سے افضل ہے (یعنی بکری وغیرہ سے) اور دنبہ بھی مینڈھے کے حکم میں ہے اور اگر پوری گائے یا اونٹ نہ ہو بلکہ اس کا ساتواں حصہ قربانی میں لے لے تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر ساتواں حصہ اور پوری بکری یا بھیڑ قیمت اور گوشت کی مقدار میں برابر ہوں تو جس کا گوشت عمدہ ہو وہی افضل ہے، اور اگر قیمت اور گوشت میں برابر نہ ہوں تو جو زیادہ ہو وہ افضل ہے۔[2]

فائدہ (۲): اس سے معلوم ہوا کہ گائے کی قربانی خاص درجہ رکھتی ہے اور بعض جاہل جو کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے گائے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے سو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کا گوشت شرعاً ناپسند ہے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اہلِ عرب کو بوجہ خشک ملک ہونے کے موافق نہیں۔

---

[1] الحج: ۳٤ [2] شامی از تاتارخانیہ

۴۔ اللہ تعالیٰ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون، لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ (اور اخلاص) پہنچتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان چوپایوں کو تمہارا زیر حکم کردیا تا کہ تم اس بات پر اللہ کی برتری بیان کرو کہ اس نے تم کو یہ توفیق دی اور (اے پیغمبر ﷺ!) اخلاص والوں کو خوش خبری سنا دیجیے۔[۱]

فائدہ: اخلاص کے یہ معنی ہیں کہ خاص حق تعالیٰ جل شانہ کو خوش کرنے اور اس سے ثواب حاصل کرنے کی نیت ہو، کوئی دنیا کی غرض شامل نہ ہو۔

احادیث: ۱۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قربانی کے دن میں آدمی کا کوئی عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک قربانی کرنے سے زیادہ پیارا نہیں، اور قربانی کا جانور قیامت کے دن مع اپنے سینگوں اور اپنے بالوں اور کھروں کے حاضر ہوگا (یعنی ان سب چیزوں کے بدلے ثواب ملے گا) اور (قربانی کا) خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک خاص درجہ میں پہنچ جاتا ہے۔ سو تم لوگ جی خوش کر کے قربانی کیا کرو۔ (زیادہ داموں کے خرچ ہو جانے پر اپنا جی بُرا مت کیا کرو۔)[۲]

۲۔ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یارسول اللہ (ﷺ)! یہ قربانی کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارے (نسبی یا روحانی)[۳] باپ ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ ہے۔ انھوں نے عرض کیا کہ ہم کو اس میں کیا ملتا ہے یا رسول اللہ ﷺ؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہر بال کے بدلے ایک نیکی۔ انھوں نے عرض کیا کہ اگر اُون (والا جانور یعنی بھیڑ، دنبہ) ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر اُون کے بدلہ میں بھی ایک نیکی۔[۴]

فائدہ: کتنی بڑی رحمت ہے کہ بکری وغیرہ کی قربانی کرنے سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے پیروکار شمار کیے گئے جنھوں نے اپنے اس پیارے پہلوٹے بچے کو قربان کیا تھا جو بڑھاپے میں بڑی تمناؤں کے بعد نصیب ہوا تھا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا فضیلت ہوگی۔

۳۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے فاطمہ (رضی اللہ عنہا)!

۱۔ سورۂ حج ۲۔ ابن ماجہ و ترمذی و حاکم

۳۔ یعنی بعض کے صرف روحانی باپ ہیں اور بعض کے نسبی بھی۔ ۴۔ حاکم. ورواه أحمد وابن ماجه أيضاً.

اُٹھ اور (ذبح کے وقت) اپنی قربانی کے پاس موجود رہ، کیوں کہ پہلا قطرہ جو قربانی کا زمین پر گرتا ہے اس کے ساتھ ہی تیرے لیے تمام گناہوں کی مغفرت ہو جائے گی (اور) یاد رکھ کہ (قیامت کے دن) اس (قربانی) کا خون اور گوشت لایا جائے گا اور تیرے میزان (عمل) میں ستر حصے بڑھا کر رکھ دیا جاوے گا (ان سب کے بدلے نیکیاں دی جائیں گی)۔ ابوسعید رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! یہ (ثواب مذکور) کیا خاص آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے کیوں کہ وہ اس کے لائق بھی ہیں کہ کسی چیز کے ساتھ خاص کیے جائیں یا آل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور سب مسلمانوں کے لیے عام طور پر ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے (ایک طرح سے) خاص بھی ہے اور سب مسلمانوں کے لیے عام طور پر بھی ہے۔[1]

فائدہ: ایک طرح سے خاص ہونے کا مطلب ویسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسا قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے لیے فرمایا ہے کہ نیک کام کا ثواب بھی اوروں سے دوگنا ہے اور گناہ کا عذاب بھی دوگنا ہے۔ سو قرآن مجید سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیوں کے لیے اور اس حدیث سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کے لیے بھی یہ قانون ثابت ہوتا ہے اور اس بنا پر زیادہ بزرگی ہے۔

۴۔ حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اس طرح قربانی کرے کہ اس کا دل خوش ہو کر (اور) اپنی قربانی میں ثواب کی نیت رکھتا ہو، وہ قربانی اس شخص کے لیے دوزخ سے آڑ ہو جائے گی۔[2]

۵۔ حنش سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ دو دنبے قربانی کے لیے لائے اور فرمایا: ان میں ایک میری طرف سے ہے اور دوسرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے۔ میں نے ان سے (اس کے متعلق) گفتگو کی۔ انھوں نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو حکم دیا ہے میں اس کو کبھی نہ چھوڑوں گا۔[3]

فائدہ: حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم پر بڑا حق ہے، اگر ہم ہر سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی ایک حصہ دیا کریں تو کوئی بڑی بات نہیں۔

---

[1] اصبہانی [2] طبرانی کبیر [3] ابوداؤد و ترمذی

۶۔ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک دنبہ کی اپنی طرف سے قربانی فرمائی اور) دوسرے دنبہ کے ذبح میں فرمایا کہ یہ (قربانی) اس کی طرف سے ہے جو میری امت میں سے مجھ پر ایمان لایا اور جس نے میری تصدیق کی۔[۱]

مطلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت کو ثواب میں شامل کرنا تھا، نہ یہ کہ قربانی سب کی طرف سے اس طرح ہوگئی اب کسی کے ذمہ قربانی نہیں رہی۔

فائدہ: غور کرنے کی بات ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی میں امت کو یاد رکھا تو افسوس ہے کہ اُمتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد نہ رکھیں اور ایک حصّہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نہ کر دیا کریں۔

۷۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی قربانیوں کو خوب قوی کیا کرو۔ (یعنی کھلا پلا کر) کیوں کہ وہ پلِ صراط پر تمھاری سواریاں ہوں گی۔[۲]

فائدہ: علُما نے سواریاں ہونے کے دو مطلب بیان کیے ہیں، ایک یہ کہ قربانی کے جانور خود سواریاں ہو جاویں گی، اور اگر کئی جانور قربانی کے کیے ہوں یا تو سب کے بدلے میں ایک بہت اچھی سواری مل جاوے گی اور یا ایک ایک منزل میں ایک ایک قربانی پر سواری کریں گے۔[۳]

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ قربانیوں کی برکت سے پلِ صراط پر چلنا ایسا آسان ہو جائے گا جیسے گویا خود ان پر سوار ہو کر پار ہو گئے۔

اور ''کنز العمال'' میں ایک حدیث اس مضمون کی یہ ہے کہ:

۸۔ سب سے افضل قربانی وہ ہے جو اعلیٰ درجہ کی ہو اور خوب موٹی ہو۔[۴]

۹۔ اور ایک حدیث یہ ہے: اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ پیاری قربانی وہ ہے جو اعلیٰ درجہ کی ہو اور خوب موٹی ہو۔[۵]

تاکید وفضیلت کے بعد مناسب ہوا کہ کچھ ضروری احکام بھی مختصر طور پر لکھ دیے جاویں۔

---

[۱] موصلی وکبیر واوسط [۲] كنز العمال، فر عن أبي هريرة رضي الله عنه.

[۳] یعنی سب قربانیوں پر یکے بعد دیگرے سوار کیا جاوے گا، اور ظاہر ہے کہ سواریاں بدلنے پر راستہ جلدی طے ہوتا ہے، پس جتنی زیادہ قربانی کی جاوے اتنی ہی جلدی پل صراط پار ہو۔ [۴] حم، ك، عن رجل.

[۵] هق عن رجل، والضعف غير مضر في الفضائل، لا سيما بعد إخباره بتعدد الطرق.

لہٰذا ''اصلاح انقلاب'' سے مختصراً اور ''خطبات الاحکام'' سے کسی قدر اضافہ وتغیر کے ساتھ چند احکام لکھے جاتے ہیں۔

احکامِ قربانی

۱۔ ہر عاقل بالغ مرد وعورت مسلمان مقیم جس کے پاس بقدر نصاب[۱] چاندی یا روزمرہ کی حاجت ضروریہ سے زائد یا اتنی ہی مالیت کا اسباب ہو، اس پر واجب ہے کہ اپنی طرف سے قربانی کرے۔

۲۔ اونٹ، بکرا، دنبہ، گائے، بھینس، نر ہو یا مادہ سب کی قربانی درست ہے۔ گائے، بھینس دو برس سے کم، بکری ایک برس سے کم کی نہ ہو، اور دنبہ چھ مہینے کا بھی درست ہے جب کہ خوب فربہ ہو اور سال بھر کا معلوم ہوتا ہو۔[۲] اور اونٹ، گائے، بھینس میں سات آدمی تک شریک ہوسکتے ہیں، مگر کسی کا حصّہ ساتویں حصّے سے کم نہ ہو۔

۳۔ جانور قربانی کا بے عیب ہو، لنگڑا، اندھا، کانا اور بہت لاغر اور کوئی عضو تہائی سے زائد کٹا ہوا نہ ہو۔ خصی (یعنی بدھیا) کی اور جس کے سینگ نکلے ہی نہ ہوں، قربانی درست ہے۔ اور پوپلی جس کے دانت نہ رہے ہوں اور بوچی جس کے پیدائشی کان نہ ہوں، جائز نہیں۔ اور اگر بکری وغیرہ کا ایک تھن خشک ہوگیا یا بھینس وغیرہ کے دو تھن خشک ہوگئے ہیں اس کی قربانی بھی درست نہیں۔ دسویں تاریخ عید کی نماز کے بعد سے بارہویں کے غروب سے پہلے پہلے تین دن دو رات تک قربانی کا وقت رہتا ہے، مگر دسویں افضل ہے، پھر گیارہویں کا درجہ ہے،

[۱] قربانی اور صدقۂ فطر واجب ہونے کے لیے غیر ضروری سامان کا تجارتی ہونا شرط نہیں، و نیز نصاب پر سال گزرنا بھی شرط نہیں ہے، حتیٰ کہ اگر قربانی کے بالکل اخیر وقت میں کوئی نصاب کا مالک ہوجاوے تب بھی قربانی واجب ہوجاتی ہے۔ اور اسی طرح کوئی شخص مسافر تھا یا نابالغ یا مجنوں تھا یا کافر تھا اور اخیر وقت میں مسلمان، مقیم، عاقل، بالغ ہوگیا تھا تب بھی قربانی واجب ہوجاتی ہے۔ بلکہ اگر کوئی ایسا شخص قربانی کرچکا ہو جس کے ذمہ واجب نہ تھی اور پھر وجوب کی شرطیں وقت قربانی کے اندر اندر پوری ہوگئیں تو اس کو دوبارہ قربانی کرنی پڑے گی۔

[۲] اور بھیڑ میں اختلاف ہے کہ بکری کے حکم میں ہے یا دنبہ کے، بھیڑ ایک سال سے کم کی نہ کرے۔

پھر بارہویں کا اور رات کو ذبح کرنا مکروہ تنزیہی ہے اور اگر دس تاریخ کو کسی وجہ سے نماز نہ ہوئی ہو، مثلاً: بارش تھی، تو زوال کے وقت قربانی کا وقت شروع ہوتا ہے اور اگر نمازِ عید چند جگہ ہوتی ہو تو ایک جگہ ہونے کے بعد قربانی جائز ہے اور دیہات کے باشندوں کو جائز ہے کہ نمازِ عید[1] سے پہلے ذبح کرلیں، بعد اس کے نماز کے لیے جائیں۔

۴۔ اگر قربانی شرکت میں کریں تو محض اندازے سے گوشت تقسیم کرنا جائز نہیں، تول کر پورا پورا بانٹیں کسی طرف ذرا بھی کمی بیشی نہ ہو۔ ہاں جس حصّہ میں کلے پائے بھی ہوں اس میں کمی چاہے جتنی ہو، جائز ہے۔ البتہ اگر مشترک ہی خرچ کرنا یا کسی کو دینا چاہیں تو تقسیم کی حاجت نہیں۔

۵۔ بہتر ہے کہ کم از کم ایک تہائی گوشت خیرات کردے اور ایک تہائی اَعِزّا واَحباب کو دے دے۔

۶۔ قربانی کی کوئی چیز قصاب کو اُجرت میں دینا جائز نہیں۔

۷۔ قربانی پر جُھول ڈالنا مستحب ہے اور پھر اس کی رسی جھول سب تَصدُّق کردینا افضل ہے۔

۸۔ قربانی کی کھال کو اپنے کام میں لانا جائز ہے۔ مثلاً: مصلّٰی وغیرہ بنوالے۔ لیکن کھال کا بیچنا اپنے خرچ میں لانے کے لیے درست نہیں۔ ہاں اگر قیمت خیرات کرنے کے لیے بیچے تو خیر، مگر اولیٰ یہ ہے کہ کھال ہی کسی کو دے دی جاوے۔

۹۔ قربانی کے ذبح کے وقت دعا[2] پڑھنا ایسی ضروری نہیں کہ بدوں اس کے قربانی ہی نہ ہو۔ بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ أَکْبَرُ کہہ کر ذبح کرلے۔[3]

---

[1] دیہات والوں کے واسطے دسویں تاریخ کی صبحِ صادق سے وقت شروع ہوجاتا ہے مگر بہتر یہ ہے کہ سورج نکلنے سے پیشتر نہ کریں۔ [2] اور مستحب ہے کہ ذبح سے پہلے یہ آیتیں پڑھے: ﴿اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ﴾، ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ (الأنعام: ۱۶۲،۱۶۳)، اور بِسْمِ اللّٰہِ واللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ کر ذبح کرے۔ پھر بعد ذبح یہ کہے: اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ، اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنِّيْ. اور کئی شریک ہوں تو مِنّا کہے اور جو کسی اور طرف سے ہو تو مِنْ کے بعد اس کا نام لے جس کی طرف سے قربانی کی جاوے۔ [3] بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہنا ذبح کے وقت ضروری ہے، چاہے قربانی ذبح کی جاوے یا ویسے ہی کھانے کے واسطے ذبح کیا جاوے۔

۱۰۔ اکثر لوگ قربانی کی کھال امام یا مؤذن وغیرہ کو دے دیتے ہیں یہ جائز نہیں، کیوں کہ اس کو ان کی خدمتِ مسجد کا صلہ سمجھا جاتا ہے اور کسی خدمت کے معاوضہ میں چرمِ قربانی وغیرہ دینا جائز نہیں۔

البتہ اگر کسی امام وغیرہ سے صاف کہہ دیا جاوے کہ قربانی کی کھال بالکل نہ ملے گی اور پھر کوئی شخص بطور ہدیہ یا صدقہ کھال بجنسہٖ دے دے تو کچھ حرج نہیں خواہ وہ امام مصرفِ زکوٰۃ ہو یا نہ ہو، کیوں کہ بعینہٖ کھال دینے میں مصرفِ زکوٰۃ ہونا شرط نہیں ہے بلکہ جس طرح گوشت خود کھاتے ہیں اور امیر غریب اور سیّد وغیرہ سب کو دیتے ہیں یہی کھال کا حکم ہے۔ گوشت اور کھال میں صرف یہی شرط ہے کسی کو بطورِ حق الخدمت نہ دیا جائے، اور کھال کے اگر دام دینا ہوں تو جس کو دے اس کا مصرفِ زکوٰۃ ہونا بھی شرط ہے۔ یعنی صاحبِ نصاب[1] اور بنی ہاشم[2] کو دینا جائز نہیں۔ خوب سمجھ لو۔

۱۱۔ ایک عام رسم یہ ہوگئی ہے کہ قربانی کے بعض حصص کو بعض لوگوں کا حق سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً: سری کو سقّے کا۔ اور اگر وہ چیز ان کو نہ دی جاوے تو جھگڑا ہوجاتا ہے۔ یہ حق سمجھنا اور ایسے موقع پر دینا بالکل ناجائز ہے، جس کسی کو کچھ دیا جائے محض تبرعاً دیا جائے۔ جیسا کہ (نمبر۱۰) سے معلوم ہوچکا۔

۱۲۔ بعض لوگ گابھن گائے، بکری وغیرہ کی قربانی کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ یہ تو غلط ہے قربانی میں کوئی فرق نہیں آتا[3] لیکن اگر پہلے سے معلوم ہوجائے تو بہتر یہی ہے کہ اس کی قربانی نہ کرے، بلکہ اس کے بدلے میں دوسری کردی جائے۔ لیکن اگر دوسری کم قیمت ہو تو جو دام باقی رہیں وہ خیرات کردیے جائیں۔

۱۳۔ اگر کسی میت نے قربانی کی وصیت کی تھی تو اس قربانی کا گوشت خیرات کردینا

---

[1] جس قسم کا نصاب ہونے سے قربانی اور صدقۂ فطر واجب ہوتا ہے اس قسم کے نصاب کا جو مالک ہو وہ زکوٰۃ، فطرہ، قیمتِ چرمِ قربانی وغیرہ صدقاتِ واجبہ کا مصرف نہیں ہے۔ [2] بنی ہاشم سے مراد بنی فاطمہ اور علوی اور عباسی اور حضرت جعفرو عقیل رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اولاد اور حارث کی اولاد ہے ان میں سے کسی کو زکوٰۃ وغیرہ دینا درست نہیں۔

[3] اگر بچہ میں جان ہو تو اس کو بھی ذبح کردیا جائے۔

واجب ہے اور اگر بغیر وصیّت کے کسی نے ایصالِ ثواب کے لیے میت کی طرف سے قربانی کی ہوتو اس میں اپنی قربانی کی طرح اختیار ہے۔

۱۴۔ بعض جگہ قربانی کی یا ویسے ہی کسی جانور کی کھال ذبح سے پہلے ہی فروخت کردیتے ہیں، یہ بالکل حرام ہے۔

۱۵۔ اکثر جاہل یوں سمجھتے ہیں کہ اگر خاوند غریب یا قرض دار ہوتو بیوی کے ذمہ بھی قربانی نہیں، یہ بالکل غلط ہے۔ جب بیوی صاحبِ نصاب ہو جیسا کہ اکثر مقدارِ نصاب زیوران کی مِلک ہوتا ہے، تو اس پر مستقل قربانی وغیرہ واجب ہوجاتی ہے۔

۱۶۔ قربانی کرنے والے کے واسطے مستحب یہ ہے کہ ذی الحجہ کے عشرہ میں بال اور ناخن نہ بنوائے بلکہ قربانی کے بعد بنوائے۔ فقط والسلام

باقی مسائل ''بہشتی زیور'' وغیرہ میں دیکھ لیں ونیز ''اصلاح الرسوم'' بھی قابلِ دید ہے۔

وَاللّٰهُ وَلِيُّ التَّوْفِيْقِ

احقر
عبدالکریم عفی عنہ
خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
مؤرخہ ۳ شوال ۱۳۵۱ ہجری

وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰی لَهَا سَعْیَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ
فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْیُهُمْ مَّشْكُوْرًا

السّعي المشكُور

في أحكام العَاشُور

معروف به

تُحفہ حنفیہ

از

حضرت مولانا سید مفتی عبدالشکور صاحب مدظلہ
مہتمم مدرسہ حقانیہ ساہیوال۔ ضلع سرگودھا

تقریظ

از

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

برخوردار عزیز مولوی عبدالشکور صاحب سلمہ،
السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا رسالہ مفیدہ ''السعي المشکور'' پہنچا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ چار ماہ سے بیمار صاحبِ فراش ہوں، مگر آں عزیز کا رسالہ دیکھنے کو دل چاہا، ہفتہ تکیہ کے نیچے رکھا رہا، کہیں کہیں سے نظر ڈالی، دیکھ کر نفسِ مضمون پھر طرزِ تحریر و تالیف کو مفید و مستحسن پایا، دل سے دعا نکلی، حق تعالیٰ جَلَّ شَانُہٗ اس کو مسلمانوں کے لیے جاہلانہ رسوم سے نجات کا ذریعہ بنائے اور آپ کو اجرِ جزیل عطا فرمائے۔

لیٹے ہوئے یہ چند سطور لکھ رہا ہوں، منزلِ آخرت سامنے ہے اور زادِ راہ سے ہاتھ خالی ہیں۔ بجز رحمتِ حق جَلَّ شَانُہٗ کے کوئی سہارا نہیں۔ آپ سے حیًّا میتًا دعائے خیر کی توقع رکھتا ہوں۔

والسلام
بندہ محمد شفیع عفا عنہ
کراچی ۱۴
جمعرات ۲۹۔ محرم ۱۳۸۹ ہجری

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم
نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہ الکریم

مسائل محرم الحرام

بعد الحمد والصلاۃ، گزارش ہے کہ احقر ہمیشہ اپنی جمعہ کی تقریر میں اصلاحی مضامین ہر موقع کے مناسب بیان کیا کرتا ہے۔ حسبِ عادت محرم ۸۵ھ کے جمعہ میں بھی اسی طرح کا ایک مضمون بیان کیا گیا تھا۔ یہ مضمون خدا تعالیٰ کی توفیق سے کچھ ایسے طریقہ پر اس وقت بیان میں آیا کہ سامعین کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ بعض دوستوں نے اس کی افادیت کے پیش نظر اس وقت کہا کہ اگر یہ مضمون قلم بند ہو کر طبع ہو جاتا تو اس سے نفع عام کی امید ہے۔ میں نے سرسری بات سمجھ کر اس وقت اس کی طرف خاص توجہ نہیں دی۔

کئی ماہ کے بعد اتفاق سے میرے ایک مخلص دوست سرگودھا سے بغرض ملاقات تشریف لائے۔ انھوں نے سلسلۂ گفتگو میں مذکور الصدر تقریر جمعہ کا حوالہ دے کر کہا کہ میں نے وہ تقریر سنی تھی، اتفاق سے میں اس دن جمعہ کو ساہیوال گیا ہوا تھا مجھے وہ تقریر بہت پسند آئی اور مجھے افسوس رہا کہ میں اس کو قلم و کاغذ نہ ہونے کی وجہ سے قلم بند نہ کر سکا۔ موصوف نے یہ بھی اصرار فرمایا کہ اس کو اب قلم بند کر دیا جائے۔ میں نے عرض کیا کہ مدرسہ کی ضروریات میں مصروفیت کی وجہ سے فرصت نہیں ملتی اگر وقت ملا تو ایسا کر دیا جائے گا۔

چناں چہ اسی زمانہ میں ایک تحریر اس طرز پر لکھی گئی کہ اس میں اس تقریر کے بنیادی اجزا شامل ہونے کے ساتھ ساتھ "فضائل الأیام والشھور" اور حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس اللّٰہ سرہٗ کی تصنیف لطیف "إصلاح الرسوم" کو سامنے رکھ کر چند ایسے مسائل اور رسومات مروّجہ کا بیان بھی کر دیا گیا جن کا تعلق ماہِ محرم الحرام سے ہے۔ اس ضمن میں محرم الحرام کی فضیلت اور دوسرے امور متعلقہ کا تذکرہ بھی کر دیا گیا۔

محرم کے متعلق اگرچہ احکامِ شرعیہ کا بیان متفرق طور پر حضرات علمائے کرام کی کتب میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے جو سمجھ دار شخص کے لیے ہر طرح کافی اور وافی ہے۔ مگر عام لوگوں کے لیے مناسب معلوم ہوا کہ ان متفرق اور منتشر اَحکام کو اِجمالی طور پر کسی قدر یکجا کر کے بیان کردیا جائے تاکہ ایسا شخص بھی ان احکام سے فائدہ اٹھا سکے جس کو علمائے کرام کی مختلف اور متفرق کتابوں کے مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملتا مگر یہ تحریر بطورِ مسودہ کے متفرق اوراق میں پڑی رہی اور "ھدایة الحیران" وغیرہ تصنیفات میں مشغولی کی وجہ سے ادھر توجہ نہیں ہوئی۔ اب ایک عزیز نے فرمائش کی کہ وہ مسودہ صاف کر کے مجھے دے دیا جائے۔ لہٰذا اب اس پر نظرِ ثانی کر کے اس کو صاف کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے نفع کو عام وتام فرمائے اور جو اس میں کوتاہی ولغزش ہوگئی ہو اس سے درگزر فرمائے۔

إِنْ أُرِيْدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيْقِيْ إِلَّا بِاللّٰهِ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيْبُ.

ماہِ محرم کی تاریخی اہمیّت

محرم بابِ تفعیل کا تحریم سے اسمِ مفعول ہے۔ عربی میں تحریم کے دوسرے معانی کے ساتھ اس کے معنی تعظیم کرنے کے بھی آئے ہیں تو محرّم کے معنی معظّم (عظمت والا) ہوئے، چوں کہ یہ مہینہ عظمت کے قابل ہے اس لیے اس کا نام محرم ہے۔ کسی زمانہ، دن یا مہینہ میں عظمت وحرمت کا اصل سبب تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی تجلیات وانوار کا اس زمانہ میں ظاہر ہونا ہی ہے (مگر بعض عظیم الشان اور اہم واقعات کا کسی زمانہ میں انجام پذیر ہونا بھی دوسرے درجہ میں اس زمانہ کی عظمت وفضیلت کا سبب اور مُوجِب ہوجاتا ہے اور اس عظیم الشان واقعہ کے رونما ہونے کی وجہ سے بھی بواسطہ اس واقعہ کے زمانہ میں فضیلت آجاتی ہے) جس زمانہ میں انوار و تجلیات کا زیادہ ظہور ہوتا ہے۔ ان انوار وتجلیات کی وجہ سے اس زمانہ میں فضیلت حاصل ہوکر اس میں اجر وثواب بہ نسبت اور دنوں کے بڑھ جاتا ہے، ورنہ زمانہ اپنی ذات میں یکساں اور

برابر ہے، فضیلت اگر اس میں آتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی تجلیاتِ خاصہ کے نزول کی وجہ سے آتی ہے۔ جب کسی زمانہ کی فضیلت کا مدار اس میں خاص تجلیاتِ حق کے نزول پر ہے اور تجلیاتِ خاصہ کے نزول کا علم بجز وحی کے کسی کو یقینی طور پر نہیں ہوسکتا تو پھر کسی زمانہ کی فضیلت کا علم بغیر رسول اللہ ﷺ کے بتلائے ہوئے ناممکن ہے۔ لہٰذا وحی کی روشنی کے بغیر اپنی طرف سے کسی زمانہ کی فضیلت کا یقین کر لینا ناجائز ہے اور ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ﴾[1] (جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ) کے خلاف ہونے کی وجہ سے ممنوع ہوگا۔ چوں کہ اس ماہِ محرم میں حق تعالیٰ کی تجلّیاتِ رحمت اور بندوں کی طرف اس کی خصوصی توجہات کا نزول اجلال ہوتا ہے۔ اس لیے ہمیں حکم ہے کہ ہم اس ماہ میں حق تعالیٰ جَلَّ شَانُہٗ کی عظمت کا اظہار اس طریقہ پر کریں جس کی تعلیم ہم کو صاحبِ وحی رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے۔

فائدہ: قبل از اسلام زمانۂ جاہلیت میں بھی محرم الحرام ان چار مہینوں میں شمار ہوتا تھا جن کے احترام کی وجہ سے مشرکینِ عرب اپنی خانہ جنگیوں کو بند کر دیا کرتے تھے، تو اس ماہِ محرم کی حرمت و عظمت قدیم الایام سے چلی آتی ہے اور اس ماہ کو کفارِ عرب بھی محترم سمجھتے تھے۔ ابتدائے اسلام میں اسلام نے بھی اس مہینہ کے احترام کے باعث اس کے اندر قتال کے ممنوع ہونے کو باقی رکھا۔ چناں چہ آیت قرآنیہ: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ﴾[2] میں اَشْہُرِ حرم کے اندر جن میں محرم کا مہینہ بھی شامل ہے قتال کرنے کو گناہِ کبیرہ بتلایا گیا ہے، مگر باتفاق امت حرمتِ قتال کا یہ حکم عموماتِ قرآنیہ سے بعد میں منسوخ ہوگیا اور اب ان مہینوں میں قتال جائز ہے۔ اگرچہ اب بھی افضل یہی ہے کہ ان مہینوں میں قتال کی ابتدا نہ کی جائے۔[3]

لیکن اس نسخ سے اصل مسئلہ تعظیمِ محرم پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس لیے کہ حرمتِ قتال علت نہیں ہے ماہِ محرم کے احترام کی بلکہ ماہِ محرم کے احترام کا ایک خارجی اثر حرمتِ قتال بھی تھا۔ کسی اثر کے فوت ہو جانے سے مؤثر کا فوت ہونا لازم نہیں آتا۔ مثال کے طور پر اگر سنکھیا کا اثر

[1] بنی إسرائیل: ۳۶ [2] البقرۃ: ۲۱۷ [3] شامی: ۳/۳۰۲

یعنی مہلک ہونے کی قوت کسی طریقہ سے زائل کردی جائے تو بھی اس کو سنکھیا ہی کہا جائے گا، اب وہ شیرینی نہیں بن گیا۔ اسی طرح حرمتِ قتال کا حکم گو اب باقی نہیں رہا مگر احترامِ محرم اب بھی باقی ہے۔ غرضے کہ پورا ماہِ محرم شروع سے آخر تک قابلِ احترام اور لائقِ تعظیم ہے اور پورا مہینہ حق تعالیٰ کی خصوصی توجہات کا محل ہے۔ اس مہینہ میں جتنا ہو سکے عبادات میں کوشش کرنی چاہیے کہ خیر و برکت کا مہینہ خالی نہ گزر جائے۔

یومِ عاشورا

اس ماہ کو یہ بھی عزت حاصل ہے کہ اس کے اندر بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معیت میں فرعونِ مصر کے ظالم و جابر ہاتھوں سے نجات پائی تھی اور فرعون مع اپنے ساتھیوں کے دریائے نیل میں غرق کیا گیا تھا۔ اس لیے بطورِ شکریہ کے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس مہینہ کی دسویں (یوم عاشورا) میں روزہ رکھا تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس دن کا روزہ رکھنا رمضان کے بعد تمام روزوں سے افضل ہے۔[1] اور ارشاد فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ ایک عاشورا کے دن کا روزہ رکھنا تمام گزشتہ سال کے (صغائر) چھوٹے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔[2]

ابتدائے اسلام میں عاشورا کو روزہ فرض تھا۔ پھر رمضان المبارک کے روزوں کی فرضیت کے بعد عاشورا کے روزہ کی فرضیت ختم ہوگئی۔ البتہ اس کا سنت ہونا اب بھی باقی ہے۔ اس دن روزہ رکھنا اب بھی بڑا ثواب اور اجر کا باعث ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ باطن ہمیشہ اپنے ظاہر سے متأثر ہوتا ہے۔ اس لیے اسلام نے کفار کی ظاہری طرز بود و باش کے اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اس خیال کے ماتحت چوں کہ عاشورا کا روزہ رکھنا یہودیوں کی مشابہت سے خالی نہ تھا۔ ادھر اس کو چھوڑ دینا اس کی برکات سے محرومی کا باعث ہوتا، اس لیے علمائے اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ ایک دن کا روزہ اس کے ساتھ اور ملا لو۔ بہتر تو یہ ہے کہ نویں دسویں

---

[1] مسلم [2] مسلم

کا روزہ رکھو۔ اور اگر کسی وجہ سے نویں کا روزہ نہ رکھ سکے تو پھر دسویں کے ساتھ گیارہویں کا روزہ رکھ لے۔ صرف دسویں محرم کا روزہ رکھنا حسبِ تصریحاتِ فقہائے کرام کراہت سے خالی نہیں ہے۔

دسویں محرم کو اپنے اہل وعیال پر فراخی کرنا: شریعتِ اسلامیہ نے اس دن کے لیے یہ تعلیم بھی دی ہے کہ اپنے اہل وعیال پر کھانے پینے میں فراخی اور وسعت کرنا اچھا ہے۔ اس پر تمام سال فراخیٔ رزق کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔ چوں کہ اس روز رحمتوں کی بارش ہوتی ہے اس لیے مسلمان جس حالت میں اس روز اپنے کو حق تعالیٰ جَلَّ شَانُہٗ کے سامنے پیش کریں گے۔ حق تعالیٰ بھی ان کے ساتھ تمام سال وہی معاملہ فرمائیں گے۔ یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اگر یومِ عاشورا میں آپ نفلی عبادات اور دعا واستغفار میں مشغول رہیں تو حق تعالیٰ جَلَّ شَانُہٗ کی رحیم وکریم ذات سے امید کی جاسکتی ہے کہ وہ تمام سال آپ کو اعمالِ صالحہ کی توفیق عطا فرماتے رہیں۔ جب آپ نے اپنے کو اس دن عبادت میں پیش کیا ہے تو امید ہے کہ حق تعالیٰ آپ کے ساتھ تمام سال یہی معاملہ فرمائیں گے۔

اب جب کہ ماہِ محرم میں خاص انوار وتجلیاتِ الٰہی کے نزول کے باعث ذاتی فضیلت بھی پائی جاتی ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عبور دریائے نیل وغیرہ عظیم الشان واقعات کے اس ماہ میں پیش آجانے کی وجہ سے بھی عرضی طور پر محرم کے مہینہ کو فضیلت حاصل ہے حتیٰ کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی اس کا احترام کفارِ عرب کیا کرتے تھے، ان امور وفضائل کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہم اس مہینہ میں زیادہ سے زیادہ عبادات میں مشغول ہو کر تجلیاتِ رحمت سے وافر حصہ حاصل کرتے مگر ہم نے محرم الحرام کے مہینے اور خاص طور پر اس کی دسویں تاریخ میں طرح طرح کی خود تراشیدہ رسومات وبدعات کا اپنے کو پابند کر کے بجائے ثواب حاصل کرنے کے اُلٹا معصیت اور گناہ میں مبتلا ہونے کا سامان بنالیا۔ پھر کوئی ایک آدھ رسم وبدعت نہیں جو اس متبرک ومحترم مہینے میں کی جاتی ہو بلکہ چند در چند رسومات وبدعات کا اس ماہ کو مجموعہ بنا دیا اور اس طرح ہر قسم کی عملی بے راہ رَوی اور بداعتقادی اس میں جنم لینے اور سر اُٹھا کر اُبھرنے لگتی ہے۔

خوب سمجھ لینا چاہیے کہ ماہِ محرم کی فضیلت کی وجہ سے جس طرح اس میں عبادات کا ثواب زیادہ ہوتا ہے اسی طرح اس ماہ کے اندر گناہوں اور معصیت میں ملوث ہونے کے وبال وعقاب کے بڑھ جانے کا بھی اندیشہ ہے، اس لیے ہر مسلمان کے لیے بہت ضروری ہے کہ ہر قسم کی بدعات اور رسومات سے احتراز کر کے صرف ان عبادات اور ان امور کی انجام دہی میں مشغول رہے جن کی ہدایات پیغمبر ﷺ نے اس ماہ کے اندر اُمت کو دی ہیں اور وہ صرف دو کام ہیں: ایک نویں دسویں کا روزہ جو کہ سنت ہے۔ دوسرے دسویں کو اپنی استطاعت کے موافق اپنے اہل وعیال پر کھانے میں وسعت وفراخی کرنا جو کہ مستحب ہے، جیسا کہ اوپر تحریر ہٰذا میں مفصّل گزرا۔ ان دو کاموں کے علاوہ جن رسومات کا رواج ہمارے زمانہ میں ہورہا ہے وہ سب قابلِ ترک ہیں۔ ان میں سے بعض مروّجہ بدعات ورسومات کا تذکرہ اس جگہ بھی کیا جاتا ہے۔ تفصیل کے لیے "إصلاح الرسوم" وغیرہ کتب ملاحظہ ہوں۔

۱۔ **تعزیہ بنانا:** اس کے ساتھ طرح طرح کی بداعتقادی کا معاملہ کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض جُہلا تعزیہ کے سامنے نذرونیاز رکھتے ہیں۔ جس کا کھانا ﴿وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾[۱] میں داخل ہوکر حرام ہے۔ اس کے آگے دست بستہ تعظیم سے کھڑے ہوکر عرضِ حاجات کرتے ہیں، اس پر لکھ کر عرضیاں لٹکاتے ہیں، اس کے دیکھنے کو زیارت کہتے ہیں۔ اس قسم کے بہت سے معاملات اس کے ساتھ کرتے ہیں جو سخت معصیت ہیں اور بعض ان میں سے درجۂ شرک تک پہنچے ہوئے ہیں۔

جُہلا کے فاسد عقیدے اور ان کے معاملات کے اعتبار سے اس وقت تعزیہ اس آیت کے مضمون میں داخل ہے ﴿اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۝﴾[۲] (کیا ایسی چیز کو پوجتے ہو جس کو خود تراشتے ہو؟) اور طرفہ ماجرا یہ ہے کہ دسویں تاریخ تک تو اس کی حد سے زیادہ تعظیم کی جاتی ہے، مگر دسویں تاریخ کے گزر جانے کے بعد اس کی طرف کسی کو التفات اور توجہ بھی نہیں ہوتی۔

پھر بعضے نادان یہ کہتے ہیں کہ تعزیہ کو امام عالی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ نسبت ہوگئی

---

۱ البقرۃ: ۱۷۳ ۲ الصّٰفّٰت: ۹۵

اور ان کا نام مبارک اس پر لگ گیا اس لیے وہ تعظیم کے قابل ہوگیا۔ یہ توضیح ہے کہ معظم کی طرف نسبت کی وجہ سے شے تعظیم کے قابل ہوجاتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ نسبت سچی اور واقعی ہو، اپنی طرف سے تراشیدہ، بناوٹی، جھوٹی اور غیر واقعی نسبت کی وجہ سے کسی چیز میں کچھ عظمت اور عزت نہیں آتی۔

دیکھیے سامری کے واقعۂ گوسالہ میں جس کا تذکرہ قرآن مجید میں موجود ہے، قولہ تعالیٰ: ﴿فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۬ فَنَسِیَ ؕ﴾[1] لوگوں نے اس خودساختہ بچھڑے کی جھوٹی نسبت خدائے پاک کی طرف کردی تھی اور خدائے قدوس کا اسم گرامی اس پر غلط طور پر لگا دیا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس بچھڑے میں نہ تو کسی قسم کی عظمت پیدا ہوئی اور نہ ہی اس وجہ سے اس کی تعظیم کی گئی بلکہ پیغمبر کلیم اللہ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِی الْیَمِّ نَسْفًا ؕ﴾[2] (اب ہم اس کو جلا کر اس کی راکھ کو دریا میں بہادیں گے)۔

اسی طرح اگر کوئی شخص خود کو ظاہر کرنے لگے کہ میں امام حسین رضی اللہ عنہ ہوں تو اس کو سخت بے ادب وگستاخ قرار دیا جائے گا اور اس جھوٹی نسبت کی وجہ سے بجائے تعظیم کے وہ توہین کا مستحق ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹی نسبت سے کوئی شے معظم نہیں ہوتی بلکہ اس کذب کی بنا پر وہ نسبت کنندہ ہی خطاکار اور قابل باز پرس ہے۔

اب غور کرلیا جائے کہ جس تعزیہ کو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے یہ نسبت جھوٹی ہے یا سچی ہے؟ ظاہر بات ہے کہ یہ نسبت جھوٹی ہے، کیوں کہ اس لکڑی وغیرہ کے تابوت کو کسی قسم کا تعلق حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے نہیں ہے، نہ تو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے ان چیزوں کو کبھی ہاتھ مبارک لگایا تاکہ حضرت کے چھونے سے وہ اَشیا متبرک ہوجاتیں اور نہ ہی اس تعزیہ کے بنانے کا آپ نے کبھی حکم ہی فرمایا۔ تو اب خود ہی انصاف کرلو کہ تعزیہ قابلِ تعظیم ہے کہ نہیں؟ البتہ اگر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا کوئی لباس وغیرہ حضرت کے بدن مبارک سے لگا ہوا ہوتا تو وہ صحیح اور سچی نسبت کی وجہ سے تمام مسلمانوں کے نزدیک قابلِ تعظیم اور لائقِ احترام ہوتا

[1] طٰہٰ: ۸۸ [2] طٰہٰ: ۹۷

اگر چہ نذر وغیرہ افعالِ محرمہ کا ارتکاب اس کے ساتھ بھی ناجائز وحرام ہی ہوتا مگر جائز حدود میں رہ کر اس کی عزت وحرمت اور تعظیم کرنے میں کسی کو کلام اور اعتراض نہ ہوتا۔

اس پر قیاس کر کے علَم (جھنڈا) مہندی اور پنگھوڑا اور دلدل وغیرہ رسومات کا حکم بھی معلوم ہوسکتا ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ: بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ تعزیہ امام حسین رضی اللہ عنہ کے روضۂ مبارک کی نقل اور تصویر ہے، اور علم ومہندی وغیرہ ان واقعات کی نقل ہے جو کربلا کے میدان میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو پیش آئے، تو ان واقعات کی نقل کرنے میں کیا قباحت ہے؟ اور تصویر بے جان چیز کی بنانا شرع میں جائز ہے، پھر تعزیہ بنانا کیوں ناجائز ہے؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ صحیح ہے کہ تصویر بے جان چیز کی بنانا جائز ہے مگر اوّل تو اس تصویر کا صحیح اور واقعہ کے مطابق ہونا لازم ہے۔ ایک غلط تصویر بنا کر اس کے متعلق یہ دعویٰ کرنا کہ یہ فلاں کی تصویر ہے جھوٹی نسبت ہے جس سے شرع نے منع کیا ہے اور وہ ناجائز اور حرام ہے۔ اور یہ بات کسی دلیل سے ثابت نہیں کہ تعزیہ وغیرہ کی جو شکل اس وقت عام طور پر مروّج ہے وہ یقیناً روضۂ امام رضی اللہ عنہ کا ہی نقشہ اور اس کی ہی صحیح تصویر ہے۔ اس لیے غلط طور پر نسبت کرنے کی وجہ سے ان واقعات کی نقل اُتارنا ناجائز ہی رہا۔

اور اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ مختلف مقامات پر جو نقشے روضۂ امام رضی اللہ عنہ کے بنانے کا طریقہ ہمارے دیار میں مروّج ہے وہ روضۂ امام ہی کی تصویر بنائی جاتی ہے، جیسا کہ کعبۂ معظمہ اور روضۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشے کاغذ وغیرہ پر بنائے جاتے ہیں، تو اگر اس تصویر کشی سے مقصود صرف نقشہ سمجھانا اور تخیل آرائی ہوتی تو یہ بے جان کی تصویر کشی ہونے کی وجہ سے جائز ہوتی۔ لیکن جب روضۂ امام رضی اللہ عنہ وغیرہ کی تصویر بنانے کو ثواب کا کام سمجھا جاتا ہے، اور تعزیہ وعلم وغیرہ بنانے سے بنانے والوں کا مقصود ہی ثواب حاصل کرنا ہوتا ہے تو اب یہ نقشہ بنانا بھی جائز نہیں رہا بلکہ بدعت سیئہ ہوگیا۔

کیوں کہ قبروں وغیرہ کے ایسے نقشے بنانا اور جعلی قبور کی زیارت کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور

اہلِ بیت کے ائمۂ اطہار سے ہرگز ثابت نہیں، نہ ان نقشوں کے بنانے پر انھوں نے ثواب بیان فرمایا۔ خصوصاً جب کہ ان مصنوعی صورتوں پر اصل کے احکام جاری کیے جائیں اور ان کے ساتھ بالکل اسی طرح کا معاملہ کیا جائے جس طرح کا معاملہ اصل کے ساتھ کیا جاتا ہے، تب تو اس کے ناجائز ہونے میں کسی طرح کا شک وشبہ ہی نہیں رہتا۔ کیوں کہ یہ طریقہ بت پرستوں کا ہے کہ کوئی شکل اپنے ہاتھ سے بنا کر اُس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو اصل کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ کعبۂ معظمہ اور روضۃ النبی ﷺ کے نقشوں کے ساتھ کوئی شخص ایسا معاملہ نہیں کرتا جو اصل کعبۂ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس لیے کعبۂ معظمہ اور روضۂ مطہرہ کے نقشوں پر قیاس کر کے تعزیہ بنانے کا جواز ہرگز ثابت نہیں ہوگا۔ تو اب ان تعزیوں کے بنانے اور زیارت کرنے کو ثواب کا کام اور دین کی بات سمجھ کر کرنا یقیناً إحداث في الدین اور بدعتِ سیئہ ہوگا۔ ﴿اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ﴾[1]

اور پھر تعزیہ کے ساتھ ایسے ہی معاملات نہیں کیے جاتے جو اصل قبر کے ساتھ جائز ہیں، بلکہ ایسے معاملات بھی تعزیہ کے ساتھ اہلِ زمانہ کرتے ہیں جن کا کرنا اصل قبر کے ساتھ بھی جائز نہیں۔ جیسے اس کو طواف وسجدہ کرنا، جھک جھک کر سلام کرنا اور حضرت امام رضی اللہ عنہ کی اس کو جلوہ گاہ سمجھ کر اس ابرک پنی لکڑی کے ڈھانچہ سے مرادیں مانگنا، اس کو حاجت روا جاننا، ان کاموں کا اصل قبر کے ساتھ کرنا بھی ناجائز اور حرام ہے۔ پھر ان فرضی نقلوں اور جعلی قبروں کے ساتھ کرنا کیسے جائز ہوگا۔ اس وجہ سے بھی تعزیہ کا بنانا ناجائز ہے۔ کیوں کہ یہ سبب بن گیا ہے بہت سے ممنوعات ومنہیات کے ارتکاب کا۔

غیر ذی روح کی تصویر کشی اس وقت تک جائز ہے جب تک کہ اس سے کوئی اور اعتقادی خرابی پیدا نہ ہو اور نہ وہ کسی گناہ اور معصیت کا سبب بنے۔ بعض جاہل ایک روایت بیان کرتے ہیں کہ پیغمبر ﷺ نے ایک شخص کو جس نے جنت کی چوکھٹ کو بوسہ دینے کی نذر مانی تھی، ماں باپ کی قبر کا بوسہ لینے کے لیے فرمایا تھا اور قبر معلوم نہ تھی تو لکیر کھینچ کر بوسہ لینے کا حکم فرمایا تھا۔ اس روایت کو فرضی قبروں اور دوسری بدعات کے جواز پر دلیل بناتے ہیں۔

[1] الشوریٰ: ۲۱

مگر یہ حدیث ہر گز صحیح نہیں بلکہ جعلی اور موضوع ہے اور اس میں شیعی راوی ہے۔

بعض جاہل کہتے ہیں کہ آں حضرت ﷺ نے فتح مکّہ کے موقع پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تصویر کو توڑا نہیں بلکہ دفن کر دیا تھا۔ مگر دفن کرنے کا ثبوت کوئی نہیں ہے۔ اور اگر زمانۂ جاہلیت کے قریب ہونے کی وجہ سے تالیفِ قلوب کے لیے اس کو دفن ہی کرادیا گیا ہو تو پھر بھی جب آں حضرت ﷺ نے اس کو باقی وقائم نہ رکھا بلکہ اس کو دفن کر کے علیحدہ کر دیا تو آں حضرت ﷺ کی ناخوشی اور ناراضگی تصویر کشی کے متعلق معلوم ہوگئی۔

اگر تصویر کشی کو آں حضرت ﷺ پسند فرماتے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تصویر بطورِ تبرک ضرور باقی اور قائم رکھتے اس کو دفن بھی کیوں کرتے۔ اس سے ثابت ہوا کہ تصویر کشی ناجائز ہے اور جو تصویر پہلے سے بھی بنی ہوئی ہو اس کو بھی علیحدہ کردو۔ اگرچہ وہ کسی متبرک اور اولوالعزم پیغمبر کی ہی تصویر کیوں نہ ہو۔ عجب تماشہ ہے کہ یہ حدیث تصویر بنانے کے لیے سندِ جواز ہوسکتی ہے؟ اس سے تو زمانۂ جاہلیت کی بنی ہوئی ایک معظّم شخصیت کی تصویر رکھنے کا بھی ناجائز ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اس جگہ وہ حضرات بھی غور فرمائیں جنھوں نے اپنے پیروں اور بزرگوں کی تصاویر اور تماثیل کو بطور تبرک اپنے عبادت خانوں کی زینت بنایا ہوا ہے۔ اور بعض لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بہت سی قبریں بنانے کی وصیّت کی تھی تو نقلی قبریں بنانا جائز ہوگئیں۔ یہ بالکل غلط اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بہتان ہے۔ صحیح سند سے کسی کتاب میں یہ روایت نہیں ہے بلکہ کتبِ شیعہ میں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دوبارہ قبر بنانے اور تمثالی تصویر بنانے کی ممانعت منقول ہے۔

"من لا یحضرہ الفقیہ" میں ہے:

من جدّد قبرًا ومثّل مثالاً فقد خرج عن الإسلام.

جس نے کسی قبر کو پھر سے بنایا یا کوئی تمثال (تصویر) بنائی تو وہ ضرور اسلام سے نکل گیا۔

اور جو سخت جاہل ہیں وہ کہا کرتے ہیں: قرآن نقل ہے، مسجد نقل ہے، اور کعبہ نقل ہے۔ ان کے کلام کا سخت واہی اور بودا ہونا ظاہر ہے کیوں کہ قرآن کو حضرت جبرئیل علیہ السلام لکھا ہوا

لے کرنہیں اُترتے تھے جوان مصاحف کواس کی نقل کہاجاتا۔مسجد وکعبہ آپ اصل ہیں نقل کسی کی نہیں۔

البتہ اگرکوئی مکّہ مکرمہ کے علاوہ کسی مقام پر کعبہ معظّمہ کی نقل اتارکرفرضی کعبہ کے ساتھ وہی معاملات کرنے لگے جو کعبہ معظّمہ کے ساتھ کیے جاتے ہیں تووہ بھی اسی طرح ممنوع ہے جس طرح روضۂ امام حسین رضی اللہ عنہ کی نقل اتارکراس کے ساتھ اصل قبر مبارک جیسا معاملہ کرنا ممنوع ہے۔کیا کوئی صاحبِ علم اس کی اجازت دیں گے کہ کسی مقام پر کعبۂ معظّمہ کی نقل بناکر اس کا طواف کیا جائے اور مصنوعی طور پر کسی جگہ کا نام عرفات ومنٰی ومزدلفہ وغیرہ رکھ کر حج کیا جائے؟ ہرگز ہرگز کسی کے نزدیک یہ چیز جائز نہیں۔تو پھر روضۂ امام حسین رضی اللہ عنہ کی نقل کے ساتھ اصل قبر مبارک کا معاملہ کرنا کیسے جائز ہوگا؟ اسی طرح علم اور دلدل اور مہندی وغیرہ کی نقل بناکران کے ساتھ وہی برتاؤ کرنا جواصل کے ساتھ ہو کیسے صحیح ہوگا؟

۲۔معازف ومزامیر ڈھول وغیرہ کا بجانا اورفساق وفجار کا جمع ہونا: جس میں بہت مرتبہ فحش اور ناگفتہ بہ واقعات کا بھی وقوع ہوتا ہے۔

معازف ومزامیر وغیرہ کی حرمت حدیث میں صاف صاف مذکور ہے اور قطع نظر خلاف شرع ہونے کے عقل کے بھی تو خلاف ہے۔کیوں کہ یہ آلات تو سروراور خوشی کے ہیں۔ سامان غم میں ان کے کیا معنی ہیں؟ یہ تو در پردہ خوشی منانا ہے۔ع

برچنیں دعوئ الفت آفرین

۳۔مرثیہ پڑھنا: جس کی حدیث ''ابن ماجہ'' میں سخت ممانعت آئی ہے۔اکثر موضوع اور من گھڑت روایات پڑھنا جس کی نسبت حدیث میں سخت وعیدیں آئی ہیں۔ ماتم کرنا، نوحہ کرنا، سینہ کوبی کرنا، ہائے ہائے کرنا سب ممنوع ہیں۔

۴۔محرم کے ایام میں قصداً زینت ترک کرنا: جس کوسوگ کہتے ہیں۔مثلاً: مہندی لگانا اور سر پر تیل لگانا ان ایام میں سوگ کے لیے بعض عورتیں ترک کردیتی ہیں۔اس کا حکم شرع شریف میں یہ ہے کہ مرد کے لیے سوگ کسی جگہ جائز نہیں، اور عورت کو خاوند کی وفات پر چار مہینہ دس دن

یاوضعِ حمل تک سوگ کرناواجب ہے اور دوسرے عزیزوں کی وفات پر صرف تین دن تک جائز ہے۔ سواب تیرہ سو سال کے بعد شہدائے کربلا کا سوگ کرنابلاشبہ حرام ہے۔ اسی طرح بعض لوگ ان ایام میں شادی بیاہ کرنے اور خوشی کرنے سے سوگ کی وجہ سے رُک جاتے ہیں۔ بعض میاں بیوی کے خاص تعلقات کوان دنوں میں بُرا سمجھتے ہیں۔ اسی طرح پان کا کھانا چھوڑ دینا، پلنگ پر نہ سونا بلکہ اس کواُلٹا کردینا، عمدہ کپڑے نہ پہننا، چوڑی توڑ دینا، ان دنوں میں شرع سے ثابت نہیں ہے اور نہ شریعت میں ان کاموں کی ایامِ محرم میں کوئی ممانعت آئی ہے۔

۵۔ کسی خاص لباس یاخاص رنگ وغیرہ کے ذریعہ اظہارِ غم کرنا: ''ابن ماجہ'' میں عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ایک جنازہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض لوگوں کو دیکھا کہ غم میں چادر اُتار کرصرف کرتہ پہنے ہوئے ہیں۔ یہ وہاں غم کی اصطلاح اوراس کے اظہار کا طریقہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت ناخوش ہوئے اور فرمایا کہ کیا جاہلیت کے کام کرتے ہو؟ یا یہ فرمایا کہ جاہلیت کی رسم کی مشابہت کرتے ہو؟ میرا تو یہ ارادہ تھا کہ تم پر ایسی بد دعا کروں کہ تمھاری صورتیں بدل جائیں۔ پس فوراً ان لوگوں نے چادریں لے لیں اور پھر کبھی ایسا نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی خاص وضع اور ہیئت اظہارِ غم کے لیے بنانا حرام ہے۔

۶۔ حضراتِ اہلِ بیت کی عورتوں کا ذکر برسرِ بازار کیا جاتا ہے: کوئی مُنصِف مزاج شریف الطبع انسان اپنے خاندان کی عورتوں کا اعلان اس طرح گلیوں کوچوں اور بازاروں میں ہونا پسند نہیں کرسکتا۔ پھر غور کیاجائے کہ کیا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ جیسی غیور شخصیت اس کو پسند فرمائے گی کہ ان کے خاندان کی ان مطہرات کا ذکر اس طرح برسرِ بازار کیا جائے جن کے دامنِ تطہیر پر نگاہِ غیر کا گزر خدائے قدوس کو گوارا نہیں اور ﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾[۱] سے ان کو قرار فی البیوت کا خاص طور پر حکم فرمایا گیا ہے۔ بعض امور اس ماہ میں ایسے بھی مروّج ہیں جو فی نفسہٖ جائز اور مباح تھے مگر بوجہ فسادِ عقیدہ کے یا عمل کے وہ بھی ممنوع ہوگئے۔

[۱] الأحزاب: ۳۳

۷۔ کھچڑا یا اور کچھ کھانا پکا کر احباب کو یا مساکین کو دینا اس کا ثواب حضرت امام کو پہنچانا:
اس کی اصل وہی حدیث ہوسکتی ہے کہ جو شخص اس دن اپنے اہل وعیال پر وسعت کرے اللہ تعالیٰ سال بھر تک اس پر وسعت فرماتے ہیں۔ جب اہل وعیال کے لیے وسعت کی غرض سے کھانا زیادہ پکایا گیا تو اب اگر اس میں سے غربا کو بھی کچھ دے کر اس کا ثواب حضرات امامین رضی اللہ عنہما کے ساتھ دیگر اموات کو بھی بخش دیا جائے تو اس میں کچھ حرج نہیں تھا۔ لیکن کھچڑا یا کسی اور طعام کو معیّن اور خاص کر لینا درست نہیں۔ اسی طرح اس دن کو ایک تہوار قرار دے لینا بھی ٹھیک نہیں۔ بغیر رسم اور کسی خاص طعام کی پابندی اور تخصیص کے بغیر اگر اس روز فراخی کھانے میں کرے تو کوئی مضایقہ نہیں۔

۸۔ شربت پلانا: جب پانی پلانا ثواب کا کام ہے تو گرمی میں شربت پلانے میں کیا حرج تھا؟ مگر اس شربت کی بعض جگہ ایسی پابندی کر لی گئی ہے کہ چاہے موسم سردی ہی کا کیوں نہ ہو مگر شربت پلایا جاتا ہے۔ یہ رسم کی پابندی ہے اس کو ترک کرنا چاہیے۔ اس شربت پلانے میں ایک پوشیدہ اعتقادی خرابی یہ بھی ہے کہ حضرات شہدائے کربلا چوں کہ پیاسے شہید ہوئے تھے اور شربت پیاس بجھانے والا ہے اس کو اس لیے تجویز کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کے عقیدہ میں عین شربت پہنچتا ہے جس کا باطل ہونا قرآن سے ثابت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قربانی کے گوشت کے متعلق فرماتے ہیں: ﴿لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ﴾[1]۔

شربت پلانے سے اگر مقصود ثواب کا حاصل کرنا ہے تو وہ دوسری چیز کے صدقہ کرنے سے بھی ہوسکتا ہے۔ کیا شربت کے ثواب میں پیاس بجھانے کا خاصہ ہے؟ پھر اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ ان کے گمان میں شہدائے کربلا (نعوذ باللہ) اب تک پیاسے ہیں، یہ کس قدر بے ادبی ہے۔ ان مفاسد کی وجہ سے شربت کی تخصیص سے بھی احتیاط لازم ہے۔ جو میسّر ہو نقدی، غلّہ وغیرہ سے فقیروں کی امداد کر کے ثواب شہدا وغیرہ کو پہنچا دیا کریں۔

---

[1] الحج: ۳۷

۹۔ شہادت حسین رضی اللہ عنہ کا قصہ بیان کرنا: اگر صحیح روایات سے اس کو بیان کر دیا جایا کرتا تو کچھ حرج نہ تھا۔ مگر اس میں چند خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں:

الف۔ عام طور پر مقصود اس قصہ کے ذکر سے ہیجان اور جالب غم اور گریہ وزاری ہوتا ہے۔ اس میں صریح مقابلۂ شریعت مطہرہ ہے، کیوں کہ شریعت میں ترغیب صبر کا حکم ہے، اور تعزیت سے مقصود یہی ہے کہ صبر اور تسلی کے کلمات کہے جاویں تا کہ غم زدہ کا غم ہلکا ہو کر اس کو صبر کی طرف توجہ ہو۔ "درمختار" میں ہے: ولا بأس بتعزية أهله و ترغيبهم في الصبر.

اس لیے گریہ وزاری کا سامان مہیا کر کے اور قصداً قصہ غم ناک کی یاد تازہ کر کے غم کو زیادہ کرنا مقصودِ شرع کے خلاف ہونے کی وجہ سے ممنوع ہوگا۔ البتہ اگر کسی کو غلبۂ غم سے ازخود آنسو آجائیں تو اس میں گناہ نہیں مگر زبان سے بے صبری کا کلمہ نہ نکلنے دے، صدمہ کے ہونے یا اس کے یاد آنے کے وقت إنا لله الخ پڑھنے اور صبر کرنے کا حکم ہے، نہ کہ حسرت و افسوس کے اظہار کا، نہ بتکلف افسوس کرنے کا۔ پس مصیبت کے پیش آجانے یا اس کے یاد آجانے کے وقت جو صابروں کا شیوہ ہے اس کو لازم پکڑنا چاہیے۔

اور گریہ وزاری اور بے صبری اور غم کے اسباب جمع کرنا بے شبہ صابروں کے طریقہ کے خلاف ہے۔

ب۔ ایسی مجلس کا منعقد کرنا جس میں صرف قصۂ کربلا ہی کو بیان کیا جائے چوں کہ اہلِ بدعت کا شعار ہے، اس لیے مشابہتِ روافض کی وجہ سے ممنوع ہے اور اس کے اندر شرکت بھی ناجائز ہے۔ اگر اس مجلس میں دوسرے شہدا کے تذکرہ کے ساتھ شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ کا بھی ذکر کیا جائے تو بظاہر کچھ حرج معلوم نہیں ہوتا، جب کہ واقعات صحیح روایات سے بیان کیے جائیں اور مقصود غم کو تازہ کرنا بھی نہ ہو، کہ اس صورت میں تخصیصِ مضمون کی کراہت نہیں رہتی۔ مگر غور کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ تخصیصِ ایام کی کراہت پھر بھی پائی جاتی ہے۔ اس لیے ایامِ محرم کے ساتھ اس تذکرہ کو خاص نہ کیا جائے۔

"جامع الرموز" میں ہے کہ جب واعظ شہادت حسین رضی اللہ عنہ بیان کرنے کا ارادہ کرے تو پہلے صحابہ کی شہادتوں کا بیان کرے تا کہ رافضیوں سے مشابہت نہ ہو۔[1]

[1] آثار مولانا عبدالحی لکھنوی: ۱/۱۱۱

اور "نفع المفتي والسائل" میں ہے:

الاستفسار: هل يجوز بيان قصة شهادة الإمام حسين ﷺ في عشرة محرم الأولى بجمع المجالس وبكاء الناس عليه؟

الجواب: نقل في "مطالب المؤمنين" عن إمامنا الأعظم أبي حنيفة ﷺ: أنه لا يجوز للتشبه بالروافض. وفي "جامع الرموز": يجوز لمن يبين قصص شهادة الخلفاء الأربعة وغيرهم من أجلة الصحابة ويعتاد ذلك. وأما بيان قصة شهادة الحسين ﷺ وترك بيان شهادت الأئمة فتشبه بالروافض.

قلت: تخصيص بيانه بعشرة المحرم الأولى وجمع المجالس ببكاء النّاس كما تعارف في بلادنا تشبه بالروافض، ومن تشبه بقوم فهو منهم۔[1]

"اصول صغار" میں ہے:

سئل عن ذكر مقتل الحسين ﷺ في يوم عاشوراء أيجوز أم لا؟ قال: لا؛ لأن ذلك من شعار الروافض.

ان ہی وجوہات کی بنا پر ہمارے بعض اکابر نے اس تذکرہ کو محرم ہی کے ساتھ خاص کر لینے اور مشابہتِ روافض کی وجہ سے ناجائز فرمایا ہے۔ جیسا کہ "فتاویٰ رشیدیہ" میں ہے:

محرم میں ذکرِ شہادت حسین رضی اللہ عنہ کرنا اگرچہ بروایات صحیحہ ہو، یا سبیل لگانا، دودھ پلانا، شربت پلانا، چندہ سبیل و شربت میں دینا نادرست اور تشبہ روافض کی وجہ سے حرام ہے۔[2]

ویسے بھی جو فعل کسی بدعتی فرقہ کا شعار بن جاتا ہے وہ فعل اگرچہ اپنی ذات میں مباح اور مستحسن ہو مگر اس سے مسلمانوں کو منع کر دیا جاتا ہے۔ علامہ قاری مکی ایک حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: فيه إشارة إلى أن كل سنة تكون شعار أهل البدعة فتركها أولى.

[1] ص: ۱۳۲　[2] ص: ۱۴۸

چوں کہ ہمارے ملک میں یہ تمام باتیں روافض کا شعار اور ان کا خاص نشان وعلامات ہوچکی ہیں لہٰذا اس وجہ سے بھی ناجائز اور واجب الترک ہیں۔ اب جو لوگ عاشورا کے ایام میں شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ کے لیے مساجد وغیرہ میں جمع ہوکر کرنے کے جواز پر اصرار کرتے ہیں، حتیٰ کہ بعض اہلِ علم بھی اس کو جائز سمجھنے کی عظیم غلطی میں مبتلا ہیں وہ ان وجوہات پر غور کریں اور سوچیں کہ کیا اس طریقۂ مروجہ سے شعارِ روافض کی ترویج اور تائید نہیں ہوتی۔

بعض عوام تو تعزیہ اور علم وغیرہ بھی نکالتے ہیں اور حضرات اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کے مصائب کا ذکر کرتے ہیں اور ان کا ماتم بھی کرتے ہیں اور مرثیہ پڑھتے اور روتے چلاتے ہیں۔ ان سب باتوں کا ترک کرنا واجب اور ضروری ہے۔

اور بعض لوگ ان امور سے تو بچتے ہیں اور وہ سینہ کوبی بھی نہیں کرتے مگر وہ مساجد وغیرہ میں جمع ہوکر ذکرِ شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ سنانے کا اہتمام کرتے ہیں اور قصداً ایسے مضامین سناتے ہیں جن سے خود بھی روتے ہیں اور دوسروں کو بھی رُلاتے ہیں اور اس سے مقصود بھی جلبِ غم ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ اس میں بعض ثقہ لوگ بھی غلط فہمی سے شریک ہوجاتے ہیں اور عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جب تک ایسے مضامین نہ بیان کیے جائیں اس وقت تک یومِ حسین رضی اللہ عنہ ہی نہیں منایا گیا حالاں کہ اگر غور وتدبر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوسکتا ہے کہ درحقیقت اس طریقہ سے بھی اہلِ بدعت کے شعار "ماتم" کی تائید اور اس کی ترویج ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہ بھی ماتم کا ہی ایک مہذب طریقہ ہے اور شریعت میں ماتم کرنے کی کوئی اصل نہیں ہے۔ لہٰذا ماتم جس صورت میں بھی ہو وہ شرعاً ناجائز اور ممنوع ہوگا، شرع میں اس کے جواز کی کوئی صورت نہیں ہے۔

اس جگہ اس غلطی کی اصلاح کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری ہے جو اہلِ بدعت کے اثرات اور ان کے ساتھ اختلاط اور میل جول کی وجہ سے اہلِ سنت والجماعت کے عوام میں عام طور پر پیدا ہوچکی ہے کہ محرم کے دنوں میں شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ کے ذکر کے ساتھ بھی دوسرے شہدا کے ذکر کو گوارہ نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے واقعاتِ شہادت کے ذکر کو بھی

پسند نہیں کیا جاتا اور اگر ان دنوں میں بدر و اُحد کے فضلائے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شہادت کا بھی تذکرہ کیا جاتا ہے تو عوام اہلِ سنت کی یہ حالت ہے کہ اس کو بھی ایک اجنبی اور بے تعلق ذکر سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ اہلِ سنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ جن حضرات نے اسلام کے ضعف اور احتیاج کے زمانہ میں تقویتِ اسلام کے لیے قتال اور مالی و جانی جہاد کیا ہے ان کا وہ قتال اور مالی انفاق ان لوگوں کے مالی اور جانی جہاد سے افضل ہے جنھوں نے اسلام کی قوت کے بعد ان امورِ خیر کو انجام دیا ہے، اس لیے اہلِ سنت کے نزدیک وہ حضرات جو جنگِ بدر میں شریک ہوئے ہیں اپنے بعد والی تمام جنگوں میں شریک ہونے والوں سے افضل ہیں۔ پھر اس کے بعد اُحد میں شریک ہونے والوں کا مرتبہ ہے۔

اسی طرح درجہ بدرجہ بعد کی جنگوں میں شریک ہونے والوں کو فضیلت حاصل ہے۔ یہاں تک کہ فتحِ مکّہ سے قبل جن لوگوں نے مالی اور جانی جہاد کیا ہے وہ ان تمام لوگوں سے افضل ہیں کہ جنھوں نے فتح مکّہ کے بعد مالی اور جانی جہاد کیا ہے، کیوں کہ فتح مکّہ کے بعد اسلام کے ضعف اور احتیاج کا زمانہ ختم ہوگیا تھا اور اسلام کو قوت اور غلبہ حاصل ہوجانے کی وجہ سے اس قدر احتیاج اور ضرورت باقی نہیں رہی تھی کہ جس قدر فتح مکّہ کے قبل احتیاج اور ضرورت تھی۔

حق تعالیٰ جَلّ شَانُہٗ کا صاف اور صریح ارشاد ہے:

﴿لَا يَسْتَوِىْ مِنكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ﴾[1]

جو لوگ فتح مکّہ سے پہلے فی سبیل اللہ خرچ کرچکے اور (فی سبیل اللہ) لڑ چکے (اور جو کہ فتح مکّہ کے بعد لڑے اور خرچ کیا دونوں) برابر نہیں، (بلکہ) وہ لوگ درجہ میں ان لوگوں سے بڑے ہیں جنھوں نے (فتح مکّہ) کے بعد میں خرچ کیا اور لڑے، اور (یوں) اللہ تعالیٰ نے بھلائی (ثواب) کا وعدہ سب سے کر رکھا ہے۔

[1] الحدید: ۱۰

اس سے معلوم ہوا کہ جو بھی مالی اور جانی قربانی فتح مکّہ سے قبل کی گئی ہے وہ اس قربانی سے درجہ میں بڑھ کر ہے جو کہ بعد فتح مکّہ کے کی گئی ہے اور اس فتح مکّہ کے قبل اور فتح مکّہ کے بعد اجر میں تفاوت کی وجہ بیان کرتے ہوئے تفسیر ''روح المعانی'' میں لکھا ہے کہ فتح سے پہلے جانی اور مالی امداد کی زیادہ حاجت تھی کیوں کہ مسلمان کم تھے اور دشمن زیادہ تھے اور مالِ غنیمت وغیرہ کی بھی امید نہ تھی اس لیے ایسے وقت میں مال کا خرچ کرنا زیادہ نافع تھا۔ اسی طرح ایسے وقت میں قتال کرنا نفس پر زیادہ گراں تھا۔ فتح مکّہ کے بعد جب ان امور میں تفاوت ہوگیا تو پھر جانی اور مالی امداد پر اس قدر اجر وثواب بھی نہیں رہا۔[۱]

یہی وجہ ہے کہ حدیث میں ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے اگر کوئی شخص آدھ مد (آدھ سیر) جو خیرات کرے تو دوسرے شخص کا اُحد پہاڑ کے برابر سونا خیرات کرنا اس درجہ کو نہیں پہنچ سکتا، کیوں کہ عمل کے اندر زمانہ کی فضیلت کی وجہ سے جو فضیلت آتی ہے اس کے مقابلہ میں عمل کی کیفیت اور تعداد کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاتا۔ اس لیے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ مسعود کی برکت سے تمام زمانوں سے افضل اور بہتر ہے، تو جو عمل اس میں صادر ہوگا وہ سب اعمال سے افضل ہوگا، بعد میں آنے والوں کا کوئی عمل کسی طرح اس کی برابری نہیں کرسکتا، خصوصاً وہ عمل جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوکر کسی صحابی نے کیا ہو۔ چوں کہ اس میں علاوہ زمانۂ عمل کی فضیلت کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عمل میں شریک ہونے کی فضیلت بھی حاصل ہورہی ہے اس لیے اس کے برابر تو دوسرا کوئی عمل ہو ہی نہیں سکتا اسی وجہ سے علمائے کرام نے لکھا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک رکعت نماز کا ادا کرنا، اسی طرح روزہ رکھنا، یا صدقہ خیرات کرنا، یا جہاد میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ شریک ہونا ہزاروں درجہ بہتر ہے ان امورِ خیر کے تنہا کرنے سے یا کسی غیر نبی کے ہمراہ کرنے سے۔

احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جو اعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ شریک ہوکر کیے تھے وہ ان کو ان اعمال سے افضل سمجھتے تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انھوں نے کیے تھے۔ یہاں سے اس عقیدہ کی وجہ بھی معلوم ہوگئی ہوگی جو علمائے کرام نے

لکھا ہے کہ جو صحابی آں حضرت ﷺ کی وفات کے وقت جس مرتبہ اور درجہ پر تھے حضور ﷺ کی وفات کے بعد کسی عمل کے کرنے کی وجہ سے کوئی شخص اس کے درجہ اور مرتبہ پر نہیں پہنچ سکتا، اور جو صحابی آں حضرت ﷺ کی وفات کے وقت افضل تھا وہ ہمیشہ افضل ہی رہے گا چاہے بعد وفاتِ سرورِ کائنات ﷺ کسی نے اس افضل صحابی سے تعداد اور کیفیت میں کتنے ہی زیادہ عمل کیے ہوں کیوں کہ حضور ﷺ کے عمل مبارک کے ساتھ شرکت کی جو فضیلت تھی وفات کے بعد وہ کسی طرح بھی کسی کو حاصل نہیں ہوسکتی اور حیاتِ مبارکہ میں حضور ﷺ کے عمل مبارک کے ساتھ شرکت سے جو ایک ہیئتِ وحدانیہ اور مزاج مرکب پیدا ہو کر وہ عمل اپنے انتہائی مرتبۂ کمال کو پہنچ جاتا تھا اور حضور ﷺ کے عمل مبارک میں مل کر اور ممزوج ہو کر اس کی برکت سے بطور تبعیّت کے قبولیت اور شرافت کے جس بلند مقام پر وہ فائز ہوجاتا تھا، اب وہ کسی کو نصیب نہیں ہوسکتا۔

بہر حال شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ کو محرم کے عشرۂ اوّل میں خاص کر کے بیان کرنا اہلِ سنت کے نزدیک بوجوہِ بالا درست نہیں ہے۔ اور شربت وغیرہ پلانے کو بھی ان ہی وجوہاتِ کثیرہ کی وجہ سے علمائے اہلِ سنت منع کرتے ہیں۔

تنبیہ: بعض لوگ اس جگہ عوام کو مغالطہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ علمائے اہلِ سنت ایصالِ ثواب کے منکر اور اس کو منع کرتے ہیں، مگر یہ صحیح نہیں کیوں کہ اس شربت وغیرہ پلانے سے اگر کسی شخص کو صرف ایصالِ ثواب مقصود ہوگا تو اس کو علمائے اہلِ سنت کے نزدیک اس کا ثواب تو مل جائے گا مگر ایسا شخص روافض کے ساتھ مشابہت کرنے اور ان کے شعائر کی تائید کرنے کے گناہ میں بھی شریک ہوگا۔ اس لیے اس گناہ سے بچانے کے لیے علمائے اہلِ سنت نے لکھا ہے کہ محرم میں خاص طور پر سبیل وغیرہ لگانا منع ہے۔

علمائے اہلِ سنت کا اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ انسان اپنے عمل نیک کا ثواب جس شخص کو بھی چاہے پہنچا سکتا ہے۔ لیکن اس ثواب کے پہنچانے کے لیے اپنی طرف سے کوئی خاص چیز اسی طرح کوئی دن یا کوئی مہینہ متعین کرنا درست نہیں ہے۔ ہاں اگر کسی ایسے خاص

وقت میں عمل کیا جائے جس میں عمل کا ثواب دوسرے وقتوں سے زیادہ ہونا خود شریعت نے ہی بتلایا ہو، جیسے ماہِ رمضان المبارک کہ اس میں ہر عمل کا ثواب ستر گنا ہو جانا شریعت سے ثابت ہے، تو اس میں کچھ حرج نہیں ہے۔

مجموعہ فتاویٰ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں ہے:

سوال: پختن طعام در ایامِ ربیع الاول برائے خدا و رسانیدن ثواب آں بروح پرفتوح حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم و یا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ در ماہِ محرم و دیگر آل اطہار سید مختار صحیح ہست یا نہ؟

جواب: انسان در فعل خود مختار ست۔ میرسد کہ ثواب عمل خود برائے بزرگان با ایمان خود گرداند، لیکن برائے ایں کار وقت و روز متعین نمودن و ماہے مقرر کردن بدعت است الخ، و ہر چیز کہ برآں ترغیب صاحب شرع و تعیین وقت نہ باشد آں فعل عبث است و مخالفِ سنتِ سید الانام، و مخالفِ سنت حرام است، پس ہرگز روا نہ باشد۔[1]

دیکھیے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایصالِ ثواب کے لیے دن اور مہینہ اپنی طرف سے مقرر کرنے کو بدعت اور مخالفت سنت ہونے کی وجہ سے حرام فرما رہے ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ حضرت گنگوہی نے سبیل وغیرہ لگانے کو بالتخصیص ایامِ محرم میں جو منع لکھا ہے وہ متقدمین بزرگان اہل سنت کی اور اصولِ فقہ کے بالکل موافق ہے۔ اس پر اعتراض کرنا بزرگانِ اہل سنت کی تحقیقات اور اصولِ فقہ سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔

یہ حکم تو اس وقت ہے جب صرف تعیین ایام ہی منع کرنے کی وجہ ہو حالاں کہ اس میں تشبہ روافض بھی بالکل کھلا ہوا اور ظاہری طور پر موجود ہے۔ اور بعض جاہل امام حسین رضی اللہ عنہ کی نذر اور منت کے طور پر ان سبیلوں کو لگاتے ہیں۔ اس صورت میں تو نذر لغیر اللہ میں داخل ہونے کی وجہ سے اس شربت وغیرہ کے حرام ہونے کے اندر کچھ شبہ ہی نہیں رہتا۔

فتاویٰ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ میں ہے:

سوال: طعام منت بزرگاں خوردن جائز است یا نہ؟

جواب: خوردن قریب بحرام است بشرطے کہ نیت نذر لغیر اللہ باشد۔ ملخصاً۔[2]

---

[1] فتاویٰ: ۱/۹۰ [2] ص: ۱۳۰

بعض لوگ ''فتاویٰ عزیزی'' کی بعض عبارات سے اپنی بدعات پر بزعم خود استدلال کرتے ہیں اور فتاویٰ کی بعض عبارات کو اپنے دعاوی کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو ان مذکورہ بالا عبارات پر بھی ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایصال ثواب کے لیے مہینہ اور دنوں کے معیّن کرنے کو کس طرح مخالف سنت اور حرام ناروا فرما رہے ہیں۔

فائدہ: بعض لوگ کہا کرتے ہیں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت پر حزن وغم کے اظہار کے لیے سر وغیرہ پر مٹی ڈالنا تو حدیث سے ثابت ہے، جیسا کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت میں ہے:

حدثني سلمى قالت: دخلت على أم سلمة رضي الله عنها وهي تبكي، فقلت: ما يُبكيكِ؟ قالت: رأيت رسول الله ﷺ - تعني في المنام - وعلى رأسِهِ ولحيتِهِ التراب، فقلت: ما لك، يارسول اللّٰه؟ قال: شهدتُ قتل الحسين آنفًا.

سو اس کے متعلق اول تو یہ گزارش ہے کہ یہ واقعہ خواب کا ہے اور خواب میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر واقعہ اپنی حقیقت پر ہی نظر آئے۔ بلکہ واقعات اکثر اپنی صورتِ مثالیہ میں نظر آتے ہیں اور اسی لیے وہ محتاجِ تعبیر ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس خواب میں جو راسِ مبارک اور لحیۂ مبارک پر مٹی نظر آئی ہے اس سے مراد حزن تھا، یہ مٹی اس حزن کی صورتِ مثالیہ تھی جس کے پردہ میں حزن مستور تھا، تو اس سے خاک ڈالنے کا جواز کہاں سے معلوم ہوا، البتہ اس سے حزن کا ثبوت ہوتا ہے اور اس کا کسی کو انکار نہیں ہے، امام عالی مقام کی شہادت موجبِ غم اور سبب حزن ہے۔ تو اب اس خواب اور اس کی تعبیر کا حاصل یہ ہوا کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شہادتِ امام حسین رضی اللہ عنہ پر مغموم ومحزون دیکھا۔ سر اور لحیہ پر مٹی دیکھنے سے مراد غمگین وحزین ہونا ہے، اس سے سر وغیرہ پر خاک وغیرہ ڈالنے کا جواز نکالنا بالکل غلط اور عالم رؤیا کی حقیقت سے ناواقفی کی دلیل ہے۔ پھر یہ کہ خاک ڈالنا اور بات ہے اور خاک کا از خود پڑ جانا اور بات ہے۔ خواب میں تو خاک پڑی ہوئی نظر آئی جو کہ اکثر مسافر کے بدن پر طول مسافت کے قطع کرنے کی وجہ سے پڑ جاتی ہے، اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ اپنے بدن

پر قصداً خاک ڈالنا جائز ہے؟ اس روایت کا صحیح مطلب معلوم ہو جانے کے بعد اس روایتِ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے متعلق اس جواب دینے کی ضرورت نہیں رہتی کہ شہادت حسین رضی اللہ عنہ کے موقع سے قبل ۵۹ھ میں حضرت امِ سلمہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو چکا تھا اور یہ واقعۂ شہادت ۶۱ھ کا ہے اور اس روایت میں شهدت قتل الحسين آنفًا کے الفاظ موجود ہیں، تو جب امِ سلمہ رضی اللہ عنہا کا انتقال واقعۂ شہادت سے قبل ہو چکا تھا تو پھر اس روایت میں شهدت قتل الحسين آنفًا کا کیا مطلب ہوگا؟ اس لیے کہ اوّل تو امِ سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے موافق ایک روایت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ''مشکوٰۃ شریف'' میں بھی منقول ہے۔ دوسرے حضرت امِ سلمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کا ۵۹ھ میں ہونا بھی مختلف فیہ ہے۔

دوسرا قول ان کی وفات کے متعلق ۶۲ھ میں وفات ہونے کا بھی ہے اور اس بات کی تائید کہ حضرت امِ سلمہ رضی اللہ عنہا کی وفات ۵۹ھ میں نہیں ہوئی ''مسلم شریف'' کی روایت سے بھی ہوتی ہے جس سے خلافتِ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما میں حضرت امِ سلمہ رضی اللہ عنہا کی موجودگی ثابت ہوتی ہے۔

۱۰۔ دسویں محرم کو اہتمام کر کے لازمی طور پر قبور پر پانی چھڑکنا یا مٹی ڈالنا یا گارے سے لیپنا:
یہ کام اگرچہ فی نفسہٖ جائز ہیں اور ضرورت کے وقت اگر قبور پر مٹی ڈال دی جائے یا مٹی کے گارے سے اس کو لیپ دیا جائے تو کچھ حرج نہیں ہے۔ ''درمختار'' میں ہے: وتطيين القبور لا يكره في المختار. مگر ان کاموں کے لیے دس محرم ہی کو مقرر کرنا اور اس تاریخ پر ضرور ہی ان کاموں کا کرنا، چاہے قبور پر مٹی وغیرہ ڈالنے کی ضرورت بھی نہ ہو، مگر لوگوں کی دیکھا دیکھی اس تاریخ میں یہ کام ضرور کیے جاتے ہیں، یہ محض ایک رسم اور بدعت ہے۔ شریعت نے ان کاموں کے لیے کوئی تاریخ مقرر نہیں کی جب ضرورت ہو تو ضرورت کے موافق قبور کو درست کیا جا سکتا ہے، اس کی اجازت ہے۔

محرم کے ایام میں خاص طور پر اور بعض مرتبہ دوسرے دنوں میں بھی لوگ قبور پر غلہ دانہ وغیرہ ڈالتے ہیں حالاں کہ شریعت میں اس کا کوئی حکم نہیں ہے، بلکہ اس صورت میں اناج کی بے ادبی ہوتی ہے [illegible]

قبور کی بے ادبی کرتے ہیں، تو اب غور سے کام لیا جائے کہ قبور کے احترام کے خلاف یہ کام کیسے صحیح ہوگا؟ غور درکار ہے۔

اب آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو تمام شر وفتن اور آفاتِ زمانہ سے محفوظ رکھے اور تمام بدعات سے پرہیز کرنے اور اتباعِ سنت کی توفیق بخشے۔ آمین!

بحرمة سيد المرسلين صلى اللّٰه تعالىٰ عليه
وعلىٰ آلِهٖ وأصحابهٖ أجمعين.

احقر
سید عبدالشکور ترمذی مدرسہ عربیہ حقانیہ
ساہیوال ضلع سرگودھا
۱۵رمضان المبارک ۱۳۸۷ھ

إرشاد العباد في عيد الميلاد

یعنی

عید میلاد کی شرعی حیثیت

از

حضرت مولانا سید مفتی عبد الشکور صاحب مدظلہ

إرشاد العباد في عيد الميلاد

یعنی

عید میلاد کی شرعی حیثیت

پیش از ہمہ شاہان غیور آمدہ
ہر چند کہ آخر بظہور آمدہ
اے ختم رسل قرب تو معلوم شد
دیر آمدہ ز راہ دور آمدہ

حمد و صلوٰۃ کے بعد گزارش ہے کہ آج کل بعض ناسمجھ مدعیانِ محبت نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکرِ مبارک کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے زمانہ کے ساتھ خاص کر دیا ہے اور وہ بطورِ رسم کے ماہِ ربیع الاول میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ولادت کا یوم منانے لگے ہیں۔ جیسا کہ بعض مدعیانِ محبتِ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یومِ حسین منانے کے لیے ماہِ محرم کی دسویں تاریخ کو خاص کر رکھا ہے۔ حالاں کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکرِ مبارک ایسی بابرکت چیز ہے کہ اس کو ہر وقت مسلمانوں کے رگ و پے میں سرایت کر جانا چاہیے تھا اور کوئی وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ سے خالی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ پھر نہ صرف یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ شریفہ اور معراج شریف ہی کا ذکر قابلِ بیان ہے بلکہ آپ کی ہر بات یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست و برخاست اور طعام و لباس اخلاق و عبادات، مجاہدات و ریاضات افعال و احکام اور اوامر و نواہی سب کا ہی تذکرہ کرنا مسلمان کے لیے نیکی اور باعثِ ثواب ہے، کیوں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا حتیٰ کہ حوائجِ ضروریہ میں مشغول ہونا سب ہی عبادت ہے اور نماز روزہ وغیرہ احکامات کی تبلیغ و تعلیم کرنا بھی عبادت میں شامل ہے۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان سب حالات کا بیان اور ذکر کرنا ذکرِ رسول میں داخل اور موجبِ برکت ہے۔ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کا ارشاد ہے کہ ہم تو ہر وقت ذکرِ میلاد کرتے ہیں،

کیوں کہ لا إله إلا الله محمد رسول الله (ﷺ) پڑھتے رہتے ہیں، اگر حضور ﷺ پیدا نہ ہوتے تو ہم یہ کیوں پڑھتے؟ تو کلمۂ طیبہ پڑھنا بھی آپ ﷺ کی ولادت کا ذکر کرنا ہے۔ غرضے کہ حضور ﷺ کا ذکر مبارک تو ہر وقت ہی ہونا چاہیے اور آپ ﷺ کی ہر ادا کا ذکر ہونا چاہیے، کیوں کہ محبّ کو محبوب کی ہر ادا پسند ہوتی ہے اور چوں کہ احکامِ شرعیہ اور اوامر ونواہی بھی سب حضور ﷺ کے واسطہ سے اور آپ ﷺ کے ہی طفیل امت کو عطا کیے گئے ہیں اس لیے احکامِ شرعیہ کا تذکرہ کرنا بھی آں حضرت ﷺ کا ہی تذکرہ کرنا ہے۔ صرف ولادتِ شریفہ ہی کو آں حضرت ﷺ کا تذکرہ سمجھنا بہت بڑی غلطی اور محبّت کی حقیقت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اگر حضور ﷺ سے محبّت ہے تو سمجھنا چاہیے کہ ذکرِ ولادت جس طرح آپ کا ذکر ہے ایسے ہی احکامِ شرعیہ اور اوامر ونواہی کا ذکر بھی آپ ﷺ ہی کا ذکر ہے۔

علامتِ محبّت: محبّت کی علامت بھی یہ ہے کہ محبوب کی ہر بات کا ذکر ہو، ولادت شریفہ کا بھی آپ ﷺ کی سخاوت کا بھی، عادات اور عبادات کا بھی اور اس میں کسی مہینہ اور تاریخ اور مقام کی کوئی خصوصیت نہیں ہے، بلکہ دوسرے وظیفوں کی طرح روزمرہ اس کا وظیفہ ہونا چاہیے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ اہلِ محرم کی طرح سال بھر میں مقررہ تاریخ پر یومِ میلاد منالیا جائے اور اس کے بعد پھر کچھ نہیں، حالاں کہ حضور ﷺ کا ذکر مبارک تو غذا ہے، یہ ہر وقت ہونا چاہیے اس میں کسی وقت کی تخصیص کی کیا ضرورت ہے؟ آپ ﷺ کے حالات مبارکہ میں جو صحیح کتابیں لکھی گئی ہیں ان کو ہمیشہ پڑھنا اور سننا اور آپ ﷺ کے ذکر کو اپنا وظیفہ بنانے کی ضرورت ہے۔ حضرت حکیم الامت کی کتاب "نشر الطيب في ذكر النبي الحبيب" اس مقصد کے لیے بہت مفید اور بابرکت ہے۔

ذکر کا نیا طریقہ: آج کل بعض مدعیانِ محبّت نے حضور ﷺ کے ذکر کا ایک نیا طریقہ نکالا ہے کہ ربیع الاول کی بارہویں تاریخ کو یومِ میلاد مناتے ہیں اور انھوں نے اس کا نام عید میلاد النبی رکھا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نیا طریقہ اصل میں عیسائیوں کے توڑ کے لیے ایجاد کیا گیا ہے؟

کہ جیسے وہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا دن مناتے ہیں اور ان کے یہاں بڑے دن کی خوشی قومی طرز پر ہوتی ہے، اسی طرح ان مدعیانِ نبوت نے بھی یومِ میلاد کو اپنی قومی شوکت کے اظہار کا دن بنالیا اور اس پر سیاسی رنگ چڑھا دیا ہے۔ اس نئے طریقے کے ایجاد کرنے والے چوں کہ اکثر انگریزی خواں اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے وہ اپنی ایجاد کا اس سے زیادہ کوئی ثبوت پیش نہیں کرسکتے کہ اس میں قومی شوکت کے اظہار کی مصلحت ہے اور دنیوی باوجاہت شخصیتوں کے اعزاز میں جلوس نکالنے اور خوشی منانے کو اس کے جواز اور مثال میں پیش کرنے کے سوا وہ اور کوئی شرعی دلیل اس پر پیش نہیں کرسکتے۔ حالاں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا میں تشریف آوری پر دنیوی طریقہ سے اظہارِ مسرت اور خوشی منانا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو دنیوی بادشاہوں اور لیڈروں کے ساتھ ملانا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبۂ عُلیا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نیچے لے جانا ہے۔ اس میں بارگاہِ رسالت کے ساتھ کس قدر گستاخی اور بے ادبی پائی جاتی ہے وہ اہلِ دانش پر پوشیدہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ پر فرح اور سرور کا شریعت نے حکم دیا ہے اور جو چیزیں شرعی طور پر مامور بہٖ ہوتی ہیں اس کو ذکر کرنا دین میں اصل ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ پر خوشی اور مسرت دین میں داخل ہے تو اس پر خوشی اور مسرت کے ظاہر کرنے کا جو طریقہ شریعت نے بتلایا ہو اس کے موافق اس کا اظہار کرنا چاہیے۔

مقامِ غور ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا جو دنیوی اُمرا اور حکام کے ساتھ کیا جاتا ہے جن کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارفع اور اعلیٰ شان کے ساتھ وہ نسبت بھی نہیں جو زمین کو آسمان کے ساتھ ہے۔ بارگاہِ نبوت میں بے ادبی اور گستاخی نہیں ہے؟

اب دیکھنا چاہیے کہ ولادتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر اظہارِ خوشی کا جو طریقہ آج کل رواج پاگیا ہے جس کو ''میلاد'' کہا جاتا ہے کیا یہ طریقہ اسی شرعی طریقہ کے موافق ہے جس کی تعلیم ہم کو دی گئی ہے؟

قرآن کریم سے آں حضرت ﷺ کی ولادت مبارکہ پر فرحت وسرور کا ثبوت:

قرآن کریم میں ہے:

﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ﴾[1]

(اے محمد ﷺ!) آپ فرما دیجیے کہ اللہ کے فضل اور رحمت ہی کے ساتھ بس صرف چاہیے کہ خوش ہوں (اس لیے) کہ وہ بہتر ہے اس شے سے کہ جس کو یہ لوگ جمع کرتے ہیں۔

اس آیت کے سیاق پر نظر کر کے تو فضل ورحمت سے مراد قرآن مجید ہے لیکن اگر ایسے معنی عام مراد لیے جائیں کہ قرآن مجید بھی اس کا ایک فرد رہے تو یہ زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ معنی ہے کہ فضل ورحمت سے حضور کا قدوم مبارک اور آپ کی دنیا میں تشریف آوری کو مراد لیا جائے۔ اس تفسیر کے موافق جتنی نعمتیں اور رحمتیں ہیں خواہ وہ دنیوی ہوں یا دینی ہوں اور اس میں قرآن مجید بھی ہے، سب اس میں داخل ہوجائیں گی، اس لیے کہ حضور ﷺ کا وجود باجود اصل ہے تمام دینی اور دنیوی نعمتوں کی، اور سرچشمہ ہے تمام رحمتوں اور فضل کا۔ اس طرح یہ تفسیر تمام تفسیروں کی جامع تفسیر ہوجائے گی۔

اس تفسیر کی بنا پر حاصل آیتِ مبارکہ کا یہ ہوگا کہ ہم کو حق تعالیٰ ارشاد فرمارہے ہیں کہ حضور ﷺ کے وجود باجود پر خوش ہونا چاہیے اس لیے کہ حضور ﷺ ہمارے لیے تمام نعمتوں کے واسطہ ہیں، خواہ وہ دنیوی نعمتیں ہوں یا دینی، جن میں سب سے بڑی دولت ایمان ہے جس کا حضور اکرم ﷺ کی بدولت ہم کو پہنچنا تو بالکل ظاہر ہے۔ غرضے کہ اصل الاصول تمام مواد فضل ورحمت کی حضور ﷺ کی ذات بابرکات ہوئی۔

اس لیے اس ذات بابرکات کے وجود پر جس قدر بھی خوشی اور فرح ہو کم ہے۔ بہرحال اس آیت سے عموماً یا خصوصاً نہایت بلیغ طور سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس نعمتِ عظیمہ پر خوش ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اول تو جار مجرور ﴿بِفَضْلِ اللّٰهِ﴾ کو مقدم لائے کہ جو مفید حصر ہے، اس کے بعد رحمت پر پھر حرف جار کا اعادہ فرمایا جس سے اس میں استقلال کا حکم پیدا ہوگیا۔ پھر

[1] یونس: ۵۸

اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کو مزید تاکید کے لیے ﴿فَبِذٰلِكَ﴾ سے مکرر ذکر فرمایا اور ذلك پر حرفِ جار اور فاء عاطفہ لائے تاکہ اس میں اور اہتمام ہو جائے۔ پھر نہایت اہتمام در اہتمام کی غرض سے ﴿فَلْيَفْرَحُوْا﴾ پر فاء لائے جو کہ مشیر ہے ایک شرط مقدّر کی طرف اور وہ إِنْ فَرِحُوْا بِشَيْءٍ ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ اگر کسی شے کے ساتھ خوش ہوں تو اللہ تعالیٰ ہی کے فضل ورحمت کے ساتھ پھر اسی کے ساتھ ہوں۔ یعنی اگر دنیا میں کوئی شے خوشی کی ہے تو یہی نعمت ہے اور اس کے سوا کوئی شے خوشی کے قابل نہیں ہے اور اس سے بدلالۃ النص یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ نعمت تمام نعمتوں سے بہتر ہے، لیکن چوں کہ ہم لوگوں کی نظروں میں دنیا اور دنیا کی ہی نعمتیں ہیں اور اسی میں ہم کو انہماک اور مشغولی ہے، اس لیے اس پر بس نہیں فرمایا، آگے اور نعمتوں پر اس کی فضیلت ثابت کرنے کے لیے صراحۃً ارشاد ہے ﴿هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۝﴾ یعنی یہ نعمت ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جن کو یہ لوگ جمع کرتے ہیں۔ یعنی دنیا بھر کی نعمتوں سے یہ نعمت افضل ہے اور بہتر ہے۔ یہ حاصل ہے اس آیت کا جو مبنی ہے اس تفسیر پر کہ فضل ورحمت سے حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی مراد لی جائے۔

حضور ﷺ کے وجود باجود پر فرحت کس بنا پر ہے:

قرآن کریم میں دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۝﴾[1]

حق تعالیٰ نے ایمان والوں پر احسان فرمایا کہ ان میں ایک رسول ان کی جنس سے بھیجا کہ وہ ان پر ان کی آیتیں تلاوت کرتے ہیں، اور ان کو (ظاہری وباطنی) نجاستوں (گندگیوں) سے پاک کرتے ہیں، اور ان کو کتاب وحکمت سکھاتے ہیں، اور بے شک وہ اس سے پہلے ایک کھلی گمراہی میں تھے۔

[1] آل عمران: ۱۶۴

اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کو مزید تاکید کے لیے ﴿فبذلك﴾ سے مکرر ذکر فرمایا اور ذلك پر حرفِ جار اور فاء عاطفہ لائے تاکہ اس میں اور اہتمام ہو جائے۔ پھر نہایت اہتمام در اہتمام کی غرض سے ﴿فَلْيَفْرَحُوْا﴾ پر فاء لائے جو کہ مشیر ہے ایک شرط مقدر کی طرف اور وہ إِنْ فَرِحُوْا بِشَيْءٍ ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ اگر کسی شے کے ساتھ خوش ہوں تو اللہ تعالیٰ ہی کے فضل و رحمت کے ساتھ پھر اسی کے ساتھ ہوں۔ یعنی اگر دنیا میں کوئی شے خوشی کی ہے تو یہی نعمت ہے اور اس کے سوا کوئی شے خوشی کے قابل نہیں ہے اور اس سے بدلالۃ النص یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ نعمت تمام نعمتوں سے بہتر ہے، لیکن چوں کہ ہم لوگوں کی نظروں میں دنیا اور دنیا کی ہی نعمتیں ہیں اور اسی میں ہم کو انہماک اور مشغولی ہے، اس لیے اس پر بس نہیں فرمایا، آگے اور نعمتوں پر اس کی فضیلت ثابت کرنے کے لیے صراحۃً ارشاد ہے ﴿هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۝﴾ یعنی یہ نعمت ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جن کو یہ لوگ جمع کرتے ہیں۔ یعنی دنیا بھر کی نعمتوں سے یہ نعمت افضل ہے اور بہتر ہے۔ یہ حاصل ہے اس آیت کا جو مبنی ہے اس تفسیر پر کہ فضل و رحمت سے حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی مراد لی جائے۔

حضور ﷺ کے وجود باجود پر فرحت کس بنا پر ہے:

قرآن کریم میں دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۝﴾[1]

حق تعالیٰ نے ایمان والوں پر احسان فرمایا کہ ان میں ایک رسول ان کی جنس سے بھیجا کہ وہ ان پر ان کی آیتیں تلاوت کرتے ہیں، اور ان کو (ظاہری و باطنی) نجاستوں (گندگیوں) سے پاک کرتے ہیں، اور ان کو کتاب و حکمت سکھاتے ہیں، اور بے شک وہ اس سے پہلے ایک کھلی گمراہی میں تھے۔

[1] آل عمران: ١٦٤

اس آیتِ مبارکہ میں ﴿ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ ﴾ الآیۃ سے صاف معلوم ہورہا ہے کہ اصل شے خوشی کی اور ما بہ الفرح والمنۃ یہ ہے کہ حضور ﷺ ہمارے لیے سرمایۂ ہدایت ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حضور ﷺ کے متعلق خوش ہونے کی بہت سی چیزیں ہیں۔ مثلاً حضور ﷺ کی ولادت، اور حضور ﷺ کی بعثت، اور حضور ﷺ کے دیگر تمام حالات، مثلاً: معراج شریف وغیرہ، یہ سب حالات واقعی خوش ہونے کے ہیں لیکن اس حیثیت سے کہ ہمارے لیے یہ مقدمات ہیں ہدایت وسعادتِ ابدی کے۔ چناں چہ اس آیت سے صاف ظاہر ہے، اس لیے کہ اس میں بعثت کے ساتھ یہ صفات بھی بڑھائی گئی ہیں: ﴿یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ﴾ الآیۃ پس بقاعدۂ بلاغت ثابت ہوتا ہے کہ اصل ما بہ المنۃ یہ صفات ہیں۔ باقی ولادت شریفہ یا معراج شریف وہ باعثِ خوشی زیادہ اسی لیے ہیں کہ مقدمات ہیں اس دولتِ عظیمہ کے حصول کے، اس لیے کہ اگر ولادتِ شریفہ نہ ہوتی تو ہم کو یہ نعمتِ عظیمہ کیسے ملتی؟

ذکرِ ولادتِ شریفہ اور ذکرِ نبوتِ شریفہ میں بڑا فرق ہے: اس آیت مبارکہ میں اس مقصود کا ذکر تصریحاً اور قصداً فرمایا گیا ہے اور دوسری آیت میں حضور ﷺ کے وجود باجود کا ذکر اشارتاً وضمناً فرمایا ہے۔ چناں چہ ارشاد ہے: ﴿ لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِیْ سَكْرَتِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ﴾[1] اسی میں حضور ﷺ کی بقا اور آپ ﷺ کے وجودِ مقدس کو مقسم بہ بنایا گیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ قسم میں جواب قسم مقصود ہوتا ہے اور مقسم بہ کو تبعاً ذکر کیا جاتا ہے۔ اور ایک مقام پر حضور ﷺ کی ولادتِ شریفہ کو بھی اسی طرح ذکر فرمایا ہے، فرماتے ہیں: ﴿لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۙ﴾[2] کی تفسیر میں بعض مفسرین کا قول ہے کہ اس کی مصداق حضور ﷺ کی ذات والا صفات ہے۔ مگر اس اہتمام سے اس کا ذکر نہیں فرمایا گیا جیسا کہ آیت ﴿لَقَدْ مَنَّ﴾ الآیۃ میں نبوت وبعثت اور تعلیم وتزکیہ کو بیان فرمایا گیا ہے۔

---

[1] الحجر: ۷۲ [2] البلد: ۱-۳

نبوت شریفہ پر ولادتِ شریفہ سے زیادہ خوش ہونا چاہیے: اسی وجہ سے فرحت وسرور میں بھی تفاوت ہوگا کہ جس قدر ولادتِ شریفہ پر فرحت وسرور ہو اس سے زائد نبوت شریفہ پر ہونا چاہیے، کیوں کہ قرآن مجید سے ثابت ہو رہا ہے کہ زیادہ اہتمام کے قابل اور اصل ما بہ الممنة اور فرح وسرور کا باعث نبوت وبعثت ہے، اسی لیے نبوت وبعثت کا ذکر بہ نسبت ولادت شریفہ کے ذکر کے زیادہ اہتمام کے لائق ہوا، اور نبوت وبعثت ہی اس قابل ہے کہ اس پر سب سے زیادہ مسرت وخوشی کا اظہار کیا جائے۔ شاید اس فرق کی وجہ سے ہی قرآن کریم میں جس اہتمام اور صراحت کے ساتھ نبوت وبعثت کا ذکر فرمایا گیا ہے اس اہتمام وصراحت کے ساتھ آں حضور ﷺ کی ولادت شریفہ کا ذکر نہیں فرمایا گیا، بلکہ اس کا ذکر اشارتاً یا اجمالاً ہی فرمایا گیا ہے، جیسا کہ اوپر گزرا ہے۔

قصۂ ولادت یحییٰ وعیسیٰ علیہما السلام کے قرآن مجید میں مذکور ہونے سے استدلال کا جواب:

ان دونوں حضرات کے قصۂ ولادت کو اہتمام سے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں حضرات کی ولادت ایک عجیب طریقہ سے خرق عادت کے طور پر ہوئی ہے۔ یحییٰ علیہ السلام کے والد ماجد اور والدہ ماجدہ بوڑھے بہت تھے کہ اسباب ظاہرہ کے اعتبار سے ان میں صلاحیت ہی توالد وتناسل کی نہ رہی تھی۔ چناں چہ ارشاد ہے: ﴿وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ﴾[1] اس لیے ایسی حالت میں انسان کی ولادت عجیب تھی۔ اور عیسیٰ علیہ السلام بے باپ کے پیدا ہوئے تھے اس لیے ان کی ولادت اس سے بھی زیادہ عجیب تر اور خارقِ عادت تھی۔

اس واسطے حق تعالیٰ جل شانہ نے ان دونوں قصوں سے اپنی قدرت اور توحید پر استدلال فرمایا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ دونوں قصوں کو اہتمام سے قرآن مجید میں ذکر فرمایا گیا۔ اور حضور ﷺ کی ولادت شریفہ چوں کہ عادت اللہ کے موافق والدین کے ذریعے بطریق معہود ہوئی ہے اس لیے آں حضرت ﷺ کی ولادت شریفہ کے ذکر کا اس قدر اہتمام قرآن مجید میں نہیں فرمایا گیا۔ اب دونوں پیغمبروں کے ذکرِ ولادت کے اہتمام پر آں حضرت ﷺ کے ذکرِ ولادت کو

[1] الأنبیاء: ۹۰

قیاس کرکے اس کے اہتمام ذکر کو ثابت کرنا قیاس مع الفارق ہونے کی وجہ سے صحیح نہیں ہے۔

حضور ﷺ کی ولادت شریف بطریق متعارف ہونے میں حکمت حضور ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری اور آپ کی ولادت مبارکہ اسی طرح ہوئی جس طرح عادت اللہ جاری اور معروف طریقہ ہے۔ خرقِ عادت کے طور پر غیر معروف اور غیر متعارف طریقہ سے آپ ﷺ کی ولادت مبارکہ نہ ہونے میں ایک حکمت یہ ہے کہ آدمی کو زیادہ انس اس سے ہوتا ہے جس سے کچھ مناسبت ہو اور قاعدہ ہے کہ جس قدر مناسبت زیادہ ہوگی انس بھی زیادہ ہوگا اور جس قدر مناسبت کم ہوگی اسی قدر وحشت بڑھے گی۔ اس واسطے آدمی کو اپنے ہم جنس کی طرف زیادہ میلان ہوتا ہے اور جانوروں کی طرف کم ہوتا ہے اور جنوں سے اور بھی کم بلکہ وحشت ہے اور اسی وجہ سے انبیا علیہم السلام سب آدمی اور انسان ہوئے ہیں۔ فرشتوں کو نبی بنا کر نہیں بھیجا گیا اس لیے کہ ان سے انسانوں کو وحشت ہوتی اور افادہ اور استفادہ ممکن نہ ہوتا۔ اس لیے سب رسول انسان ہوئے ہیں اور اس لیے بجز معجزات کے حضور ﷺ کی اور کوئی حالت ولادت وغیرہ بھی معمول کے خلاف نہیں بنائی گئی۔ اس لیے کہ اگر عادتِ جاریہ اور متعارف طریقہ کے ذرا بھی خلاف کوئی بات ہوتی تو مناسبت میں اور پھر اس کے سبب انس ومحبت میں ضرور کمی آجاتی ہے۔ اس سے غرضِ محبت افادہ اور استفادہ میں نقصان آتا اس لیے آں حضور ﷺ کی ولادت مبارکہ کسی نئے طرز سے نہیں ہوئی اور یہی آپ ﷺ کی شانِ محبوبیت اور افادہ کے لیے زیادہ مناسب ہے۔ اس کے خلاف کو ثابت کرنا اس حکمتِ مذکورہ کو نظر انداز کرتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مدارِ منت اور فرحت وسرور کا شان ﴿يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ﴾[1] ہے اور ولادت شریفہ نیز نشو ونما کے واقعات کی خوشی بھی اس واسطے ہے کہ وہ واسطہ ہیں اس دولت کی تحصیل کا۔ پس اصل میں تو مقصود چاند کا کامل ہونا اور اس کی حالت ہدایت کی ہے لیکن پہلے دن کے چاند اور ہلال ہونے کی خوشی بھی اسی واسطے ہے کہ وہ ذریعہ ہے کامل ہونے اور ہدایت کا، اس لیے اصل سرور اور مسرت تو اس لیے ہے کہ ہم کو حضور ﷺ نے دین کی بڑی

[1] آل عمران: ۱٦٤

نعمت عطا فرمائی، باقی اس کے جس قدر اسباب ہیں وہ چوں کہ واسطے ہیں اس لیے ان سے بھی خوشی اور مسرت ہے۔

اظہارِ خوشی کا صحیح طریقہ: یہ تو واضح ہوگیا کہ حضور ﷺ کے وجود باجود اور ولادتِ مبارکہ پر فرحت اور خوشی کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔ اب یہ سمجھنا چاہیے کہ اس فرحت کے اظہار کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

سو جاننا چاہیے کہ اس آیت کے مضمون پر جس طرح امت کے لیے عمل کرنا ضروری تھا اسی طرح اس فرحت کے اظہار کا طریقہ وہی صحیح ہوگا جس طریقہ پر خود آں حضور ﷺ نے عمل کر کے اس کو ظاہر فرمایا ہوگا۔

دیکھنا چاہیے کہ حضور ﷺ نے اس فرحت وخوشی کو کس طریقہ سے ظاہر فرمایا ہے۔ کیا آپ کی سیرتِ مقدسہ یا آپ کے بعد آپ کے خلفائے راشدین کی سیرت میں کہیں اظہارِ مسرت کے اس طریقہ کا ذکر ملتا ہے جس کو آج کل کے بعض مدعیانِ محبت نے عید میلاد کے نام سے ایجاد کیا ہے؟ اور یومِ ولادت کو انھوں نے عید بنا لیا ہے؟ سوال یہ ہے کہ آپ کے جانشین، خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو کہ حضور ﷺ کی صحبتِ مقدسہ کو اٹھائے ہوئے تھے اور تمام عالم سے زیادہ قرآن مجید اور آں حضرت ﷺ کے منشائے مبارک کو سمجھتے تھے۔ آخر ان کی سمجھ میں اظہارِ مسرت کا یہ طریقہ کیوں نہیں آیا؟ جب کہ آں حضرت ﷺ کی محبت بھی ان حضرات کے رگ وپے میں سرایت کیے ہوئی تھی، اور اتباع کے جذبہ سے بھی ان کے قلوب معمور تھے۔ اسی طرح تابعین جن میں بڑے بڑے مجتہد ہوئے ہیں ان کی نظر بھی یہاں تک کیوں نہیں پہنچی؟

بدعت وسنت کے پہچاننے کا قاعدۂ کلیہ: ظاہر ہے کہ ولادتِ نبوی ﷺ باعثِ خوشی اور اظہارِ مسرت کا سبب ہے اور اسی خوشی کے اظہار کے لیے آج کل یہ نیا طریقہ ایجاد کیا گیا ہے کہ اس دن کو عید مناتے ہیں اور جلوس وغیرہ نکالتے ہیں، اور یہ سبب حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے بھی موجود تھا۔ جب خود آں حضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کی

ولادت مبارکہ کی خوشی اور مسرت کا اظہار اس طرح نہیں کیا اور یوم ولادت کو عید نہیں بنایا اور نہ ہی اس دن میں جلوس وغیرہ نکالا تو یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ شریعت میں اظہارِ خوشی کا یہ طریقہ درست نہیں ہے ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس طریقہ پر اظہارِ خوشی کر کے اس کا جواز ضرور بتلا دیتے، یہی ایک دلیل کافی ہے اس عید میلاد کے بدعت ہونے اور حدیث: مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ (جس شخص نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی چیز ایجاد کی جو دین نہیں ہے، وہ مردود ہے) میں داخل ہو کر واجب الرّد ہونے کی۔

البتہ جس چیز کا سببِ جدید ہو اور وہ چیز کسی ضروری امر کے لیے موقوف علیہ ہو کہ اس کے بغیر مامور بہ پر عمل نہ ہو سکتا ہو، جیسے کتبِ دینیہ کی تصنیف وتدوین اور مدارس وخانقاہ کی بنا وتعمیر کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے بعد ان کی ضرورت پیش آئی اور ان کا سببِ جدید پیدا ہوا کیوں کہ دین کی حفاظت سب کے ذمہ ضروری ہے، کتبِ دینیہ اور مدارس وخانقاہوں کے بغیر اس کی حفاظت کی کوئی صورت نہ تھی، اس لیے علمائے کرام نے حدیث، اصولِ حدیث، فقہ، اصولِ فقہ اور عقائد کی کتابیں لکھیں اور ان کی تعلیم وتدریس کے لیے مدارس تعمیر کیے اور باطنی نسبتِ سلسلہ اور تعلق مع اللہ کے باقی رکھنے اور تربیت کے لیے مشائخ عظام نے خانقاہیں بنائیں۔ بہر حال یہ چیزیں وہ ہیں جن کا سبب جدید ہے اور وہ سب خیر القرون کے زمانہ کے بعد پیدا ہوا ہے اس لیے بظاہر نظر دیکھنے میں یہ چیزیں بدعت اور نئی معلوم ہوتی ہیں، لیکن واقع میں بدعت نہیں ہیں بلکہ حسبِ قاعدہ مقدمۃ الواجب واجب قرار پائیں۔ یہ قاعدۂ کلیہ ہے بدعت اور سنت کے پہچاننے کا، اس سے تمام جزئیاتِ مختلفہ کا حکم معلوم کیا جاسکتا ہے۔

رسمِ میلاد کی تردید دلائل سے: شریعت کے دلائل چار ہیں: کتاب وسنت، اجماع وقیاس۔

اوّل کتاب اللہ کو سمجھیے۔ حق تعالیٰ جلّ شانُہٗ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ﴾[1]

یعنی کیا ان کے لیے شرکا ہیں کہ انھوں نے دین کی وہ بات مقرر کر دی جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی۔

---

[1] الشوریٰ: ۲۱

یہ آیت صاف بتلارہی ہے کہ دین کی بات بدوں اذن الٰہی (یعنی بغیر دلیل شرعی) کسی کو مقرر کرنا مذموم و مستنکر ہے۔ یہ تو دلیل کا کبریٰ ہے اور صغریٰ یہ ہے کہ عید میلاد کو دین کی بات سمجھ کر ہی بغیر دلیل کے مقرر کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ نتیجہ واضح ہے کہ عید میلاد بدعت اور واجب الترک ہے۔

اب حدیث لیجیے۔ حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ.

جو شخص ہمارے اس دین میں وہ شے نکالے جو اس میں نہیں ہے پس وہ واجب الرد ہے۔

اور مراد نئی شے سے وہ ہے جس کا سبب قدیم ہو اور پھر اس وقت اس پر عمل نہ کیا گیا ہو، باقی جس کا سبب جدید ہو اور وہ موقوف علیہ کسی مامور بہ کا ہو وہ بدعت میں داخل نہیں ہے جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔

اور یہ واضح ہے کہ عید میلاد کا سبب خواہ ولادتِ نبویہ علی صاحبھا الصلاۃ والتحیۃ پر خوشی اور مسرت ہو یا اسلام کی شوکت اور عظمت کا اظہار اس کا سبب بتلایا جائے۔ بہر حال ان میں سے جو بھی سبب قرار دیا جائے وہ قدیم ہے یعنی فرحت و سرور اور شوکتِ اسلام کے اظہار کی زمانہ خیر القرون میں بھی ضرورت تھی بلکہ اس وقت سے کچھ زیادہ ہی ضرورت تھی مگر حضور ﷺ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بلکہ خیر القرون کے زمانہ میں کسی نے بھی اس پر عمل نہیں کیا، تو معلوم ہوا کہ یہ نئی چیز اور بدعت واجب الترک ہے۔

دوسری حدیث: حضور ﷺ فرماتے ہیں: ''میری قبر کو عید مت بناؤ''۔

اس حدیث میں غیر عید کو عید منانے کی ممانعت فرمائی گئی ہے اور مطلب یہ ہے کہ قبر شریف پر عید کی طرح تاریخ معیّن کر کے اہتمام کے ساتھ جمع ہونا منع ہے اس لیے روضۂ اقدس پر حاضری کے لیے کوئی خاص تاریخ معیّن نہیں ہے۔ آگے پیچھے قافلے جاتے ہیں اور زیارت کر کے چلے آتے ہیں، نہ زیارت کی کوئی تاریخ معیّن ہے اور نہ اہتمام عید کا سا ہے۔ اس لیے اس سے قبر مبارک کی زیارت کی ممانعت نہیں ثابت ہوتی، بلکہ زیارت کا مستحب ہونا دوسری حدیثوں سے ثابت ہے۔ اس حدیث سے عید میلاد کی نفی نہایت واضح ہے۔ اول

بطورِ مقدمہ کے جاننا چاہیے کہ آں حضور ﷺ کی قبر مبارک کے لیے بہت کچھ شرف اور فضیلت حاصل ہے، اس لیے کہ جسدِ اطہر اس کے اندر موجود ہے، بلکہ حضور ﷺ خود مع تلبس الروح (روح کے تعلق کے ساتھ) اس کے اندر تشریف فرما ہیں، کیوں کہ آپ ﷺ قبرِ مبارک میں زندہ ہیں، قریب قریب تمام اہلِ حق کا اس پر اتفاق ہے۔ جب حضور ﷺ کا جسدِ اطہر قبر مبارک میں روح مبارک سمیت محفوظ ہے اور علما نے تصریح کی ہے کہ زمین مبارک کا وہ بقعہ جس سے جسم مبارک مع روح کے مَس (ملا ہوا ہے) کیے ہوئے ہے وہ عرش سے بھی افضل ہے، کیوں کہ عرش پر (معاذ اللہ) حق تعالیٰ جل شانہٗ بیٹھے ہوئے تو نہیں، اس کو صرف اسی وجہ سے دوسرے مقامات پر فضیلت ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی تجلّی گاہ ہے، اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی مخلوق میں حضور ﷺ سے زیادہ کون تجلّی گاہِ الٰہی ہوگا، اور رسول اللہ ﷺ کے واسطے سے قبر مبارک پر تمام مکانات سے زیادہ حق تعالیٰ کی تجلیات فائض ہوتی ہیں اس حیثیت سے بھی قبر مبارک کا وہ بقعہ جس سے جسم مبارک ملا ہوا ہے عرش وغیرہ تمام جگہوں سے افضل ہے۔

یہ تو ایک مقدمہ ہوا کہ بقعہ شریف اور قبر شریف تمام مکانات سے افضل ہے۔ اب اس مقدمہ کے بعد یہ سمجھنا چاہیے کہ قبر شریف تو بلا اختلاف بعینہٖ باقی ہے، اس میں کسی کو بھی شک نہیں ہوسکتا اور ولادت اسی طرح معراج وغیرہ کے دن یقیناً باقی نہیں ہیں، کیوں کہ زمانہ غیر قار ہے یعنی اس کو قرار نہیں ہوتا اور وہ بدلتا رہتا ہے، اس لیے وہ دن جس میں حضور ﷺ کی ولادت ہوئی تھی اب وہ بعینہٖ نہیں لوٹتا بلکہ اس کا مثل لوٹتا ہے۔ دوسرا مقدمہ یہ ہوا۔

اس کے بعد سمجھو کہ جب حضور ﷺ نے قبر مبارک کو عید بنانا جو کہ بعینہٖ باقی ہے منع فرما دیا اور اس کا عید بنانا ناجائز ہوگیا تو ان دنوں کا عید بنانا جو کہ بعینہٖ باقی نہیں ہیں کیوں کر جائز ہوسکتا ہے؟ اور جب اپنی طرف سے عیدِ مکانی (یعنی قبر کی عید بنانے) کو منع فرما دیا گیا تو عید زمانی خود کسی دن کو عید منانے سے کیوں منع نہیں کیا جائے گا؟ اس تقریر سے صراحۃً عید میلاد کا ناجائز ہو جانا ثابت ہوجاتا ہے۔

یہ تو قرآن وحدیث سے اس عید میلاد کی ممانعت کا ثبوت تھا، اب رہا اجماعِ اُمت سو

اس سے بھی اس کی ممانعت ثابت ہے۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ اصول کا قاعدہ ہے کہ تمام امت کا کسی کام کے ترک پر متفق ہونا یہ اجماع ہوتا ہے عدم جواز پر۔ چناں چہ فقہا نے جا بجا اس قاعدہ سے استدلال کیا ہے اور اسی بنا پر نمازِ عیدین میں نہ اذان کہی جاتی ہے نہ تکبیر (اقامت)، اگر یہ قاعدہ مسلّم نہیں ہے تو کیا عیدین کی نماز میں اذان اور تکبیر کا اضافہ کر دینا جائز ہوگا؟ اور اگر مسلّم ہے تو اس قاعدہ سے اور جگہ بھی کام لینا چاہیے۔

جب زمانِ سابق میں جب تک کہ یہ عید میلاد ایجاد نہیں کی گئی تھی اس کے ترک پر تمام امت کا اتفاق ہو چکا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ عید میلاد ناجائز اور منع ہے۔ جیسا کہ عیدین کی نماز میں اذان اور تکبیر کا کہنا اسی دلیل سے ممنوع ہے اور بعد کے زمانہ میں اس عید کو ایجاد کر کے اس اتفاق کو رفع نہیں کیا جا سکتا جو زمانِ سابق میں متحقق ہو چکا ہے، ورنہ تو پھر آج اس زمانے میں کوئی شخص عیدین کی نماز میں اذان و تکبیر کا اضافہ کر کے کہہ سکتا ہے کہ اس میں اختلاف ہو گیا اور اب زمانِ سابق کا وہ اتفاق رفع ہو گیا جو آج تک اس کے ترک پر چلا آ رہا ہے۔

مُوجدینِ عید میلاد کے دلائل اور ان کا جواب: عید میلاد کے ناجائز اور بدعت ہونے کے دلائل کے بعد اب بعض ایسے دلائل کا ذکر کیا جاتا ہے جن سے اس عید کے ایجاد کرنے والے بالکل ناآشنا اور ناواقف ہیں، مگر بعض بدعت پسند عربی خوانوں نے اس بدعت کی تائید میں ان کو پیش کیا ہے یا وہ پیش کر سکتے ہیں اور اس طرح موجدینِ عید میلاد کے ہاتھوں میں انھوں نے دلائل دینے کی کوشش کی ہے۔

اول: وہ آیت ﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا﴾[1] سے اس طرح استدلال کر سکتے ہیں کہ اس آیت سے فرحت کا حکم ثابت ہوا، اور یہ بھی اظہارِ فرحت کے لیے ہے لہٰذا جائز ہے۔ جواب ظاہر ہے کہ اس آیت سے فقط فرحت کا حکم ثابت ہوتا ہے اور گفتگو اس خاص متعارف طریقۂ عید میلاد میں ہے، اس سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔

اگر اس کلیہ میں اس کا داخل کرنا صحیح ہو تو کتبِ فقہ میں جن بدعات کو رو کا گیا ہے وہ بھی کسی ایسے

[1] یونس: ۵۸

ہی کلیہ میں داخل ہوسکتی ہیں، تو پھر کیا ان کو بھی جائز کہا جائے گا؟ حالاں کہ کتب فقہ میں
فریقین کے نزدیک مسلّم ہیں ان بدعات کی ممانعت صراحۃً مذکور ہے۔ ہم جس بات کو منع کرتے
ہیں وہ ہیئت خاصہ ہے، اور جو فرحت آیت ﴿فَلْيَفْرَحُوْا﴾ سے ثابت ہوتی ہے وہ فرحت
مطلقہ ہے، پس اہلِ بدعت یہ سمجھتے ہیں کہ ہم فرحت کو منع کرتے ہیں حالاں کہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ
اگر غور سے کام لیا جائے تو ہم اس فرحت پر زیادہ عمل کرتے ہیں، اس لیے کہ موجدین تو سال بھر
میں ایک ہی مرتبہ خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور گویا ان کے نزدیک اظہارِ خوشی کا یہی طریقہ متعین
ہے اور اس کے بغیر خوشی کا اظہار ہوتا ہی نہیں، اس لیے جو شخص ان کے مقررہ طریقہ کے موافق
خوشی کا اظہار نہیں کرتا اس کو سمجھتے ہیں کہ اس نے خوشی کا اظہار کیا ہی نہیں اور ہم ہر وقت اس
فرحت پر عامل ہیں جس کا حکم اس آیت میں فرمایا گیا ہے، اس لیے کہ اہلِ حق ایمان کی خوشی
سے ہر وقت دلشاد اور فرحاں رہتے ہیں اور اس کا اس آیت میں امر فرمایا گیا ہے۔

دوسرا استدلال موجدین کا اس حدیث سے ہوسکتا ہے کہ جب ابولہب نے حضور ﷺ کی
ولادت کی خبر سنی تو اس نے خوشی میں آکر ایک باندی آزاد کردی تھی اور اس پر ابولہب کی
جہنم کی سزا میں تخفیف ہوگئی۔ جواب اس کا بھی ظاہر ہے کہ ہم نفسِ فرحت کے منکر نہیں گفتگو
تو اس نئی ایجاد شدہ خاص ہیئت میں ہے۔ اس واقعہ میں صرف فرحت کا ثبوت ہوتا ہے۔
اس ہیئتِ جدیدہ کا نام ونشان نہیں ہے۔

تیسرا استدلال اس آیت سے ہوسکتا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: ”اے اللہ! ہم پر آسمان سے
خوان نازل فرما کہ وہ ہمارے لیے عید بن جائے۔ ہمارے پہلوں کے لیے اور ہمارے پچھلوں
کے لیے اور ایک نشانی قدرت کی آپ کی طرف سے“۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ عطائے
نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اور پہلی امتوں کی شریعت بھی ہم پر رحمت ہے۔ اگر اس
پر ہماری شریعت میں رد وانکار نہ کیا گیا ہو، اور حضور ﷺ کی ولادت ظاہر ہے کہ نعمتِ عظیمہ
ہے، پس آپ کی تاریخ ولادت کو عید بنانا جائز ہوگا۔

جواب اس کا یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ اس امر پر رد وانکار اسی جگہ ہو جہاں وہ منقول ہے۔

دیکھیے قرآن مجید میں جس جگہ سجدۂ تعظیمی منقول ہے اس جگہ اس پر رد وانکار نہیں فرمایا گیا بلکہ اس کی حرمت کے دلائل دوسرے مقام پر ذکر کیے گئے ہیں۔ اسی طرح جو آیات واحادیث ہم نے عید بنانے کی ممانعت میں اپنے دلائل میں بیان کی ہیں وہ سب اس پر رد وانکار کے دلائل ہیں۔ یہ جواب تو اس صورت میں ہے جب کہ آیت کے یہ معنیٰ صحیح تسلیم کر لیے جائیں جو بیان کیے گئے ہیں ورنہ اس آیت سے یہ مطلب ثابت ہی نہیں ہوتا کہ نزول مائدہ کی تاریخ کو عید بنایا جائے گا۔ اس لیے کہ تکون کی ضمیر المائدة کی طرف راجع ہے، نہ یوم کی طرف، اس سے یوم نزولِ مائدہ مراد لینا مجاز ہوگا، اور معنیٰ حقیقی کو بلاوجہ ترک کرنا درست نہیں۔ اس لیے صحیح معنیٰ یہ ہیں: تَكُوْنُ الْمَائِدَةُ سُرُوْرًا لَنَا. یعنی وہ مائدہ ہمارے لیے سرور کا باعث ہو جائے، اور یہ معنیٰ درست نہیں ہیں کہ وہ دن ہمارے لیے عید اور باعثِ سرور بن جائے۔ اور اس جگہ عید کے متعارف معنیٰ مراد نہیں ہیں بلکہ عید سے مطلق سرور مراد ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ مائدہ ہمارے پچھلوں کے لیے سرمایۂ سرور بن جائے کہ اس نعمت پر ہمیشہ شاداں وفرحاں اور شاکر رہیں۔

لطیفہ: شائقینِ متعہ کے لیے جہاں م، ت، ع آتا ہے اس سے وہ متعہ کا ثبوت مہیا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے نزدیک شیخ سعدی کے شعر ع

تمتع زہر گوشہ یافتم

سے بھی شاید متعہ نکلتا ہے اور آیت ﴿رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ﴾[1] کے بھی یہی معنیٰ ہوں گے کہ اے رب ہمارے! بعض نے بعض سے متعہ کیا ہے۔ ایسے ہی شائقینِ عید میلاد نے اس آیت میں ع، ی، د دیکھ کر اس سے عید میلاد کا ثبوت مہیا کرنے کی کوشش کی ہے۔

چوتھا استدلال اس قصہ سے ہو سکتا ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ جب آیت ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾[2] الآیة نازل ہوئی تو ایک یہودی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اگر یہ آیت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید بنا لیتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یہ آیت عید کے ہی دن نازل ہوئی ہے، یعنی جمعہ اور عرفہ کو نازل ہوئی ہے۔ اور ''ترمذی شریف'' میں ہے کہ حضرت

[1] الأنعام: ۱۲۸ [2] المائدة: ۳

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے: نزلت في يوم جمعة ويوم عرفة.

تقریرِ استدلال اس حدیث سے یہ ہوسکتی ہے کہ حضرت عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہ نے عید بنانے پر انکار نہیں فرمایا۔ معلوم ہوا کہ عطائے نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے۔ اس کا ایک جواب تو یہی ہے کہ انکار کا اس جگہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ چناں چہ ہمارے فقہا نے عرفہ کے دن حاجیوں کی مشابہت سے جمع ہونے پر انکار فرمایا ہے حالاں کہ یہ بھی ایک عید ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شجرۂ حدیبیہ پر اجتماع کا انکار کہ وہ بھی مشابہ عید کے تھا، منقول ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسی عید بنانے کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ''بخاری'' اور ''مسلم'' میں ہے: لَيْسَ التَّحْصِيْبُ بِشَيْءٍ. (وادیٔ محصب میں قیام کرنا کوئی چیز نہیں ہے۔) حالاں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وادی میں قیام منقول ہے، لیکن صرف اتنی بات کی وجہ سے کہ کوئی شخص عادت کو عبادت نہ سمجھ لے اس پر یہ انکار فرمایا، تو غیر منقول کو عبادت سمجھنا ان کے نزدیک کس قدر قابلِ انکار ہوگا۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو تعریف یعنی عرفہ کے دن جمع ہونا منقول ہوا ہے وہ بھی یا تو اسی علت سے معطل ہے جس پر تحصیب کے بارے میں ان کا فتویٰ دلالت کررہا ہے کہ اس جمع ہونے کو عبادت نہ سمجھا جائے، یا بغیر التزام اور اہلِ عرفات کے ساتھ بغیر تشبیہ کے قصدِ دعا کے ساتھ مُؤَوّل ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ وہ شخص مسلمان نہیں تھا یہودی تھا اس کو اس فرعی مسئلہ کے بتلانے کی حاجت نہیں تھی کہ عید بنانا کیسا ہے؟ بلکہ اس کو ایک خاص طرز پر جواب دیا کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ ایسی نعمتِ عظمیٰ کے ملنے پر عید نہیں ہوئی، یہ غلط ہے۔ ہمارے یہاں اس روز پہلے ہی سے عید تھی۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو اس جواب سے خود معلوم ہوتا ہے کہ عید بنانا جائز نہیں، یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ ہے کہ ہماری شریعت میں چوں کہ ایسے اسباب سے عید کرنا درست نہ تھا اور اللہ تعالیٰ کو اس آیت کے نزول کے دن کو عید کرنا مقصود تھا اس لیے اس کو ایسے ہی دن میں نازل فرمایا کہ عید بھی ہو جائے اور از خود عید بنانے کی بدعت سے بھی حفاظت ہو جائے۔

پانچواں استدلال: وہ اس حدیث سے کرسکتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے پیر کے دن روزہ رکھا۔ کسی نے وجہ پوچھی تو یہ ارشاد فرمایا:

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ وُلِدْتُ فِيْهِ.

میں اس دن پیدا ہوا ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ولادت کے دن میں قُربات کا ادا کرنا مشروع ہے، اور فرح وسرور، اجتماع للذکر وتقسیم طعام یا شیرینی یہ سب قربات ہیں، پس یہ بھی مشروع ہوں گے۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ تسلیم نہیں کہ یوم ولادت ہونا روزہ رکھنے کی علت ہے۔ اس لیے کہ دوسری حدیث میں اس کی علت یہ منقول ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جمعرات اور پیر کے دن نامۂ اعمال پیش ہوتے ہیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ میرے اعمال روزہ کی حالت میں پیش ہوں۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ روزہ کی علت تو اعمال نامہ پیش ہونا ہے اور ولادت کا ذکر بطورِ حکمت کے فرما دیا گیا ہے، دار و مدار حکم کا علت ہوتی ہے نہ کہ حکمت، اب اس پر قیاس کر کے دوسرے قربات کو ثابت کرنا کیسے درست ہوسکتا ہے؟ اس لیے کہ حکمت کے ساتھ حکم دائر نہیں ہوتا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ بالفرض اگر علت حکم بھی ہو تو غور کرنا چاہیے کہ یہ علت کی کون سی قسم ہے کیوں کہ علت کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ علت جو اپنے مَورِد کے ساتھ خاص ہوتی ہے اور ایک وہ جس کا تعدیہ دوسری جگہ ہوتا ہے۔ اگر یہ علت متعدیہ اور عام ہے اور حکم موافق قیاس کے ہے، تو کیا وجہ ہے کہ ولادت کے دن میں نوافل اور تلاوتِ قرآن اور اطعامِ طعام وغیرہ دوسرے قربات حضور ﷺ سے کیوں منقول نہیں ہیں؟ نیز مثل یومِ ولادت کے تاریخِ ولادت میں کہ ربیع الاوّل کی ۸ یا ۱۲ ہے روزہ رکھنا کیوں منقول نہیں؟

دوسرے یہ کہ نعمتیں اور بھی ہیں، مثلاً: ہجرت اور فتحِ مکہ، معراج شریف، آں حضور ﷺ نے ان کی وجہ سے کوئی عبادت کیوں نہیں فرمائی؟ اس سے معلوم ہوا کہ نہ یہ علت عام ہے اور نہ حکم موافق قیاس کے ہے، علت بھی اسی مقام کے ساتھ خاص ہے اور حکم بھی خلافِ قیاس ہے اور اصل مدار روزہ رکھنے کا وحی پر ہے۔ آں حضور ﷺ کو روزہ رکھنے کا حکم وحی سے ہوا ہوگا۔

باقی حکمت کے طور پر ولادت کا ذکر بھی فرما دیا گیا ہے ورنہ دوسری نعمتوں کے دن بھی آپ ﷺ روزہ وغیرہ رکھتے، کیوں کہ وہ نعمتیں بھی باعثِ سرور ہیں، بلکہ باعثِ ازدیادِ سرور ہیں۔ جب علت خاص اور حکم خلافِ قیاس ہوتا ہے جیسا کہ اس مقام پر ہے تو ایسی صورت میں مجتہد کے لیے بھی اس پر قیاس کر کے دوسرے احکام کا ثابت کرنا درست نہیں ہوتا۔ پھر آج کل کے غیر مجتہدین کو روزہ پر قیاس کر کے دوسرے احکام کا ثابت کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے؟ اگر یہ قیاس درست ہوتا تو صحابہ کرام اور ائمہ مجتہدین اس سے ضرور کام لیتے اور اس ''عید میلاد'' کو اس سے ثابت کر کے اس پر عمل فرماتے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ یہ بھی اس کی دلیل ہے کہ یہ قیاس بالکل غلط اور ناجائز ہے۔

حیرت کا مقام ہے کہ پیر کے دن روزہ رکھنے سے ''عید میلاد'' کا جواز ثابت کرنے والے ربیع الاول کو تو عید میلاد مناتے ہیں حالاں کہ اس تاریخ میں خصوصیت کے ساتھ نبی اکرم ﷺ سے کوئی عمل بھی منقول نہیں ہے، اور ہر پیر کے دن جس میں آں حضرت ﷺ نے روزہ رکھا ہے یہ لوگ اس میں نہ تو عید ہی مناتے ہیں اور نہ روزہ ہی رکھتے ہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ: حضور اکرم ﷺ کے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرمانے کے موقع پر مدینہ منورہ میں آں حضرت ﷺ کی تشریف آوری کا انتظار تھا، اس لیے کئی روز تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا وفد مدینہ منورہ سے باہر آپ کی تشریف آوری کے انتظار میں آتا رہا۔ اس سے بھی بعض کم فہم لوگوں نے اپنے مقصد یعنی جلوس کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالاں کہ آں حضرت ﷺ کے قدوم میمنت لزوم کے وقت آپ ﷺ کے استقبال کے لیے اجتماع ہو جانا ایک علیحدہ مسئلہ ہے، اس کو اس عید میلاد کے جلوس سے کیا تعلق ہے؟ اور ان بدفہم لوگوں کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہر سال ہجرت کے دن جلوس نکالا کرتے تھے؟ یہ استقبال کا جلوس تو پہلے قدوم مدینہ کے وقت ہی ثابت ہے یا غزوات سے واپسی پر استقبال کے وقت ایسا ہوا ہے۔ یومِ ولادت پر تو ایسا نہیں ہوا اور نہ ہی یومِ ہجرت پر ہر سال ایسا ہوتا رہا۔

رسم عید میلاد پر عقلی کلام: شریعت میں ہر فعل کا ایک سببِ خاص ہوتا ہے، جس قدر عبادات

شریعت نے مقرر کی ہیں، ان کے اسباب بھی مقرر کیے ہیں، اس سبب اور مُسَبَّبِیّت کی تین صورتیں شریعت میں پائی جاتی ہیں:

ایک یہ کہ سبب میں تکرار ہو اور وہ بار بار پایا جاتا ہو تو سبب کے مکرّر ہونے سے مسبب بھی بار بار پایا جائے گا۔ جیسے وقت نماز کے لیے سبب ہے، جب وقت آئے گا نماز بھی فرض ہو جائے گی۔ اسی طرح رمضان روزہ کے لیے سبب ہے، جب رمضان المبارک آئے گا روزہ فرض ہو جائے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ سبب بھی ایک ہو اور مسبب بھی ایک ہو، کہ جیسے بیت اللہ شریف حج کے لیے، چوں کہ سبب ایک ہے اس لیے حج عمر بھر میں ایک ہی مرتبہ فرض ہے۔ یہ دونوں قسمیں تو مُدرَک بالعقل ہیں (عقل میں آتی ہیں) اس لیے کہ عقل بھی اس کا تقاضا کرتی ہے کہ سبب کے تکرار اور توحّد سے مسبب متکرر اور متوحد ہو۔

تیسری قسم یہ ہے کہ سبب ایک ہو اور مسبب کے اندر تکرار ہو، یعنی سبب ایک بار پایا گیا مگر مسبب بار بار پایا جاتا ہے۔ جیسے حج کے طواف میں رمل (یعنی شانے ہلاتے ہوئے اکڑ کر طواف کرنا) اس کا سبب ''اراءۃِ قوت'' (مشرکین کو اپنی قوت دکھلانا) تھا، کیوں کہ مدینہ طیبہ سے جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حج کے لیے مکّہ معظمہ آئے تو مشرکین مکّہ نے کہا تھا کہ ان لوگوں کو یثرب کے بخار نے ضعیف اور بودا کر دیا ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ طواف میں رمل کریں۔ اب وہ سبب ''اراءۃِ قوت'' تو نہیں رہا لیکن طواف میں رمل باقی رہا۔ یہ عمل مدرک بالعقل نہیں، اور جو عمل خلافِ قیاس ہوتا ہے اس کے لیے نقل اور وحی کی ضرورت ہوتی ہے، اس میں بجز وحی کے کوئی راستہ نہیں ہے، ایسے عمل پر قیاس کر کے کسی دوسرے عمل کو جاری نہیں کیا جا سکتا۔

اب سوال یہ ہے کہ عید میلاد کا سبب کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی تاریخ ہونا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ وہ تاریخ جو سبب ہے عید میلاد کا وہ ایک ہے جو گزر گئی یا وہ تاریخ بار بار آتی ہے؟ یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ تاریخ ہو گئی ہے، کیوں کہ اب جو ۱۲؍ ربیع الاوّل کی

تاریخ آتی ہے وہ اس خاص تاریخ ولادت کی عین نہیں صرف مثل ہے۔ اس واسطے مثل کا مدار حکم ہونا اور مثل کے لیے وہی حکم ثابت ہونا جو عین کے لیے تھا کسی دلیل نقلی کا محتاج ہوگا اور بوجہ غیر مدرک بالعقل ہونے کے اس میں قیاس حجت نہیں ہوگا اور عید میلاد منانے میں کوئی دلیل نقلی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکی۔ اس لیے اس کو شریعت پر زیادتی اور بدعت کہا جائے گا۔

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ حضور ﷺ نے پیر کے دن روزہ رکھنے کی وجہ وُلِدْتُ فِیْہِ (اس میں میری ولادت ہوئی ہے) سے بیان فرمائی ہے حالاں کہ روزِ ولادت گزر گیا ہے، اب یہ اس کا مثل ہے اس کو اصل کا حکم کیوں ہوا؟ اس لیے کہ روزہ تو خود منقول ہے اور یہ اوپر گزر چکا ہے، کہ اس صورت میں وحی کی ضرورت ہوتی ہے، اور آپ ﷺ نے وحی سے یہ روزہ رکھا ہے، اس لیے اس پر قیاس نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح حجۃ الوداع میں باوجود یہ کہ مکہ مکرمہ فتح ہو چکا تھا اور مشرکین کو اراءۃِ قوت کی ضرورت نہ رہی تھی، پھر بھی حضور ﷺ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے طواف میں رمل باقی رکھا، یہ اس کی دلیل ہے کہ یہ عمل اراءۃِ قوت کے بغیر بھی مامور بہ ہے اور سبب کے فقدان کے باوجود بھی بحالہ باقی ہے۔ ورنہ حجۃ الوداع میں ارتفاعِ علت کی وجہ سے حکم مرتفع ہوجاتا۔

غرضے کہ نقل اور عقل ہر طرح سے بحمد اللہ ثابت ہوگیا کہ یہ عید میلاد مخترع، ناجائز اور بدعت واجب الترک ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو ولادتِ نبوی ﷺ پر فرحت اور سرور کا حکم ہے، مگر یومِ ولادت کو عید منانا شرعاً درست نہیں ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ
وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ

مسائل وفضائل
رمضان المبارک

مصنفہ
حضرت مولانا سید مفتی عبدالشکور صاحب مدظلۂ
مہتمم مدرسہ حقانیہ ساہیوال۔ ضلع سرگودھا

جس میں رمضان المبارک کے مسائل اور فضائل کو بہت عمدہ طریقہ سے بیان کیا گیا ہے اوران غلطیوں کی بھی اصلاح کی گئی ہے جو رمضان المبارک کے مہینہ کے اندر علم دین کی ناواقفیت کی وجہ سے مسلمانوں میں شائع اور رائج ہو چکی ہیں۔
اس کتاب کو علمائے محققین نے بہت پسند فرمایا، ان کی تقاریظ بھی شامل ہیں۔
اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبول فرمائیں اوراس سے اہلِ اسلام کو نفع دیں۔ آمین

رائے گرامی

مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت الحاج مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَہٗ
بذریعہ مکتوبِ اقدس بنام مصنف علامہ دَامَتْ بَرَکَاتُہُمْ

عزیز محترم مولانا عبدالشکور صاحب ترمذی زَادَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی عِلْمًا وَشَرَفًا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا رسالہ نافعہ ''مسائل وفضائل رمضان'' پہنچا۔ اگرچہ وقت نہیں ملتا، خصوصاً آج کل اور بھی پریشانی اہلیہ کی علالت کے سبب چل رہی ہے۔ مگر اسی حال میں رسالہ کو مختلف مقامات سے خصوصاً مسئلہ تعجیلِ افطار اور مسئلہ انجکشن فی الصوم کو شوق کے ساتھ دیکھا۔ ماشاء اللہ تحقیقاتِ مفیدہ کا جامع رسالہ ہوگیا۔

اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں اور نافع ومفید بنائیں اور مصنف کو ترقیات ظاہرہ وباطنہ عطا فرمائیں۔

وَاللّٰہُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی أَعْلَمُ.

بندہ

محمد شفیع عفا اللہ عنہ

تقریظ

از

حضرت العلامہ مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب تھانوی دَامَتْ بَرَکَاتُہُمْ الْعَالِیَۃ

عزیزم سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میں نے خاص مقامات نشان زدہ سے دیکھا، بہت خوشی ہوئی اور دل سے دُعا نکلی۔ اللہ تعالیٰ اس رسالہ کو مقبول اور آپ کی سعی کو مشکور فرمائیں۔ ماشاء اللہ بہت سے فوائدِ جدیدہ پر مشتمل ہے۔ بعض مقاماتِ کے مطالعہ میں کوئی بات میرے ذہن میں آئی تو آگے چل کر آپ کے الفاظ میں وہی بات پائی گئی۔

فَجَزَاکُمُ اللّٰہُ تَعَالٰی أَحْسَنَ الْجَزَاءِ.

ظفر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

۳ر شعبان ۱۳۸۵ھ

تصدیق

حضرت مولانا جمیل احمد صاحب تھانوی (مفتی جامعہ اشرفیہ لاہور)

حَامِدًا وَّمُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

احقر نے حضرت مولانا عبدالشکور صاحب کا رسالہ اکثر جگہ سے اور مسئلہ تعجیلِ افطار کُل دیکھا یا سنا ہے۔ الحمد للہ حق حق مسائل پر مشتمل پایا۔ خصوصاً شیعہ اثر سے جو لوگ افطار میں تاخیر کرنا چاہتے تھے ان کی اصلاح نہایت عمدہ تحقیقی اور مہذب طریقہ سے کی گئی ہے۔ اسی طرح دوسری کوتاہیوں کی جو آج کل رمضان شریف جیسے متبرک اور کثیر الثواب موسم میں کی جارہی ہیں۔ کیوں کہ اندیشہ ہے کہ جیسے بابرکت زمانہ میں اجر وثواب کی زیادتی ہوتی ہے اسی طرح گناہ اور کوتاہیوں پر سخت گناہ نہ ہوتا ہو، اس لیے رمضان شریف کو تمام گناہوں، رسموں، بدعتوں اور کوتاہیوں سے بہت پاک کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت مؤلف کو جزائے خیر عطا فرمائیں اور رسالہ کو قبولِ عام بخشیں۔

جمیل احمد تھانوی
مفتی جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور
۲۳؍شوال ۸۵ھ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمہ

الحمد لله المنعم المحسن الديّان، ذي الفضل والطول والإحسان، الذي شرفنا بالإسلام وكرمنا بالإيمان، وفضلنا على العالمين بإقامة الصلاة وإيتاء الزكاة والحج وصوم رمضان، وبشر الصائمين بأن الصوم له وهو يجزي به ويدخلهم الجنة من باب الريّان، وجعل شهر رمضان وقت نزول القرآن، فيه هدى للناس و بينات من الهدى والفرقان. والصلاة والسلام الأتمان الأكملان على صفوة خلقه سيدنا محمد المبعوث إلى الإنس والجان، و على آله وأصحابه ما تعاقب الملوان.

بعد الحمد والصّلوٰۃ! گزارش آں کہ عرصہ سے دیکھنے میں آرہا ہے کہ رمضان المبارک کے اندر روزہ کے افطار کے وقت کے متعلق مسلمانوں میں اختلاف ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک ہی مسجد میں بعض لوگ افطار کرلیتے ہیں بعض بیٹھے رہتے ہیں اور افطار نہیں کرتے۔ اس میں بعض مرتبہ سخت اختلاف اور بلوے کی نوبت بھی آجاتی ہے، چاہیے تو یہ تھا کہ افطار کے وقت اُدعیۂ ماثورہ میں مشغول ہوا جاتا اور اپنی حاجات اور مرادوں کو اس وقت دربار خداوندی میں پیش کیا جاتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ روزہ دار اللہ کا مہمان ہے اور افطار کے وقت اس کی دعا مقبول ہوتی ہے۔ کیوں کہ کریم میزبان مہمان کی استدعا کورد نہیں کیا کرتا۔ مگر ہماری حالت یہ ہے کہ افطار کے وقت ایک تو افطاری کے واسطے آئی ہوئی اشیا کے تقسیم کرنے میں بچوں اور بڑوں کا شور اس قدر ہوتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور اکثر بچے ننگے پاؤں ہوتے ہیں اس سے مسجد کی صفوں کے خراب وناپاک ہوجانے کا بھی قوی اندیشہ ہوتا ہے۔ مگر شوقِ افطاری میں کسی کو اس طرف توجہ نہیں ہوتی اور نہ کوئی کسی کی نصیحت کو سنتا ہے۔

اس وقت ایک نفسی نفسی کا سماں ہوتا ہے۔ ہر ایک کو افطاری حاصل کرنے کی فکر دامن گیر ہوتی ہے۔ مسجد کے اندر اس وقت شور وشغب اور بچوں کا بے احتیاطی کے ساتھ آنا اس میں مسجد کی کس قدر بے حُرمتی اور بے ادبی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔

دوسرے افطاری کے وقت کے متعلق حاضرینِ مسجد میں شدید نزاع اور شور وغل شروع ہوجاتا ہے اور اس طرح بچے اور بڑے سب مل کر اپنے شور وغل اور لڑائی جھگڑے کے سبب مسجد کو بازار کا نمونہ بنادیتے ہیں۔ ایسے وقت میں نہ کسی کو مسنون دعاؤں کے پڑھنے کا خیال رہتا ہے اور نہ اس طرف توجہ ہوتی ہے کہ یہ وقت دعا کی قبولیت کا ہے۔ اس وقت حضورِ قلب کے ساتھ خدا تعالیٰ کے دربار میں اپنی مرادوں کو پیش کرنا چاہیے۔ اس دوطرفہ شور وغل میں جمعیّتِ خاطر اور سکونِ قلب کا نام ونشان نہیں رہتا۔ یہی جمعیّت اور اطمینانِ قلب ہے جس سے دعا میں عجز وتضرع کی کیفیت پیدا ہو کر امیدِ قبول وابستہ ہوا کرتی ہے۔ اس ہنگامہ اور شور کے اندر قلب کی غفلت کی حالت میں جو دُعائیہ کلمات عادت کے طور پر منہ سے نکلتے بھی ہیں ظاہر ہے کہ ان کے مستجاب اور مقبول ہونے کی کیا توقع کی جاسکتی ہے۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ”اِنَّ اللّٰہَ لَا یَقْبَلُ الدُّعَاءَ مِنْ قَلْبٍ لَاہٍ“ کہ اللہ تعالیٰ غافل دل سے نکلی ہوئی دعا کو قبول نہیں فرماتے۔

ان حالات کو دیکھ کر خیال آیا کہ رمضان المبارک کے متعلق علمائے کرام نے جو مختلف کتب اور رسائل تحریر فرمائے ہیں ان متفرق رسائل سے مختصر طریقہ پر اعمال رمضان المبارک کے متعلق بقدرِ ضرورت ایسے مضامین منتخب کر کے جمع کردیے جائیں جو فضائل اور مسائلِ ضروریہ پر بھی مشتمل ہوں اور ان سے اُن غلطیوں کی بھی اصلاح اور ان پر تنبیہ ہوجائے جو رمضان المبارک کے مہینہ کے اندر علمِ دین سے ناواقفیت کی وجہ سے مسلمانوں میں شائع اور رائج ہوچکی ہیں۔ چناں چہ یہ مضمون علمائے کرام کی معتبر کتابوں کی تحقیقات کی روشنی میں خاص طرز سے جمع کیا گیا ہے اور اس مضمون کی ترتیب وجمع میں حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ کے مواعظ اور مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارن پور کے رسائل ”فضائلِ

قرآن'' اور ''فضائلِ رمضان'' نیز ماہنامہ ''اشرف العلوم'' سہارن پور بابت ماہِ شعبان ۱۳۵۵ھ سے خصوصی استفادہ کیا گیا ہے، اور احادیث کی شرح اور اس کے مطالب کے بیان کے لیے ''أشعة اللمعات'' اور ''مظاہرِ حق'' اور ''بذل المجهود'' وغیرہ کتب سے مدد لی گئی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مضمون کو قبول فرما کر نافع فرمائیں اور شبہات و اغلاط کا دافع بناویں، اور ہم سب کو اپنی اصلاح کی توفیق عنایت فرماویں۔

إِنْ أُرِيْدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ،
وَمَا تَوْفِيْقِي إِلَّا بِاللّٰهِ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيْبُ.

مسائل وفضائل رمضان

فضیلت رمضان المبارک: یہ قمری مہینوں میں سے نواں مہینہ ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ حدیث میں یہ آئی ہے: فبانھا ترمض الذنوب. یہ رمض سے مشتق ہے اور رمض کے معنی لغتِ عربیہ میں جلا دینے کے ہیں۔ چوں کہ اس مہینہ میں یہ خصوصیت ہے کہ مسلمانوں کو گناہوں سے پاک صاف کر دیتا ہے (بشرطے کہ رمضان المبارک کا پورا احترام اور اس کے اعمال کا اہتمام کیا جاوے) اس لیے اس کا نام رمضان ہوا۔ حق تعالیٰ جل شانہٗ نے اس ماہِ مبارک کی اپنی طرف خاص نسبت فرمائی ہے۔ حدیث میں ہے کہ

رَمَضَانُ شَهْرُ اللّٰهِ.

رمضان حق تعالیٰ جل شانہٗ کا مہینہ ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ ہر چیز میں نسبت کی وجہ سے منسوب الیہ کی عظمت کے اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ جب اس مہینہ کو حق تعالیٰ جل شانہٗ نے اپنی طرف منسوب فرمایا تو اس خصوصی نسبت سے یہ معلوم ہو گیا کہ اس کو حق تعالیٰ کے ساتھ کوئی ایسا خصوصی تعلق ہے جس کی وجہ سے یہ مبارک مہینہ دوسرے مہینوں سے ممتاز اور جدا ہے۔ یہی مطلب ہے اس ارشاد کا کہ رمضان اللہ تعالیٰ کا مہینہ ہے ورنہ تمام مہینے اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں۔ خصوصی تعلق سے مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی تجلیاتِ خاصہ اس ماہِ مبارک میں اس درجہ نازل ہوتی ہیں کہ جو دوسرے مہینوں میں نہیں ہوتیں۔ گویا موسلا دھار بارش کی طرح خصوصی تجلیاتِ الٰہیہ اس مبارک مہینہ میں برستی ہیں۔ جنھیں حق تعالیٰ نے بصیرت کی آنکھیں دی ہیں وہ ان تجلیات کا مشاہدہ کرتے ہیں اور ان کے فیوض وبرکات سے مستفید ہوتے ہیں۔ البتہ جو لوگ دل کی آنکھ سے محروم ہیں وہ اپنی کور باطنی کے سبب ان تجلیات کے دیکھنے سے قاصر وکوتاہ ہیں:

گر نہ بیند بروز شپرہٗ چشم

چشمہ آفتاب راچہ گناہ

... رمضان ایسا مہینہ ہے کہ اس کے اوّل حصہ میں حق تعالیٰ کی

رحمت برستی ہے جس کی وجہ سے انوار واسرار کے ظاہر ہونے کی قابلیت واستعداد پیدا ہوکر گناہوں کے ظلمات اور معصیت کی کثافتوں سے نکلنا میسّر ہوتا ہے۔ اور اس ماہ کا درمیانی حصّہ گناہوں کی مغفرت کا سبب ہے اور ماہ رمضان المبارک کے آخری حصّہ میں دوزخ کی آگ سے آزادی حاصل ہوتی ہے۔ [۱]

جب طاعات وعبادات کے ذریعے انوار وبرکات کے حاصل کرنے کی توفیق بسبب افاضۂ رحمتِ خاصہ خداوندی اس ماہِ مبارک میں میسّر ہوجاتی ہے اور اطاعت وفرماں برداری سے حق تعالیٰ خوش ہوکر اپنے بندوں کے گناہوں کی معافی اور مغفرت فرمادیتے ہیں، تو دوزخ کی آگ سے آزادی بھی مل جاتی ہے اور جنّت کے داخلہ کی استعداد نصیب ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر اعمالِ رمضان المبارک پر مداومت اور اعمالِ صالحہ کی پابندی میں تمام ماہِ صیام گزار دیا جاوے اور آخر تک یہ سلسلۂ عمل قائم اور جاری رہے تو حسب فرمانِ رسول خدا ﷺ رمضان المبارک کی آخری شب میں سب کو بخش دیا جاتا ہے۔ [۲]

حضور ﷺ کا ارشاد ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے لوگو! یقیناً تم پر ایک بڑے عظمت والے مہینے نے سایہ کیا ہے، یہ برکت والا مہینہ ہے اس میں ایک رات ایسی ہے کہ اس کے اندر عبادت کرنا ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس ماہ کے روزے فرض فرمادیے ہیں اور اس کی راتوں میں نماز ادا کرنا نفل وسنت قرار دیا ہے۔ جو شخص اس ماہ میں کسی نفلی نیکی کے ذریعے حق تعالیٰ کی نزدیکی چاہے گا وہ اس شخص جیسا ثواب حاصل کرلے گا جس نے رمضان کے علاوہ کسی مہینہ میں فریضہ کو ادا کیا ہو، اور جو شخص اس ماہ میں فریضہ ادا کرے وہ ثواب میں اس شخص جیسا ہوگا جس نے ماہِ رمضان کے سوا کسی دوسرے مہینہ میں ستر فرض ادا کیے ہوں۔ اور ماہِ رمضان وہ مہینہ ہے کہ اس میں صبر کرنا پڑتا ہے، نفس کو اس کی خواہشات سے روکا جاتا ہے، اور صبر کرنے کا ثواب جنّت ہے، اس کے بدلے میں بہشت ملتی ہے۔ وہ ایسا مہینہ ہے کہ اس میں محتاجوں اور بھوکوں کی مال اور جان کے ساتھ غم خواری کرنی چاہیے اور یہ ایسا مہینہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کا رزق زیادہ اور اس میں برکت دی جاتی ہے۔ [۳]

۱۔ بیہقی ۲۔ احمد ۳۔ بیہقی

اور چوں کہ اس ماہ میں غم خواری اور مواسات کا حکم کیا گیا ہے یہ بھی فقیر اور محتاجوں کے رزق میں وسعت اور زیادتی کا سبب ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ رمضان کی جب پہلی رات ہوتی ہے تو شیاطین کو بند کر دیا جاتا ہے اور مضبوط باندھ دیا جاتا ہے، اور سرکش جنوں کو بھی بند کر دیا جاتا ہے، اور دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اس کا کوئی دروازہ بھی کھولا نہیں جاتا، اور بہشت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اس کا کوئی دروازہ بند نہیں کیا جاتا، اور ایک آواز دینے والا آواز دیتا ہے کہ اے نیکی کے طالب! آگے بڑھ کہ نیکی کا وقت ہے۔ اور اے بدی کے چاہنے والے! بدی سے رُک جا اور اپنے نفس کو گناہوں سے باز رکھ کیوں کہ یہ وقت گناہوں سے توبہ کرنے اور ان کو چھوڑنے کا ہے، اور خدا تعالیٰ کے لیے ہیں دوزخ کی آگ سے آزاد کیے ہوئے۔ یعنی اللہ تعالیٰ آزاد کرتا ہے بہت بندوں کو دوزخ کی آگ سے بحرمت اس ماہِ مبارک کے اور یہ آزاد کرنا رمضان شریف کی ہر رات میں ہے، شبِ قدر کے ساتھ مخصوص نہیں۔[1]

فائدہ: اوپر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں منقول ہوا کہ رمضان المبارک کی آخری شب میں اُمت کی مغفرت کی جاتی ہے۔ اور اس روایتِ ترمذی میں رمضان کی ہر رات میں عتق وآزادی کا ذکر ہے، تو سمجھ میں یوں آتا ہے کہ شاید ''ترمذی'' کی روایت میں ہر روز کے گناہوں کی مغفرت کی خبر دی گئی ہو، اور جب تمام رمضان میں ہر روز کے گناہ رات کو معاف کر دیے جاتے ہیں تو آخری شب میں تمام گناہوں کی مغفرت کی خبر دے دی گئی۔ ہر روز گناہ معاف ہونے کا لازمی نتیجہ آخری شب میں کل گناہوں کی مغفرت اور نجات من النار کی صورت ہی میں ظاہر ہوسکتا ہے۔

اور اگر وَذٰلِكَ كُلَّ لَيْلَةٍ کا یہ مطلب ہو کہ یہ منادی رمضان المبارک کی ہر شب میں ہوتی ہے تو اس صورت میں وَلِلّٰهِ عُتَقَاءُ مِنَ النَّارِ منادی کا جز ہوگا اور اس کا تعلق كُلَّ لَيْلَةٍ سے نہ ہوگا، پھر کسی تطبیق کی حاجت نہیں رہتی۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شرح مشکوٰۃ ''أشعة اللمعات'' میں چوں کہ وہ ترجمہ اختیار فرمایا ہے جو اوپر گزرا ہے اس لیے اس

---

[1] ترمذی شریف

میں توجیہ کی ضرورت پیش آئی۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِمُرَادِ رَسُوْلِہٖ.

فائدہ: اس ماہ مبارک کے اندر شیاطین اور سرکش جنوں کے قید کردینے میں حکمت یہ ہے کہ وہ روزہ داروں کے دلوں میں وسوسہ گناہوں کا نہ ڈال سکیں اور معصیت کی طرف ان کو نہ بلائیں۔ اسی کا یہ اثر ہے کہ اکثر گرفتارانِ معاصی اس ماہِ مبارک میں گناہوں سے پرہیز کرنے لگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوجاتے ہیں اور بعض لوگوں سے اس ماہ کے اندر بھی جو معاصی کا صدور ہوجاتا ہے اس میں شیاطین کی پہلی وسوسہ اندازی اور سابقہ عادت کا دخل ہوتا ہے۔ گناہ گاروں کو گناہوں کے کرنے کی چوں کہ عادت پڑی ہوئی ہوتی ہے اس عادت کی وجہ سے اس مبارک زمانہ میں بھی ان سے گناہ ہوجاتے ہیں، یا یہ اثر ہے نفس کی قوتِ داعیہ الی الشر کا کہ نفس گناہوں کی طرف رغبت دلاتا ہے اس لیے گناہ ہوجاتے ہیں، شیاطین کے اثر سے گناہ نہیں ہوتے، تو جو گناہ اس مبارک ماہ میں ہوتے ہیں وہ نفس کے تقاضا اور اس کی قوتِ داعیہ الی الشر کے سبب ہوتے ہیں اور شیاطین کے وسوسہ کی وجہ سے جو گناہ رمضان سے قبل ہوا کرتے تھے ان سے اس زمانہ میں لوگوں کو محفوظ کردیا جاتا ہے۔ اور اس اشکال کا ایک جواب استاذ الکل حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے جس کو صاحبِ ''مظاہر حق'' نے پسند فرمایا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ فاسقوں کے بہکانے سے صرف سرکش شیطان روک دیے جاتے ہیں اور کم درجہ کے شیطان ان کو بہکاتے رہتے ہیں، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ بہ نسبت اور دنوں کے ایامِ رمضان میں گناہ کم کرتے ہیں لیکن کچھ گناہ ان سے ہوتے رہتے ہیں۔

اور دوزخ کے دروازے بند کیے جانے میں اشارہ اس طرف ہے کہ روزہ داروں کے نفوس فواحش کی آلودگی سے مُنزّہ اور معاصی کے اسباب سے خلاصی پاچکتے ہیں اور ان کی خواہشات ختم ہوچکی ہوتی ہیں، اس لیے وہ ایسے کاموں سے باز رہتے ہیں جو دوزخ میں داخلہ کے باعث ہوں، چناں چہ کبائر سے روزہ دار خود پرہیز کرنے کا اہتمام کرتا ہے اور صغائر کو روزہ کی برکت کے سبب بخش دیا جاتا ہے۔ اسی طرح بہشت کے دروازے کھولنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس مبارک ماہ میں نیک کاموں کی توفیق ہوتی ہے جو کہ بہشت میں داخلہ کے اسباب ہیں۔

ماہ مبارک کی ان تمام فضیلتوں کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کو اس مہینہ میں عبادات کا خاص اہتمام کرنا چاہیے اور کوئی لمحہ ضایع اور بے کار جانے نہیں دینا چاہیے، شب وروز کے ساعات کو اعمالِ صالحہ کے ساتھ مزین ومعمور رکھنے کی سعی اور کوشش میں مصروف رہنا چاہیے۔ دوسرے مہینوں کی دائمی عبادات کے ساتھ بعض دوسری عبادات کو اس ماہ مبارک میں مقرر کرنے سے شریعت کی غرض بھی یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس ماہِ مبارک کا ہر لمحہ اور ہر ساعت عبادت وبندگی میں گزرے، لیکن حاجتِ بشریہ میں گھرے ہوئے انسان کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ اپنے کاروبار اور بشریت کے تقاضوں سے علیحدہ ہوکر ہمہ وقت عبادت میں مشغول ہوجاتا، اس لیے انسانوں کے ضعف اور ان کی ضروریاتِ طبعیہ پر نظر فرماکر خدا تعالیٰ کی رحمت نے دستگیری فرمائی اور اس ماہ مبارک میں ایسی خاص طرز کی عبادت کو فرض کے طور پر معیّن فرمادیا کہ انسان اس عبادت کے ساتھ اپنی تمام ضروریات وحوائج میں بھی مصروف رہ سکتا ہے اور عین اسی حالت میں وہ عبادت میں بھی مشغول ہوتا ہے۔ ایسی خاص طریقہ کی عبادت روزہ ہے جس کو اس ماہ میں فرض فرمادیا گیا ہے۔

فضیلتِ صوم: یہ عجیب عبادت ہے کہ انسان روزہ رکھ کر اپنے ہر کام کو انجام دے سکتا ہے۔ روزہ رکھ کر صنعت وحرفت تجارت وزراعت ہر کام کرسکتا ہے اور لطف یہ کہ ان کاموں میں مشغول ہونے کے وقت بھی روزہ کی عبادت روزہ دار سے بے تکلف خود بخود صادر ہوتی رہتی ہے اور اس کو عبادت میں مشغولی کا ثواب ملتا رہتا ہے۔

روزہ خدا تعالیٰ کا وہ بابرکت فریضہ ہے جس کو حق تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اور قیامت کے دن حق تعالیٰ اس کا بدلہ اور اجر بغیر کسی واسطہ کے بذاتِ خود روزہ دار کو عنایت فرمائیں گے۔ چناں چہ حدیثِ قدسی میں ارشاد ہے:

الصَّوْمُ لِي وَأَنَا أَجْزِي بِهِ.

روزہ میرا ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔

نماز وروزہ سب عبادات اللہ تعالیٰ کی ہی ہیں، اس کو راضی اور خوش کرنے کے لیے

سب عبادات کی جاتی ہیں۔ مگر روزہ ایک عجیب خصوصیت اپنے اندر رکھتا ہے، وہ ریا اور دکھلاوے سے بالکل دور چشم اغیار سے پوشیدہ سراپا اخلاص اور بندہ ومعبود کے درمیان ایک راز ہے، حتیٰ کہ اس کا علم بھی صحیح طور پر بجز روزہ دار کے اور اس ذات اقدس کے جس کے لیے یہ روزہ رکھا گیا ہے دوسرے شخص کو نہیں ہوتا، کیوں کہ روزہ کی کوئی ظاہری صورت اور محسوس ہیئت نہیں ہوتی جس کی وجہ سے دیکھنے والوں کو اس کا ادراک اور علم ہو سکے، بخلاف دوسری عبادت کے کہ ان کی ایک ظاہری صورت بھی ہوتی ہے جس کے دیکھنے والے پر عبادت کا اظہار ہوتا ہے۔ جب روزہ ایک راز ہوتا ہے روزہ دار اور اس کے درمیان میں تو پھر اس کے بدلہ اور ثواب دینے میں بھی یہی مناسب تھا کہ خصوصی اور راز دارانہ طریقہ اختیار کیا جاتا جس کی اطلاع فرشتوں کو بھی نہ دی جاتی۔ چناں چہ خدا تعالیٰ براہِ راست بغیر کسی واسطہ کے روزہ دار کو اس کا بدلہ عطا فرماویں گے:

میانِ عاشق ومعشوق رمزیست
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

اسی خصوصیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے روزہ کو اور اس کی جزاو ثواب کو الصَّوْمُ لِي وَأَنَا أَجْزِيْ بِهٖ میں اپنی طرف منسوب فرما کر اس کی شرافت وعظمت کو بڑھا دیا ہے اور پیغمبر ﷺ نے بھی مختلف احادیث میں بکثرت اس کے مخصوص فضائل ومناقب بیان فرمائے ہیں۔

فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: جس شخص نے ایک دن کا روزہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے رکھا، اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ سے اس قدر دور رکھیں گے کہ جس قدر کوا اپنی ابتدائے عمر سے بوڑھا ہو کر مرنے تک اڑان میں مسافت طے کرتا ہے۔

(کوے کی عمر بہت طویل ہوتی ہے۔ کہا گیا ہے کہ ہزار برس کی ہوتی ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس قدر طویل مسافت وہ پوری عمر میں قطع کر لیتا ہوگا۔)

اور حضرت رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص رمضان کے روزہ رکھے، اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے اور اس کے حکم کا امتثال کرتے ہوئے اس کے گزشتہ گناہ بخش دیے جائیں گے۔

حضرت ﷺ کا ارشاد ہے: اَلصِّيَامُ جُنَّةٌ. (روزہ دار کے لیے روزہ سپر اور ڈھال ہے) یعنی روزہ دار روزہ کی وجہ سے دنیا میں شیطان کہ شر سے بچتا اور اس کے حملوں کو روکتا ہے اور آخرت میں دوزخ کی آگ سے محفوظ رہتا ہے۔

بیہقی نے نقل کیا ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ روزہ دار کی نیند عبادت ہے اور اس کے خاموش رہنے میں بھی اس کو تسبیح یعنی سُبْحَانَ اللّٰہِ کہنے کا ثواب ملتا ہے اور اس کے ہر عمل کا ثواب بڑھایا جاتا ہے اور اس کی دعا مقبول ہوتی ہے اور اس کے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔[1]

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی بو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ گویا روزہ دار اللہ تعالیٰ کا محبوب ہو جاتا ہے کہ اس کی خلوف (منہ کی بو) بھی اللہ تعالیٰ کو پسند اور خوش گوار ہوتی ہے۔

فائدہ: ''خلوف'' جس کا ذکر اس حدیث میں آیا ہے، وہ معدہ کے خالی ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، تو جب تک معدہ خالی رہے گا یہ خلوف بھی رہے گی۔ اس لیے عوام کا یہ خیال قابل اصلاح ہے کہ وہ روزہ کے اندر مسواک کو منع سمجھتے ہیں، اور بعض اہلِ علم بھی اس بنا پر کہ منہ کی بو مسواک سے زائل ہو جاتی ہے روزہ کی حالت میں مسواک کے جواز میں تردد کرتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں مسواک سے صرف دانت صاف ہو جاتے ہیں اور منہ کی بدبو دور ہو جاتی ہے معدہ میں اس سے کوئی چیز نہیں پہنچتی۔ اس لیے مسواک کے بعد بھی وہ خلوف باقی رہتی ہے جس کا اللہ کے نزدیک مشک سے زیادہ پسند ہونا حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ لہٰذا مسواک روزہ کی حالت میں بھی ہر نماز کے وقت سنت ہے۔ ظہر وعصر میں بھی مسواک کرنی چاہیے۔ اور ''مظاہرِ حق'' میں بیہقی سے منقول ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر کی طرف یہ وحی بھیجی کہ اپنی قوم کو خبردار کر دیں: جو بندہ میری رضا مندی کے واسطے کسی دن روزہ رکھتا ہے تو میں (دنیا میں) اس کے جسم کو تندرست رکھتا ہوں اور اس کو (آخرت میں) بہت ثواب دیتا ہوں۔

[1] مظاہر حق

سحری کا بیان: روزہ پر اس قدر اجر اور ثوابِ عظیم کا وعدہ جس کا تصور بھی کسی سے نہیں ہو سکتا اس لیے بھی ہے کہ یہ ایک بہت مشقت اور خاصے تحمل و برداشت اور محنت کی عبادت ہے، صبح صادق سے غروب آفتاب تک کھانے پینے اور ازدواجی خواہش کے تقاضے پر عمل کرنے سے اپنے کو روکے رکھنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس میں کافی تعب ومشقت برداشت کرنا پڑتا ہے، اور عبادت میں تعب ومشقت کے مقدار ہی اجر وثواب ملا کرتا ہے۔ اصل تو روزہ میں یہ تھا کہ رات کو سو جانے کے بعد کھانا پینا وغیرہ ناجائز ہو جاتا اور سحری کے وقت بھی کھانے پینے کی اجازت نہ ملتی۔ جیسا کہ اہلِ کتاب کے یہاں یہی حکم تھا اور ابتدائے اسلام میں بھی یہی حکم رہا ہے۔ لیکن خداوندِ عالم کی خاص رحمت اور خصوصی مہربانی ہے کہ اس نے سحری کی اجازت فرما کر ہم ضعیفوں پر خاص انعام فرمایا اور سحری کھانے پر ثواب میں کمی تو کیا ہوتی اور زیادہ ثواب کا وعدہ فرمایا۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

تَسَحَّرُوْا فَإِنَّ فِي السُّحُوْرِ بَرَكَةً.

سحری کھاؤ، سحری کھانے میں برکت ہے۔

اور ایک روایت میں ہے کہ سحری کھاؤ اگرچہ ایک گھونٹ پانی کی ہو۔[1] سحری کھانے کا یہ حکم استحباب کے لیے ہے، اس لیے سحری کھانا مستحب ہوا۔ اور برکت سے مراد حدیث میں یہ ہے کہ سحری کھانے میں سنت پر عمل کرنے کے سبب اجرِ عظیم ملتا ہے، اس میں یہ تو دینی برکت ہے۔ دوسرے صبح صادق کے قریب کھانے پینے سے روزہ رکھنے پر اعانت و مدد ہوگی اور تمام دن اسی کھانے پینے کا اثر باقی رہے گا، تو سحری کھانے سے روزہ رکھنے پر قوت بھی حاصل ہوتی ہے، یہ اس میں دنیوی برکت ہوتی ہے۔ اس لیے سحری کا اہتمام ہونا چاہیے کہ یہ ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہے۔

فائدہ: سحر کہتے ہیں شب کے آخری چھٹے حصہ کو۔ جو لوگ آدھی رات یا اس کے قریب سحری کھاتے ہیں وہ مستحب کی فضیلت سے محروم رہتے ہیں۔ سحری میں تاخیر (دیر کرنا) مستحب ہے مگر

---

[1] احمد

اتنی تاخیر نہ کی جاوے کہ صبح صادق کے طلوع ہونے کا وہم ہونے لگے۔ غروب آفتاب اور صبح صادق کے درمیانی حصّہ کے چھ حصّے بنا کر آخری چھٹے حصّہ میں سحری کھالیں اور ایسے وقت پر سحری ختم کردیں کہ اس وقت یقین ہو کہ ابھی صبح صادق نہیں ہوئی۔ اسی طرح جو لوگ سحری بالکل نہیں کھاتے ان کو بھی چاہیے کہ وہ سحری کی فضیلت حاصل کرنے کی غرض سے کچھ نہ کچھ کھاپی لیا کریں۔ جیسا اوپر حدیث کے حوالہ سے گزرا ہے کہ سحری کھاؤ اگرچہ گھونٹ پانی ہی ہو۔ کیوں کہ سحری کی وجہ سے ہی اہلِ کتاب کے روزہ سے ہمارے روزہ میں فرق وامتیاز ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہمارے اور اہلِ کتاب یعنی یہود ونصاریٰ کے روزہ میں فرق سحری کھانے کا ہے۔[1]

مگر ساتھ ہی اس غلطی کی اصلاح بھی بہت ضروری ہے کہ اگر کسی دن غفلت کی وجہ سے وقت پر آنکھ نہیں کھلتی اور صبح صادق ہوجانے کی وجہ سے سحری کھانے کا موقع نہیں ملتا تو بعض عوام سمجھتے ہیں کہ روزہ رکھنا ضروری نہیں اور وہ فرض روزہ کو بھی سحری نہ ملنے کی وجہ سے ترک کردیتے ہیں، تو ان کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ سحری کا کھانا صرف مستحب وافضل ہے، روزہ کی شرط نہیں ہے اور نہ ہی سحری کا چھوٹ جانا روزہ کے قضا کردینے کے لیے کوئی شرعی عذر ہے۔ اس لیے سحری کے فوت ہوجانے کی وجہ سے روزہ کو ہرگز نہیں چھوڑنا چاہیے۔ بلکہ بغیر سحری کھائے روزہ کا رکھنا فرض اور لازم ہے۔

مسئلہ: سحری میں کھجور کا کھانا مستحب ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

نِعْمَ سُحُوْرُ الْمُؤْمِنِ التَّمْرُ.

مؤمن کی سحری میں کھجور خوب ہے۔

یہ مستحب گویا متروک ہورہا ہے، اس کو رواج دینا چاہیے۔

انتباہ: ایک غلطی عام طور پر یہ ہورہی ہے کہ سحری کھا کر لوگ اکثر سوجاتے ہیں اور نماز فجر کے لیے اُٹھانے کا کوئی انتظام نہیں کیا جاتا، پھر اکثر ایسے وقت پر آنکھ کھلتی ہے کہ جماعت فجر

---

[1] مسلم

ہو چکی ہوتی ہے اور بعض مرتبہ تو وقتِ فجر ہی باقی نہیں رہتا اور سورج نکل چکا ہوتا ہے۔ یہ بہت بڑی غلطی ہونے کے علاوہ نعمتِ خداوندی کی سخت ناقدری بھی ہے کہ خدا تعالیٰ نے تو ہم کو سحری کی اجازت بطورِ انعام کے عطا فرمائی تھی، مگر ہم نے اس نعمت سے کام لینے کے بعد اپنے مُنعم کی یہ ناشکری کی کہ ہمیشہ کے فریضے فجر کو اس کا وقت نکال کر یا تو بالکل فوت ہی کر دیا یا اس کو نامکمل بنا دیا، کیوں کہ بغیر جماعت کے جو نماز ادا کی جاتی ہے وہ ناقص ہوتی ہے، فرض تو ادا ہو جاتا ہے مگر اس پر کامل ثواب نہیں ملتا۔ اس لیے سحری کھا کر ایسی حالت میں ہرگز نہیں سونا چاہیے، جب کہ نمازِ فجر کی جماعت کے لیے اُٹھانے کا کوئی انتظام نہ کیا گیا ہو اور سونے کی وجہ سے جماعت فجر کے فوت ہو جانے کا خطرہ ہو۔ حضراتِ فقہا نے مغرب وعشا کے درمیان سونے کو ایسی حالت میں مکروہ لکھا ہے جب کہ عشا کی جماعت کے لیے بیدار ہونے پر وثوق اور بھروسہ نہ ہو اور اس کے فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو۔

''شامی'' میں ہے:

قَالَ فِي "الْبُرْهَان": وَيُكْرَهُ النَّوْمُ قَبْلَهَا... إلخ. وَقَالَ الطَّحَاوِيُّ: إِنَّمَا كُرِهَ النَّوْمُ قَبْلَهَا لِمَنْ خُشِيَ عَلَيْهِ فَوْتُ وَقْتِهَا أَوْ فَوْتُ الْجَمَاعَةِ فِيهَا. وَأَمَّا مَنْ وَكَّلَ نَفْسَهُ إِلَى مَنْ يُوْقِظُهُ فَيُبَاحُ لَهُ النَّوْمُ... إلخ.[1]

اور یہ خرابی بھی زیادہ اسی وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ عام طور پر لوگ سحری کو اس کے مستحب وقت سے پہلے کھانے کے عادی ہوتے ہیں، پھر صبح صادق میں چوں کہ زیادہ وقت ہوتا ہے اس وجہ سے نیند کا غلبہ ہو کر صبح کی نماز سے محرومی ہو جاتی ہے، اگر سحری آخر میں اس کے مستحب وقت پر کھائی جائے اور صبح صادق ہونے پر اذان کے بعد جلدی جماعت فجر کرنے کا انتظام ہو جایا کرے تو اس طرح اس خرابی کی کافی حد تک اصلاح ہو سکتی ہے۔

فائدہ: فجر کی جماعت میں اِسفار (خوب روشنی) کرکے اس کو ایسے وقت میں ادا کرنا اَحناف رحمہم اللہ کے نزدیک مستحب ہے کہ طلوعِ شمس سے قبل دو مرتبہ مستحب طریقہ پر نماز ادا ہو سکے مگر اس سے

---

[1] ۳۴۲/۱

مقصود تکثیر جماعت ہے اور عام طور پر صبح کا وقت چوں کہ غلبۂ نوم وغفلت کا ہوتا ہے اس لیے عام لوگوں کو جماعت میں شامل کرنے کے لیے اسفار اور تاخیر کرنا مستحب ہے، اور یہی وجہ ہے کہ جماعتِ فجر میں پہلی رکعت کے اندر امام کے لیے طویل قراءت کر کے اس کو دوسری رکعت پر طویل کرنا بالاتفاق مستحب ہے تاکہ لوگ نیند غفلت سے بیداری اور ہوشیاری کے بعد جماعت میں شامل ہوسکیں، تو معلوم ہوا کہ اس میں ضُعَفا کے لیے رحمت اور ان پر خاص نظر عنایت ہے کہ ان کے لیے حق تعالیٰ نے ایسے مواقع مہیا فرمادیے کہ اگر تھوڑی سی ہمت اور ادنیٰ توجہ کی جائے تو جماعت کا ملنا کچھ مشکل نہیں۔

سُبْحَانَ اللّٰہِ جماعت کی اہمیت کو کیسے عجیب طریقہ اور کس نرالے طرز سے ظاہر فرمایا گیا ہے کہ اول تو وقتِ صبح ہوجانے کے بعد ہی حدِ اسفار تک تاخیر کرنے کا حکم دے دیا۔ اب بھی اگر نوم وغفلت رفع نہیں ہوئی تو پھر امام کے لیے تطویلِ رکعتِ اُولیٰ کو سنت قرار دے دیا تاکہ غفلت میں پڑے ہوئے انسان بھی جماعت کے اندر شامل ہوسکیں اور ان کو جماعت کے ثوابِ عظیم میں شریک ہونے کا موقع میسّر آجائے۔

بہر حال فجر کی جماعت میں اسفار سے مقصود تکثیرِ جماعت ہے تو سحری کے بعد اگر سب نمازی جماعت میں شامل ہوجانے کا اہتمام کرلیں تو غلس میں جماعت کرنے سے بھی یہ مقصود تکثیر جماعت حاصل ہوجائے گا۔ پس قبل اسفار جماعت کرنے سے جس محظور کا اندیشہ ہوتا ہے، اس صورت میں وہ محظور نہیں پایا جاتا۔ ”فیض الباری“ میں سرخسی کے حوالہ سے فجر کی نماز غلس میں پڑھنے کو اولیٰ قرار دیا ہے، جس وقت لوگ جمع ہوجائیں۔ اور احادیث غلس کو رمضان پر محمول کیا ہے۔[1]

افطاری کا بیان: اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ہمارے لیے اس عبادت صوم کی ایک خاص حد مقرر فرما کر اس حد کے آنے پر اس کو ختم کرنے اور افطار کرنے کا حکم فرمادیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس وقت اس جگہ سے رات آجاوے (یعنی مشرق کی جانب سے رات کی سیاہی

---

[1] فیض الباری: ۱۳۶/۲

اُٹھ چکے) اور اس جگہ (یعنی مغرب کی طرف) سے دن چلا جاوے اور آفتاب بھی چھپ جاوے اور چلا جاوے دن اس جگہ سے (یعنی مغرب کی طرف سے) اور چھپ جاوے آفتاب تو روزہ افطار کیا روزہ دار نے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ وقت افطار کا ہے۔ ایسے وقت میں افطار کر لینا چاہیے اور یہ وقتِ افطار بڑی ہی خوشی کا وقت ہوتا ہے کہ تمام دن کی مشقت ومحنت، بھوک وپیاس کا خاتمہ اس پر ہو جاتا ہے۔ آں حضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ روزہ دار کے لیے دو وقت خوشی حاصل ہونے کے ہیں: ایک وقت خوشی حاصل ہونے کا تو یہی افطار کا وقت ہے کہ بھوک اور پیاس کی شدت کی حالت میں کھانے پینے کو مل گیا اور تشنگی رفع ہو کر رگیں بھر گئیں۔ اس خوشی کی یہ تو دنیوی حیثیت ہوتی ہے۔ دوسری حیثیت اس کی دینی یہ ہوتی ہے کہ ایک ضعیف البیان بندہ خدا تعالیٰ کے حکم کو بجا لایا اور اپنے رب کے فریضہ کی ادائیگی سے عہدہ برآ ہو گیا۔ یہ وقت واقعی خوش ہونے کا ہے کہ اتنی بھاری عبادت کے بوجھ کو اُٹھا کر یہ عاجز وناتواں انسان ساحلِ مراد پر پہنچ گیا اور اس نے راستہ کے تمام پر خطر عقبات کو عبور کر کے امانتِ الٰہیہ کو شیطانی دست برد سے محفوظ و مامون ادا کر دیا۔

دوسری خوشی روزہ دار کو اپنے رب سے ملاقات کے وقت حاصل ہوگی۔ جب اس کو روزہ کا ثواب راز دارانہ طریقہ پر عنایت کیا جاوے گا۔ اس ثواب کو حاصل کر کے اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔ افطار کی مشروعیت میں چوں کہ ہمارے احتیاج اور ضعف پر نظر فرمائی گئی ہے اور اسی بنا پر روزہ کو افطار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لیے شریعت نے اُمت کو صومِ وصال (بغیر افطار کیے پے در پے روزہ رکھنا) سے منع کیا ہے اور امت کے لیے صومِ وصال مکروہ تحریمی ہے۔ بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضور ﷺ کو صومِ وصال رکھتے ہوئے دیکھ کر جو اشکال کیا تو حضور ﷺ نے اس کو اپنی خصوصیت بتلا کر فرمایا کہ تم میں میری مانند کون ہے؟ مجھے تو شب گزاری کی حالت میں اللہ تعالیٰ کھلا پلا دیتا ہے۔ یعنی ذوقِ معارف اور لذت مناجات وطاعات کے سبب جو غذا روحانی حاصل ہوتی ہے اس کے سبب غذائے جسمانی سے استغنا حاصل ہو جاتا ہے۔ اس لیے بغیر افطار کیے روزہ رکھنے سے ضعف پیدا نہیں ہوتا۔

ہے، وہ افطار میں اس قدر تاخیر کرتے ہیں کہ ستارے گنجان ہوجاتے ہیں، اور ہماری ملت میں یہ عادت اہلِ بدعت کی ہے، ہم کو ان کے خلاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ان کے خلاف کرنے میں یقیناً دین کا غلبہ اور اسلام کی شوکت کا اظہار ہے اور ان کی مخالفت کرنے والا سنت کی متابعت کرنے کی وجہ سے ضرور حق تعالیٰ کی محبت کا حق دار ہے۔ دین کی مضبوطی اور اس کا غلبہ اعدائے دین اور دشمنانِ اسلام اہلِ کتاب کی مخالفت کرنے ہی میں ہے اور مخالفانِ دین کی موافقت کرنے میں دین کا سراسر نقصان اور اس کا ضعف ہے۔ اس طرح اہلِ کتاب اور ہمارے روزہ کے اندر ابتدا اور انتہا دونوں کے لحاظ سے فرق ہوجاتا ہے۔ ہمارے روزہ کی ابتدا میں سحری ہے اور ان کے روزہ میں سحری نہیں ہے۔ ہمارے روزہ کے اندر افطار میں تعجیل ہے بخلاف اہلِ کتاب کے کہ وہ روزہ کے افطار میں تاخیر کرتے ہیں۔

فائدۂ جلیلہ: غروبِ آفتاب کے بعد رات کا آجانا اور افطار کا حلال ہوجانا اہلِ سنت کے اجماع واتفاق سے ثابت ہے۔ بخلاف شیعہ اہلِ بدعت کے کہ ان کے نزدیک ستاروں کے ظاہر ہونے اور سیاہی کے پھیل جانے کے بعد افطار کا وقت ہوتا ہے، اس سے قبل سُورج کے غروب پر یقین ہوجانے کے باوجود وہ افطار کو جائز نہیں سمجھتے۔ جیسا کہ "ارکانِ اربعہ" ص: ۲۰۰ پر ہے:

والمعتبر في نهاية الصوم غروب الشمس، فإذا غربت الشمس جاء الليل وحل الإفطار بإجماع من يعتد بإجماعهم، خلافا للشيعة؛ فإنهم لا يجوّزون الإفطار قبل ظهور الكواكب الثابتة وغشيان الظلمة.

مذہب اہلِ سنت کی دلیل وہ حدیث ہے جس کا ترجمہ افطاری کے بیان کے شروع میں اوپر گزر چکا ہے، یعنی حضرت رسولِ خدا ﷺ کا یہ ارشاد: إذا أقبل الليل وأدبر النهار وغابت الشمس فقد أفطر الصائم.[1]

صاحبِ ارکانِ اربعہ علامہ بحر العلوم لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کو نقل فرما کر دوسری روایت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے نقل فرماتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے فرمایا:

[1] رواه الشيخان

کہ ہم رمضان میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ جب سورج غروب ہوا تو آں حضرت ﷺ نے فرمایا کہ اے فلاں! نیچے اُتر کر ہمارے لیے ستو گھول دے۔ انھوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ابھی تو دن (کی روشنی) ہے۔ آپ ﷺ نے (پھر) فرمایا: نیچے اُتر کر ہمارے لیے ستو بنا دے۔ انھوں نے نیچے اُتر کر ستو گھول دیا اور آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے نوشِ جان فرمایا۔ پھر اپنے ہاتھ سے اشارہ فرمایا کہ جب سورج اس جگہ چلا جاوے اور رات اس جگہ سے آجاوے تو افطار کر لیا روزہ دار نے۔[1] یعنی افطاری کا وقت سورج غروب ہوجانے کے بعد ہوجاتا ہے۔ غروب کے بعد افطار میں کسی انتظار کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مخاطب کو روشنی اور سرخی کی وجہ سے جو افطار کے وقت آنے میں شبہ تھا آں حضرت ﷺ نے اس ارشاد سے اس کو رد فرمادیا۔ ''احکام القرآن'' جصاص میں ہے:

روى أبو سعيد الخدري ﷺ عن النبي ﷺ قال: إذا سقط القرص أفطر.

ولا خلاف في أنه إذا غابت الشمس فقد انقضى وقت الصوم وجاز للصائم الأكل والشرب والجماع وسائر ما حظره عليه الصوم.[2]

احادیث مرفوعہ اور علامہ ابوبکر جصاص حنفی کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ سورج کی ٹکیہ کے غروب ہوتے ہی روزہ کا وقت ختم ہو کر افطار کرنا اور کھانا پینا جائز ہوجاتا ہے جیسا کہ آں حضرت ﷺ کے ارشاد: إِذَا سَقَطَ الْقَرْصُ أَفْطِرْ کا مفاد ہے۔ اسی طرح حدیثِ شیخین: إِذَا أَقْبَلَ اللَّيْلُ وَأَدْبَرَ النَّهَارُ وَغَابَتِ الشَّمْسُ فَقَدْ أَفْطَرَ الصَّائِمُ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ رات کے شروع ہوتے ہی روزہ کا وقت ختم ہوجاتا ہے اور اکمالِ نہار کے لیے رات کے کسی جزو میں اِمساک کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ اس حدیثِ شیخین میں یہ بتلایا گیا ہے کہ سورج کے چھپتے ہی روزہ افطار کرنے کا وقت ہوجاتا ہے، اور یہی مطلب اقبالِ لیل وادبارِ نہار کا ہے۔ چناں چہ علامہ عینی شارحِ ''بخاری'' بھی تعجیل افطار کی حکمت بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

قَالَ الْمُهَلَّبُ: وَالْحِكْمَةُ فِي ذٰلِكَ أَنْ لَّا يُزَادَ فِي النَّهَارِ مِنَ اللَّيْلِ.[3]

---

[1] رواه الشيخان. [2] ۲۸۵/۱. [3] عینی: ۶۷/۱۱

مطلب یہ ہے روزہ جلدی افطار کرنے میں حکمت یہ ہے کہ رات کا کوئی جزو دن میں شامل نہ ہو جائے، جیسا کہ افطار میں تاخیر کرنے سے یہ بات لازم آتی ہے۔

ان احادیث اور عبارات میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ آیتِ کریمہ ﴿ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ﴾[1] میں رات صوم کی حد میں داخل نہیں ہے بلکہ صوم صرف دن کے اندر ہی ہوتا ہے اور سورج کے غروب ہوتے ہی چوں کہ رات آجاتی ہے اس لیے سورج کے غروب ہوتے ہی روزہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

چناں چہ ''ارکانِ اربعہ'' کی عبارتِ بالا سے بھی ایک فائدہ تو یہی حاصل ہوا کہ غروبِ شمس کے ساتھ ہی رات آجاتی ہے اور افطار حلال ہو جاتا ہے۔ غروبِ شمس اور مجئ لیل میں کوئی فصل نہیں ہوتا، بلکہ غروبِ شمس کے لیے مجئ لیل لازم ہے۔ جیسا کہ علامہ بحر العلوم فرماتے ہیں: فَإِذَا غَرَبَتِ الشَّمْسُ جَاءَ اللَّيْلُ وَحَلَّ الْإِفْطَارُ. اس قضیۂ شرط میں إِذَا غَرَبَتِ الشَّمْسُ مقدم ہے اور جَاءَ اللَّيْلُ وَحَلَّ الْإِفْطَارُ تالی ہے، اور ظاہر ہے کہ اس جگہ مقدم مستلزم تالی کو ہے۔ معقولین کے قول: إذا كانت الشمس طالعة فالنهار موجود (جس میں إذا كانت الشمس طالعة مقدم اور فالنهار موجود تالی ہے) کا مطلب یہی سمجھا جاتا ہے کہ سورج کے طلوع ہوتے ہی بلا فصل وجودِ نہار ہو جاتا ہے اور طلوعِ شمس کے لیے وجودِ نہار لازم ہے اور اس قول کا یہ مطلب کسی کے نزدیک بھی صحیح نہیں کہ طلوعِ شمس کے بعد بھی وجودِ نہار میں کسی قسم کا شک وشبہ رہتا ہے۔ جب طلوعِ شمس مستلزم ہے وجودِ نہار کو اور سورج نکلتے ہی دن شروع ہو جاتا ہے تو غروبِ شمس کے مستلزم لیل ہونے اور سورج کے غروب ہوتے ہی رات کے شروع ہو جانے میں کسی طرح کا شبہ کیوں کر ہو سکتا ہے اور جب سورج غروب ہو گیا اور رات شروع ہو گئی تو اب حلِ افطار میں تردد کیوں ہے؟

حاصل یہ ہے کہ غروبِ شمس کے لیے جب وجودِ لیل اور حلِ افطار لازم ہے تو پھر غروبِ شمس کے تحقق کے بعد افطار میں کس امر کا انتظار باقی ہے؟ تو اب امام فی العقائد شیخ ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ نے اگر اپنی تفسیر ''تأويلات القرآن'' میں زیرِ آیت کریمہ ﴿ ثُمَّ اَتِمُّوا

[1] البقرة: ۱۸۷

﴿اِتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیۡلِ﴾ تحریر فرمایا ہے کہ ”اِتمامِ صوم کے لیے غروب آفتاب کا یقینی طور پر ہونا ضروری ہے اور غروب کا یقین تب ہی ہو سکتا ہے جب رات کا ایک جزو دن میں داخل ہو“ تو اس کا مطلب بھی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ سورج کے غروب ہوتے ہی چوں کہ رات کا آنا شروع ہو جاتا ہے اس لیے رات کے ایک جزو کے دن میں داخل ہونے کے لیے غروبِ آفتاب کے بعد کسی دوسری چیز کے انتظار کی ضرورت نہیں ہے۔ سورج کے غروب ہوتے ہی رات کا ایک جزو دن میں خود بخود داخل ہو جاتا ہے اور صوم کا اتمام ہو کر افطار حلال ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ علامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح ”موطأ“ میں تفسیر ”تاویلات القرآن“ کے ہم معنی قول "لكن لا بد من إمساك جزء من الليل؛ ليتيقن إكمال النهار" کو ”منتقی“ سے نقل کرنے کے بعد علامہ باجی کا قول نقل فرمایا ہے:

إن هذا قول أصحابنا ولا يحتاج إليه عندي ؛ لأنه إذا لم يفطر حتى تغيب الشمس فقد استوفى ذلك ولا يتصور فيه غير هذا.[1]

رفعِ اشتباہ: بعض اکابر کے کلام سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسی تاخیر کو افطار کے اندر مکروہ فرماتے ہیں جو حدِ اشتباکِ النجوم تک پہنچ جاوے۔ چناں چہ وہ فرماتے ہیں: إنما يكره تأخيره إلى اشتباك النجوم یعنی افطار اس وقت مکروہ ہوتا ہے جب ستاروں کے ہجوم اور ان کے انبوہ تک اس کو مؤخر کیا جاوے کیوں کہ ستاروں کے انبوہ اور ہجوم ہونے پر ہی اہلِ کتاب کے افطار کا وقت ہوتا ہے اور حسبِ بیان مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم تعجیلِ افطار کے حکم کی علت اہلِ کتاب کی مخالفت ہے۔

لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اکابرِ سلف کے کلام اور علتِ مذکورہ فی الحدیث سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ اشتباکِ نجوم اور ستاروں کے انبوہ سے پہلے قطعی طور پر غروبِ آفتاب کے بعد کا درمیانی تمام وقت مستحب اور افطار کے لیے مسنون ہے جیسا کہ اس زمانہ میں بعض اہلِ علم نے یہ نتیجہ نکالا ہے اور اس پر انھوں نے بطور دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے بعد نمازِ مغرب روزہ افطار فرمانے کو پیش کیا ہے۔ چناں

چہ وہ تحریر کرتے ہیں کہ ''بخاری شریف'' اور ''مسلم شریف'' باب وقت المغرب میں ہے:

إن رسول الله ﷺ كان يصلي المغرب إذا غربت الشمس و توارت بالحجاب.

حضور اکرم ﷺ مغرب کی نماز اس وقت پڑھتے تھے جب آفتاب غروب ہو کر اچھی طرح پردوں میں چھپ جاتا تھا۔

اب اس وقت کے بعد نمازِ مغرب ادا فرمانا اور اس میں سورۂ طور (جیسا کہ صحیحین سے ثابت ہے) کے برابر تلاوت فرمانا اور پھر اس کے بعد (حسب روایت ''کشف الغمہ'' ۱/۲۵۵) روزہ افطار فرمانا اور اس پر خلفائے راشدین کا تعاملِ دائمی اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ یہ وقت تاخیرِ مکروہ میں داخل نہیں ہے بلکہ تعجیل مستحبہ کے اندر ہے۔[1]

مگر حق یہ ہے کہ نہ ان احادیث کے اندر اس نتیجۂ مذکورہ (غروب آفتاب کے بعد سے اشتباکِ نجوم تک تمام وقت تعجیل مستحبہ کے اندر ہے) پر کوئی دلالت ہے اور نہ ہی پیش کردہ عباراتِ فقہیہ اس مطلب کے لیے مفید ہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ غروب آفتاب سے لے کر اشتباکِ نجوم (جو کہ اہل کتاب کے افطار کا وقت ہے) تک تمام وقت کا ایک ہی حکم نہیں ہے۔ بلکہ اس کے تین درجے ہیں: اشتباکِ نجوم اور ستاروں کے ہجوم و انبوہ ہونے پر افطار کرنا تو بوجہ اتباع اہل کتاب کے مکروہ تحریمی ہے۔ اور سورج کے غروب ہونے پر یقین ہوتے ہی فوراً افطار کر لینا مستحب اور تعجیلِ مطلوب میں داخل ہے، جس کو حدیث شریف میں دین کے غلبہ اور اعزاز کا سبب فرمایا گیا ہے، اور مقدارِ رکعتین تک افطار کر لینا بھی اسی تعجیلِ مستحب میں داخل ہے۔ اور مقدارِ رکعتین سے لے کر اشتباک نجوم تک تاخیر کرنی مباح مع کراہت تنزیہی کے ہے۔

لہٰذا جن اکابر کے کلام میں ستاروں کے انبوہ تک تاخیر کو مکروہ فرمایا گیا ہے ان کی مراد مکروہ سے مکروہ تحریمی ہے۔ اشتباک نجوم سے قبل کراہت تنزیہیہ کی وہ نفی نہیں فرماتے بلکہ اشتباک نجوم پر وہ کراہت تحریمیہ کا اثبات فرما رہے ہیں، اور اس سے قبل جس کراہت کی نفی (إنما يكره) سے حرف حصر انما کی وجہ سے مفہوم ہو رہی ہے وہ کراہتِ تحریمیہ کی نفی ہے، کیوں کہ إنما يكره سے

[1] تبليغ القوم في إتمام الصوم: ۸،۷

کراہتِ تحریمیہ ہی کو ثابت فرمایا جارہا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ إنما یکرہ تأخیرہ إلی اشتباك النجوم سے ان بعض اہلِ علم کو اشتباہ واقع ہوگیا، اس لیے انھوں نے اس کو کراہتِ تنزیہیہ پر محمول کر کے اس سے قبل کا تمام وقت تعجیلِ مستحب میں داخل سمجھ لیا اور سورج کے غروب ہونے کے بعد سے اشتباک نجوم تک کا ایک ہی حکم لکھ دیا۔ یا پھر انھوں نے عبارات بالا میں کراہت سے تو کراہتِ تحریمیہ ہی مراد لی ہے، مگر اشتباک نجوم سے قبل جو ایک درجہ کراہتِ تنزیہیہ کا تھا اس سے ان کی نظر چوک گئی اور غروب آفتاب سے لے کر اشتباک نجوم تک کے تمام وقت کو مستحب خیال کرلیا۔ حالاں کہ دو رکعتوں کی مقدار وقت گزر جانے پر تنزیہی کراہت شروع ہوجاتی ہے۔

بہر حال تعجیلِ مستحب سے مراد یہی ہے کہ یقینی طور پر غروبِ آفتاب کے بعد فوراً افطار کر لیا جائے۔ حضور ﷺ کا اس پر دائمی عمل تھا اور اسی کی ترغیب امت کو آں حضرت ﷺ نے فرمائی ہے۔ اس کی تائید میں ان احادیث پر غور کرنے کی ضرورت ہے، جس میں تعجیلِ افطار کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ہونا بیان فرمایا گیا ہے اور حضور ﷺ کے عمل تعجیلِ افطار کے ثواب میں آگے احادیث پیش کی جارہی ہیں۔

اس مقام پر ایک اور امر بھی اس قابل ہے کہ اس پر خوب غور اور اچھی طرح توجہ کی جائے وہ یہ کہ یہ امر مسلّم ہے کہ نماز مغرب اور روزہ کے افطار دونوں کا وقت ایک ہی ہے اور یہ وقت آفتاب کے غروب ہوتے ہی شروع ہوجاتا ہے۔ غروب آفتاب پر افطارِ صوم کے وقت ہوجانے کی بحث تو إذا أقبل اللیل وأدبر النہار وغابت الشمس وغیرہ احادیث سے اوپر گزر چکی ہے۔ اور سورج کے غروب ہوتے ہی مغرب کی نماز کا وقت ہوجانا صحیحین کی حدیث: ان رسول اللہ ﷺ کان یصلي المغرب إذا غابت الشمس و توارت بالحجاب سے بھی معلوم ہورہا ہے۔ کیوں کہ غابت الشمس اور توارت بالحجاب دونوں کے ایک ہی معنی ہیں اور مقصود اس سے سورج کا غروب ہوجانا ہے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللفظان بمعنیً، وأحدهما تفسیر للآخر.[1] بلکہ حدیث ''مسلم'': کنا نصلي المغرب مع رسول اللہ ﷺ فینصرف أحدنا وإنه لیبصر

مواقع نبلہ سے تو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ آں حضرت ﷺ مغرب کے ادا فرمانے میں اس قدر تعجیل فرماتے تھے کہ نمازِ مغرب سے فارغ ہو جانے کے بعد ہی دن کی اتنی روشنی باقی رہتی تھی کہ اس روشنی میں تیروں کی جگہ کو دیکھا جاسکتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ غروب ہوتے ہی اول وقت میں نمازِ مغرب کو ادا فرماتے تھے۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

معناه أنه يبكر بها في أول الوقت بمجرد غروب الشمس حتى ننصرف ويرمي أحدنا النبل عن قوسه ويبصر موقعه لبقاء الضوء. وفي هذين الحديثين أن المغرب تعجل عقب غروب الشمس، وهذا مجمع عليه...... إلخ.[1]

جب حدیث شیخین: أن رسول الله ﷺ كان يصلي المغرب إذا غابت الشمس وتوارت بالحجاب کا مطلب حسبِ تصریح شارح ''مسلم'' یہ ہے کہ سورج کے غروب ہوتے ہی آں حضرت ﷺ مغرب کی نماز کو ادا فرما لیتے تھے اور یہی آپ ﷺ کی عادتِ کریمہ تھی، تو پھر نہ معلوم اس حدیث کے تحت بعض اہلِ علم نے اپنی مذکورہ بالا عبارت میں اس جملہ سے کہ اب اس وقت کے بعد نمازِ مغرب ادا فرمانا کون سا وقت مراد لیا ہے؟ اور ان کے اس فقرہ کا مفہوم کیا ہے؟

بہر حال یہ تو متفق علیہ ہے کہ نمازِ مغرب اور روزہ کے افطار کا وقت ایک ہی ہے اور وہ غروبِ آفتاب کے بعد سے ہی شروع ہوجاتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ نمازِ مغرب میں بھی جلدی کرنا مستحب اور افضل ہے۔ جیسا کہ علامہ بحر العلوم لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ثم تعجيل المغرب أيضًا مندوب كتعجيل الإفطار.[2]

اب اس پر غور کرنا چاہیے کہ مغرب میں جو تعجیل مستحب ہے اس تعجیل سے کیا مراد ہے اور اس کی حد کیا ہے؟ یعنی غروب آفتاب کے بعد کتنی دیر تک تاخیر کر کے نمازِ مغرب کا ادا کرنا تعجیلِ مستحب میں داخل ہے؟ پھر اس کے بعد اس کا فیصلہ آسان ہو جائے گا کہ غروب کے بعد

[1] ۲۲۸/۱ [2] رسائل الأركان: ۲۲۵

کتنی دیر تک تاخیر کرکے روزہ کا افطار کرنا تعجیلِ مستحب میں داخل ہے۔ اس کے لیے فقہا کی درج ذیل عبارات میں غور کیا جانا چاہیے جن میں وقت مغرب کے درجات کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ ''درمختار'' میں ہے:

وأخر المغرب إلى اشتباك النجوم أي كثرتها، أي كُره التأخير لا الفعل؛ لأنه مأمور به تحريمًا.

اس پر علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وهو الأصح. وفي "الحلية" بعد كلام: والظاهر أن السنة فعل المغرب فورًا وبعده مباح إلى اشتباك النجوم، فيكره بلا عذر. قلت: أي يكره تحريمًا، والظاهر أنه أراد بالمباح ما لا يمنع، فلا ينافي كراهة التنزيه ويأتي تمامه قريبًا.[1]

اس عبارت میں تصریح ہے کہ وقت مغرب کے اندر تین درجے ہیں:

پہلا درجہ یہ ہے کہ غروب ہوتے ہی مغرب کو فوراً ادا کرلیا جاوے، یہ درجہ سنت ہے۔

دوسرا درجہ اس کے بعد سے اشتباک نجوم تک کا ہے، یہ درجہ مباح مگر مکروہِ تنزیہی ہے۔

تیسرا درجہ اشتباک نجوم سے آخر وقت تک کا ہے، مگر اشتباک نجوم ہونے پر کراہتِ تحریمیہ ہوجاتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مغرب میں تعجیلِ مستحب سے فقہا کی مراد یہی ہے کہ غروب کے بعد فوراً مغرب کی نماز ادا کرلی جاوے ورنہ کراہتِ تنزیہیہ کی حد میں داخل ہوجائے گی اور خود اس کی حد فقہائے کرام کے نزدیک یہ ہے کہ کسی عذر کے بغیر اتنی تاخیر نہ کی جائے جس میں دو رکعتیں ادا ہوسکیں (اور اس کی تخمینی مقدار تقریباً تین چار منٹ ہوتی ہے) اگر غروب کے بعد دو رکعتوں کی مقدار تاخیر کی گئی تو یہ تاخیر تنزیہی کراہت میں داخل اور خلافِ مستحب ہوگی۔

''درمختار'' میں ہے کہ

وتأخيره قدر ركعتين يكره تنزيهًا.

---

[1] ۳۴۲/۱

اس پر علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

أفاد أن المراد بالتعجيل أن لا يفصل بين الأذان والإقامة بغير جلسة أو سكتة على الخلاف. وأن ما في "القنية" من استثناء التأخير القليل محمول على ما دون الركعتين، وأن الزائد على القليل إلى اشتباك النجوم مكروه تنزيهًا، وما بعده تحريمًا إلا بعذر كما مر.[1]

مغرب کی نماز میں تعجیلِ مستحب کی حد فقہائے کرام کی ان صریح عبارات سے معلوم ہوجانے کے بعد اسی روشنی میں افطار کے اندر تعجیلِ مستحب کی حد کا علم بھی ہوجاتا ہے اور چوں کہ افطار اور نمازِ مغرب دونوں متحد الوقت ہیں اس لیے جب نمازِ مغرب کے وقت میں تین درجے ثابت ہوگئے تو یہی تین درجے افطار میں بھی ثابت ہوجائیں گے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ روزہ میں بھی نماز مغرب کی طرح تعجیلِ مستحب یہی ہے کہ غروب آفتاب کے بعد فوراً افطار کرلیا جاوے، ورنہ دو رکعت کی ادائیگی کی مقدار اس میں تاخیر کرنا کراہت تنزیہیہ پیدا کردے گا، اور اگر بغیر عذر کے اشتباک نجوم اور ستاروں کے انبوہ تک افطار کو مؤخر کیا تو یہ تاخیر مکروہِ تحریمی ہوگی۔ پس ضروری ہے کہ إنما یکرہ تأخیرہ إلی اشتباك النجوم اور اس کے ہم معنی عبارات میں کراہت سے کراہتِ تحریمیہ مراد لی جاوے، جیسا کہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے وقتِ مغرب کی بحث میں تصریح فرمائی ہے کہ اشتباک نجوم پر جو نماز مغرب کے ادا کرنے کو مکروہ کہا ہے اس سے مراد مکروہِ تحریمی ہے۔ اسی واسطے "رسائلِ ارکان" میں مغرب کے بعد افطار کرنے والے کے لیے فرمایا ہے کہ اس کو چاہیے کہ وہ فرض کے بعد سنتوں سے پہلے ہی افطار کرلے اس لیے کہ سنتوں کے بعد افطار کرنے سے تاخیر لازم آجائے گی۔ حالاں کہ فرض اور سنتوں کے ادا کرنے میں چھ منٹ ہی اوسطاً خرچ ہوتے ہیں۔ سورج کے غروب ہوتے ہی مستحب وقت پر اگر فرض اور سنت پڑھ کر افطار کیا جاوے تو اتنے عرصہ میں اشتباک نجوم ہرگز نہیں ہوتا (غروب کے بعد تقریباً پندرہ بیس منٹ میں اشتباک نجوم ہوتا ہے) لیکن پھر بھی علامہ بحر العلوم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص مغرب کے بعد افطار کرے اس کو چاہیے کہ فرض مغرب کے سلام کے بعد ہی افطار کرلے۔ سنن ونوافل کے بعد

[1] ۳۴۳/۱

تک مؤخر نہ کرے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اشتباکِ نجوم سے قبل بھی ایک درجہ وقت کا ایسا ہے جس تک افطار کے مؤخر کرنے کو یہ اکابر روکتے اور منع کرتے ہیں۔اسی طرح علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے جو "بحر" کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے کہ تعجیل مستحب اشتباکِ نجوم سے پہلے ہے۔[1] اس عبارت میں بھی اشتباک نجوم پر کراہت تحریمیہ کا بتلانا مقصود ہے۔یہ مطلب نہیں کہ اشتباکِ نجوم سے قبل کا تمام وقت مستحب ہے۔یہ مراد ان کی کیسے ہوسکتی ہے جب کہ خود انھوں نے "حلیہ" کی اس عبارت پر جس میں انھوں نے مغرب کی فوری ادائیگی کے وقت کے بعد اشتباک نجوم تک مغرب کے ادا کرنے کو مباح کیا تھا تحریر فرمایا ہے کہ صاحب "حلیہ" کی مراد مباح سے غیر ممنوع ہے اور یہ اباحت کراہتِ تنزیہیہ کے منافی نہیں ہے۔تو علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اشتباکِ نجوم سے قبل بھی نماز مغرب کے وقت میں تنزیہی کراہت آجاتی ہے تو پھر ایسے وقت افطارِ صوم میں تنزیہی کراہت کیوں نہ ہوگی؟ اب علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کے منقولہ جزئیہ مذکورہ کا یہ مطلب سمجھنا کیسے صحیح ہوگا کہ اشتباکِ نجوم سے قبل کا تمام وقت مستحب ہے، جب کہ ثابت ہو چکا ہے کہ تعجیلِ مغرب اور تعجیلِ افطار دونوں کا حکم ایک ہے اور تعجیل کا مطلب بھی ایک ہے۔

اور "موطأ" میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے افطار قبل الصلوٰۃ اور بعد الصلوٰۃ دونوں کی جو اجازت منقول ہے اس کا مطلب بھی عباراتِ فقہیہ کی تشریحات کی روشنی میں یہی ہے کہ تعجیلِ مستحب کی حد کے بعد جو اباحت ہے وہ تنزیہی کراہت کے ساتھ ہے۔اور حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے حسبِ روایت "کشف الغمہ" (بشرطے کہ وہ روایت صحیح ہو، جس کی تحقیق نہیں ہوسکی) اگر بعد نمازِ مغرب روزہ افطار فرمانے کا ثبوت ہوتا ہو اور اسی طرح حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما سے جو بعد نمازِ مغرب افطار کرنا مروی ہے اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اشتباکِ نجوم تک کا تمام وقت تعجیلِ مستحب کے اندر داخل ہے، بلکہ کبھی کبھی نماز کے بعد افطار کرکے یہ بتلانا مقصود تھا کہ نماز کے بعد بھی افطار کرنا جائز ہے، تاکہ نماز سے قبل افطار کرنے کو لوگ واجب نہ سمجھنے لگیں۔

چناں چہ مُلا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وأما ما صح أن عمر وعثمان رضي الله عنهما كانا برمضان يصليان المغرب، فهو

[1] ۱۵۷/۲

لبيان جواز التأخير؛ لأن لا يظن وجوب التعجيل.[1]

اور اس افطار بعد از مغرب کو بیانِ جواز کے لیے اس وقت کہنے کی ضرورت ہے جب کہ یہ تسلیم کرلیا جاوے کہ آں حضرت ﷺ نے کسی موقع پر بعد از مغرب افطار فرمایا ہے۔ ورنہ احادیثِ صحیحہ سے تو حضور ﷺ کا مغرب کی نماز سے پہلے ہی افطار فرمانے کا معمول ثابت ہوتا ہے جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ (جو کہ آستانۂ نبوی ﷺ کے خادمِ خاص اور دس سال تک آں حضرت ﷺ کے ہمراہ رہے ہیں) فرماتے ہیں:

ما رأيت رسول الله ﷺ قط صلى صلاة المغرب حتى يفطر ولو كان على شربة من ماء.[2]

میں نے رسول اللہ ﷺ کو کبھی نہیں دیکھا کہ حضرت ﷺ نے افطار کیے بغیر مغرب کی نماز ادا فرمائی ہو اگرچہ یہ افطار پانی کے ایک گھونٹ پر ہی ہوتا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے، فرماتے ہیں:

كان رسول الله ﷺ يفطر قبل أن يصلي على رطبات، فإن لم تكن رطبات فتميرات، فإن لم تكن تميرات حسا حسوات من ماء. رواه الترمذي وأبو داود.[3]

رسول اللہ ﷺ مغرب کی نماز ادا کرنے سے پہلے چند تر کھجوروں سے افطار فرمایا کرتے تھے، اور اگر تر کھجوریں نہ ہوتیں تو خشک کھجوروں سے افطار فرمالیتے، اور اگر یہ بھی نہ ہوتیں تو چند چلو پانی پی لیتے۔

علامہ قاری رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

فيه إشارة إلى كمال المبالغة في تعجيل الفطر.

مطلب یہ ہے کہ نماز سے قبل جو آں حضرت ﷺ افطار کرنے کا اس درجہ اہتمام فرماتے تھے کہ اگر کھجور میسر نہ ہوتی تو پانی کی چند چلوؤں سے ہی افطار فرمالیتے تھے، اس میں

---

[1] بذل المجهود: ۳/۱۴۲ [2] ترغيب: ۴۱، وإسناده جيد. عینی شرح بخاری: ۱۱/۴۷

[3] مشكاة المصابيح: ۱۷۵

اشارہ اس طرف ہے کہ تعجیل افطار میں کمالِ مبالغہ ہونا چاہیے۔

ان احادیثِ صحیحہ کے مقابلہ میں ''کشف الغمہ'' کی افطار بعد الصلوٰۃ والی روایت اگر صحیح بھی ہو تو بھی اس کو کسی عذر کے ساتھ مأوّل کرنا ضروری ہے یا بیانِ جواز پر محمول کرنا چاہیے۔ بہر حال حسب روایت بالا حضور ﷺ کا دائمی طرزِ عمل نماز مغرب سے قبل ہی روزہ افطار فرمانے کا تھا اور کسی وقت اگر بالفرض بعدِ نماز افطار فرمایا ہو تو وہ یا تو کسی عذر کی وجہ سے تھا یا پھر بیانِ جواز کے لیے تھا۔ یہی حال حضرت عمر وعثمان رضی اللہ عنہما کے افطار بعد الصلوٰۃ کا ہے کہ وہ بھی اصلاحِ عقیدہ اور بیانِ جواز کے لیے تھا۔ جیسا کہ ''بذل المجہود'' کے حوالہ سے اوپر گزر چکا ہے۔

اس جگہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وہ روایت جس میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے عمل تاخیر افطار کا ذکر ہے اس کا محمل بھی معلوم ہو گیا کہ وہ بھی بیانِ جواز کے لیے تھا۔ یا پھر وہ کسی عذر کی وجہ سے تاخیر فرماتے تھے۔ جیسا کہ اس روایت کے تحت میں علامہ قطب الدین حنفی رحمۃ اللہ علیہ ''مظاہر حق'' میں تحریر فرماتے ہیں: انھوں نے عمل کیا بیانِ جواز پر یا کچھ عذر ہو گا۔ اسی طرح حضرت شارح ابو داوٗد مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

والأحسن أن يحمل عمل ابن مسعود رضی اللہ عنہ على السنة، وعمل أبي موسىٰ رضی اللہ عنہ على بيان الجواز.[1]

یہ بھی ظاہر ہے کہ ان حضرات اکابر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل افطار تاخیر اہلِ کتاب کے وقت افطار اشتباکِ نجوم سے پہلے پہلے ہی ہو گا، کیوں کہ ایسے جلیل القدر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے یہ کیوں کر متصور ہو سکتا ہے کہ وہ اہلِ کتاب کے افطار کے وقت تک اپنے افطار کو موخر فرماتے ہوں۔ لیکن پھر بھی ان حضرات کے عمل کو شارحینِ حدیث نے بیانِ جواز پر محمول فرمایا ہے۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے عملِ تعجیل کو حضرت ﷺ کے عمل مبارک سے مؤید فرما کر حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے عمل پر تصریحاً ترجیح دی ہے۔ اس سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ آں حضرت ﷺ افطار میں تعجیل فرماتے تھے، غور کرنے کے بعد

---

[1] بذل المجہود: ۱۴۱/۳

معلوم ہوسکتا ہے کہ اشتباک نجوم سے قبل کے تمام وقت کا حکم ایک نہیں اور یہ تمام وقت تعجیلِ مستحب کے اندر داخل نہیں ہے جیسا کہ بعض اہلِ علم کو مغالطہ ہوگیا ہے۔ دراصل حالتِ صوم میں تعجیلِ مغرب اور تعجیلِ افطار دو حکم جمع ہو جاتے ہیں۔ لیکن حضرت رسولِ خدا ﷺ اور عامۂ صحابہ رضی اللہ عنہم نے تو تعجیلِ افطاری کو اختیار فرمایا ہے (اور نماز سے پہلے افطار فرمانے پر دائمی طور پر عمل فرمایا ہے اور اگر آں حضرت ﷺ سے کبھی بعد از نمازِ مغرب افطار فرمانا ثابت ہو تو وہ بیانِ جواز کے لیے ہوگا)۔ اور حضرت عمر وعثمان رضی اللہ عنہما نے حسبِ روایتِ ''موطاً'' نمازِ مغرب میں تعجیل کی فضیلت حاصل کرنے کے خیال سے افطار سے قبل جلدی نمازِ مغرب کو ادا فرمایا ہے، مگر ان کا بھی یہ دائمی عمل نہ تھا۔ جیسا کہ بعض اہلِ علم کو روایت میں کان کے آنے اور کان کی حقیقت پر غور نہ کرنے کی وجہ سے شبہ ہوگیا، اور انھوں لکھ دیا کہ اس پر خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا تعامل دائمی تھا بلکہ بیانِ جواز کے لیے کبھی ایسا بھی کر کے دکھلا دیا۔

جناب آں حضرت ﷺ سے افطار قبل الصلوٰۃ پر عمل کرنا دائمی طور پر ثابت ہے اور یہی عمل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اندر عام طور پر شائع اور رائج اور معمول تھا، تو اب ضروری ہے کہ اسی کو ترجیح دی جائے اور ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر وعثمان رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں افطار کے وقت عام طور پر کھانے پینے میں مشغولی اس قدر ہونے لگی ہو کہ جس سے نمازِ مغرب میں تعجیلِ مطلوب فوت ہو کر تاخیر کی لوگوں کو عادت ہونے لگی ہو۔ تو ان حضرات نے اس کی اصلاح کے لیے کبھی افطار بعد الصلوٰۃ پر عمل فرمالیا ہو تو یہ تاخیر افطار نمازِ مغرب میں تاخیر کو روکنے اور تعجیل کی فضیلت کے حاصل کرنے کے لیے ہوئی، لیکن تاخیرِ افطار کا جو مطلب اس زمانہ میں سمجھا گیا ہے وہ تو ہرگز ان حضرات کا مقصد نہ تھا کہ افطار تو قبلِ صلوٰۃ ہی کرتے ہیں مگر غروب کے بعد کافی دیر اور تاخیر سے کرتے ہیں۔ اس صورت میں نہ تو تعجیلِ افطار پر عمل ہوتا ہے نہ ہی تعجیلِ صلوٰۃ پر۔

بہر حال نمازِ مغرب میں تعجیل کی غرض سے افطار کو نماز کے بعد تک مؤخر کرنا تو ان دونوں حضرات کے کبھی کبھی کے عمل سے حسبِ روایت ''موطأ'' ثابت ہوتا ہے اور اس غرض سے اتنی معمولی تاخیر افطار میں کرنے کا کچھ حرج نہیں۔ بلاوجہ تاخیر کرنا مکروہِ تنزیہی ہے اور چوں کہ حضرت عمر وعثمان رضی اللہ عنہما (جن سے افطار بعد از مغرب کا ثبوت روایتِ ہٰذا سے ہوتا ہے) سے

مغرب کی نماز کے اندر سورۂ طور کے برابر تلاوت فرمانے کا ثبوت ہی نہیں۔ اس لیے تعجب ہوتا ہے کہ بعض اہلِ علم نے ان دونوں حضرات کو اس روایت کے مضمون میں کیسے شامل کر لیا جس میں آں حضرت ﷺ کا مغرب میں سورۂ طور پڑھنا ثابت ہے، مگر اس زمانہ کے مروجہ عمل پر کہ نماز اور افطار دونوں میں تاخیر کی جاتی ہے، ان[1] حضرات کے عمل میں کوئی سند نہیں ہے۔

یہ سب تقریر اس وقت ہے جب کہ روایۃ ''موطأ'' وغیرہ میں افطار بعد الصلوٰۃ سے افطار کے معلولی اور متبادر معنی (روزہ کھولنا) مراد ہوں جس کو افطار اجمالی کہنا مناسب ہے۔ لیکن احتمال یہ بھی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ جن روایات میں افطار بعد الصلوٰۃ کا ذکر ہے ان میں افطار سے طعامِ شام اور افطارِ تفصیلی مراد ہو تو اس صورت میں افطار قبل الصلوٰۃ اور افطار بعد الصلوٰۃ کی روایات میں اس طرح تطبیق دی جا سکتی ہے کہ افطار قبل الصلوٰۃ کی روایات کو افطارِ اجمالی (روزہ کھولنے) پر محمول کیا جاوے اور افطار بعد الصلوٰۃ سے افطارِ تفصیلی (کھانا کھانا) مراد لیا جاوے۔ اب روایت ''موطأ'' کا مطلب بھی افطار قبل الصلوٰۃ کی روایات کے مطابق یہ ہوسکتا ہے کہ یہ حضرات مختصر طریقہ پر کھجور یا پانی سے افطار اجمالی قبل از مغرب فرما لیتے ہوں اور بعد نماز مغرب تفصیلی افطار کرتے اور طعام کے تناول فرمانے میں مشغول ہوتے ہوں۔ "التعلیق الممجد"[2] میں ہے: **أو لأن الإفطار المتعارف عندهم أن يتعشوا بطعامهم.**

اور اس سے مقصد اس طریقہ کی اصلاح ہو جس کی وجہ سے کھانے پینے میں مشغولی کے سبب نماز مغرب میں تعجیلِ مستحب فوت ہونے کی عادت ہونے لگی ہو جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

اور افطار کے یہ معنی (طعامِ شام) اس حدیث سے بھی مستفاد ہوتے ہیں، جس میں حضور ﷺ نے روزہ کھلوانے پر مغفرتِ ذنوب اور دوزخ سے آزادی کی بشارت دی ہے۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ بشارت سن کر عرض کیا: **ليس كلنا نجد ما نفطر به الصائم.** (ہم سب کے پاس اس قدر کہاں ہے کہ روزہ دار کو اس کے ساتھ افطار کرادیں)۔ تو ان حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے

[1] قال علي القاري في وجه تأخير عمر وعثمان الإفطار عن الصلاة: إنهما كانا في المسجد وكانا غير معتكفين ورأيا الأكل والشرب لغير المعتكف مكروهين، لكن إطلاق أحاديث التعجيل ظاهر في استثناء حال الإفطار.

[2] التعليق الممجد: ۱۸۸

افطار سے شام کا کھانا مراد لیا تب ہی تو اشکال ہوا۔ ورنہ ایک گھونٹ لسی یا ایک کھجور اور ایک گھونٹ پانی کے ساتھ روزہ کھلوا دینے سے اس ثواب عظیم کے حاصل کرنے کی ہمت کرنے کو تو وہ سب حضرات تیار تھے۔ چناں چہ جب آں حضرت ﷺ نے افطار کے وہ معنی خلاف متعارف ان کو بتلا دیے کہ یہ ثواب تو کسی کھجور وغیرہ سے افطار کرانے پر بھی ملتا ہے تو پھر کسی نے ناداری کا عذر پیش نہیں کیا۔ تو معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک افطار کے متعارف معنی شام کے وقت پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے تھے۔ اسی لیے "التعليق الممجد" میں فرمایا ہے: أو لأن الإفطار المتعارف عندهم أن يتعشوا بطعامهم.

چوں کہ حضور ﷺ اور عام طور پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل دائمی طور پر افطار قبل الصلوٰۃ کا ہے۔ اس لیے حضرت عمر وعثمان رضی اللہ عنہما کے متعلق كانا يفطران بعد الصلاة کا عمل جب سامنے آیا تو اس کے مختلف جوابات دیے گئے اور اس کی متعدد توجیہات علمائے کرام کو کرنے کی ضرورت پیش آئی، اپنی بساط کے موافق جن کی تفصیل شرح وبسط کے ساتھ گزر چکی ہے۔ والحمد لله على ذلك.

اس عادت مستمرہ کی بنا پر نماز سے قبل افطار کرنے کو حضرات فقہائے کرام نے تصریحاً مستحب فرمایا ہے۔ علامہ طحطاوی "شرح مراقی" میں فرماتے ہیں:

ويستحب الإفطار قبل الصلاة.[1]

نماز سے پہلے افطار کرنا مستحب ہے۔

اسی طرح "عالمگیریہ" میں ہے:

وتعجيل الإفطار أفضل، فيستحب أن يفطر قبل الصلاة.[2]

افطار میں جلدی کرنا افضل ہے۔ لہٰذا نماز سے پہلے افطار کرنا مستحب ہے۔

تحقیق: جب تحقیق بالا سے یہ امر ثابت ہو چکا کہ افطار میں افضل یہی ہے کہ قبل الصلوٰۃ ہو اور اسی کو فقہا نے مستحب لکھا ہے تو اب اگر کسی موقع پر آں حضرت ﷺ یا کسی صحابی سے نماز کے

[1] ۳۹۷ [2] ۱۰۲/۱

بعد افطار کرنا ثابت ہو تو کسی عارض کی وجہ سے ہوگا یا جوازِ حدِ اباحت کے بیان کرنے کے لیے ہوگا۔ اب اس کو امت کے لیے اس طرح تو پیش کیا جاسکتا ہے کہ کسی عذر کی وجہ سے اس پر عمل جائز ہے اور بغیر عذر کے بھی اگر کوئی شخص اس پر عمل کرلے گا تو وہ عمل جواز کی حد اور اباحت کے دائرے میں رہے گا اور عامل کراہتِ تحریمیہ کا مرتکب نہ ہوگا۔ بشرطے کہ اشتباکِ نجوم تک افطار کو مؤخر نہ کیا ہو، اگرچہ بغیر عذر ایسا کرنا ترکِ اولیٰ ہونے کی وجہ سے ثواب میں کمی کا باعث ہوگا۔ مگر اس پر عمل کرنے کے لیے عام حالات میں لوگوں کو دعوت وتبلیغ نہیں کی جاسکتی۔

اس کی ایک نظیر وضو ہے کہ حضور ﷺ نے کسی وقت اعضائے وضو کو ایک ایک مرتبہ دھویا ہے اور کسی وقت دو دو مرتبہ دھونا ثابت ہے۔ لیکن یہ عمل چوں کہ بیانِ جواز کے طور پر تھا اس لیے اس کی تبلیغ عام طور پر نہیں کی جاتی عام تبلیغ تو ایسے عمل کی کی جاتی ہے جس کی ترغیب حضرت شارع علیہ السلام نے فرمائی ہو اور وہ شریعت کا مقصود ہو، جیسا کہ وضو میں ہر عضو کو تین تین مرتبہ دھونا شارع کی عادتِ مستمرہ اور دائمی عمل تھا اور اس پر قولی ترغیب سے معلوم ہوا کہ یہ عمل مقصودِ شریعت اور مستحب ہے اس لیے اس کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی جائے گی اور اس پر عمل کی ترغیب دی جائے گی۔ اسی طرح افطار قبل الصلوٰۃ پر آں حضرت ﷺ کا عمل دائمی طور پر تھا اور نماز کے بعد اگر افطار فرمانا آپ ﷺ سے ثابت ہو تو کسی وقت بیانِ جواز کے لیے آپ ﷺ نے ایسا کیا ہوگا یا کچھ اور عذر ہوگا۔ اس لیے افطار قبل الصلوٰۃ ہی مستحب اور مقصودِ شریعت ہے اس کی ترغیب اور ترویج میں سعی اور کوشش کی جانی چاہیے اور کہنا چاہیے کہ کھجور یا پانی سے اذان کے ساتھ ہی افطار کرلیں اور افطار کا کھانا نماز کے بعد کھائیں۔

تنبیہ: حضور ﷺ جس عمل کو بیانِ جواز کے لیے کرتے تھے آپ کو اس پر پورا ثواب عنایت ہوتا تھا، کیوں کہ آپ ﷺ کا مقام اور منصب بیانِ تشریع ہے اور آپ ﷺ اس بیان کے مامور تھے، اس لیے اس کے بیان میں اتباعِ امرِ الٰہی کے باعث آپ ﷺ رخصت پر عمل فرما کر بھی عزیمت پر عمل کرنے کے برابر مکمل ثواب کے مستحق ہوتے تھے۔ اور آپ ﷺ کے ثواب میں عزیمت پر عمل کے ترک کے باعث ذرا بھی کمی نہیں آتی تھی۔ اس لیے خوب یاد رکھنا

چاہیے کہ اگر کسی موقع پر حضور ﷺ سے بیانِ جواز کے لیے نماز کے بعد افطار فرمانا ثابت ہو تو آں حضرت ﷺ کو اس افطار بعد الصّلوٰۃ میں بھی تعجیلِ مستحب یعنی نماز سے قبل افطار کرنے کے برابر ثواب ملا ہے۔ جیسا کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے بحث وضو میں فرمایا ہے:

كما توضأ ﷺ مرة مرة في بعض الأوقات بيانًا للجواز وكان في ذلك الوقت أفضل في حقه ﷺ؛ لأن البيان واجب عليه ﷺ [1]

مگر یہ آں حضرت ﷺ کے ساتھ ہی مخصوص ہے دوسرا کوئی شخص بغیر عذر اگر اس پر عمل کرے گا تو اس کے ثواب میں کمی آجائے گی۔

ایک استدلال پر نظر: اب رہ گئی صحیحین کی وہ روایت جس میں مغرب کی نماز کے اندر حضور ﷺ کے سورۂ طور پڑھنے کا ذکر ہے، اس کو "کشف الغمہ" کی اس روایت کے ساتھ جس میں بعد المغرب افطار کا ذکر کیا گیا ہے (اگر وہ روایت صحیح ہو، ورنہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت اس کے صریح معارض ہے، جس میں تصریح ہے کہ انھوں نے حضور ﷺ کو ہمیشہ نماز مغرب سے پہلے ہی افطار کرتے دیکھا ہے) ملا کر یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ تمام وقت تعجیلِ مستحب کے اندر ہے، یہ استدلال بوجوہ ذیل مفیدِ مدّعا نہیں، اوّل تو جن طویل سورتوں کا مغرب میں پڑھنا ثابت ہے اس کے متعلق یہ توجیہ کی گئی ہے کہ ممکن ہے آپ نے ان سورتوں کا کچھ حصہ پڑھا ہو پوری سورت نہ پڑھی ہو:

وقال الكرماني: يحتمل أن يراد بالسورة بعضها، وإليه مال الطحاوي. [2]

اور قرأ في المغرب بالطور کے نیچے بین السطور محشی تحریر فرماتے ہیں:

يجوز أن يريد بها بعضها. [3]

دوسرے یہ کہ سورۂ طور اگر پوری بھی پڑھی ہو تو یہ کیسے ثابت ہوا کہ جس دن کی

---

[1] النووي: ١٢٤/١ وفتح الملهم: ١٠٤/١ [2] حاشية البخاري: ١٠٥/١

[3] حاشیہ بخاری شریف ۱۰۵/۱

مغرب میں آپ ﷺ نے سورۂ طور پڑھی تھی اس روز آپ کا روزہ تھا؟ اس لیے کہ یہ روایت حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی ہے جب کہ وہ بدر کے قیدیوں کا فدیہ لے کر آئے تھے اور اب تک مسلمان بھی نہ ہوئے تھے۔ وہ کہتے ہیں: میں نے آپ ﷺ کو مغرب میں سورۂ طور پڑھتے ہوئے سنا تو میرا دل اڑنے لگا۔ جنگِ بدر ۱۷ یا ۱۸ رمضان کو ہوئی تھی تو وہ فدیہ قیدیوں کا رمضان کے بعد ہی لائے تھے اس وقت آپ ﷺ کا روزہ کہاں ثابت ہوا؟ اور اگر یہ بھی ثابت ہو جاوے کہ اس دن آپ ﷺ روزہ سے تھے تو یہ کس دلیل سے ثابت ہوا کہ آپ ﷺ نے وہ روزہ بعد از نمازِ مغرب افطار فرمایا تھا۔ کیوں کہ نہ تو مغرب کی نماز میں سورۂ طور کا پڑھنا آپ ﷺ کا دائمی عمل تھا اور نہ ہی افطار بعد از نماز مغرب آپ کی عادتِ مستمرہ تھی۔ تو یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ جس دن کی مغرب میں آپ ﷺ نے سورۂ طور پڑھی ہو اس دن یا تو آپ ﷺ کا روزہ ہی نہ ہو، یا روزہ تو ہو مگر اس کو نماز سے پہلے افطار فرمالیا ہو۔ جیسا کہ اکثر آپ کی عادتِ مبارکہ یہی تھی اور جس دن کے روزے کو آپ ﷺ نے بعد از نماز مغرب افطار فرمایا ہو اس دن کی مغرب میں آپ ﷺ نے سورۂ طور نہ پڑھی ہو۔

بہر حال جب تک کسی دلیل صحیح سے یہ نہ ثابت کر دیا جائے کہ آں حضرت ﷺ نے جس دن کی مغرب میں سورۂ طور یا اس کے برابر کوئی دوسری سورت پڑھی ہے (اگر پوری سورت کا پڑھنا تسلیم کرلیا جاوے) اس دن آپ کا روزہ تھا، اور پھر یہ نہ ثابت کر دیا جاوے کہ وہ روزہ آپ ﷺ نے نمازِ مغرب کے بعد افطار فرمایا تھا، اس وقت تک تو صرف اتنی بات بھی ثابت نہیں ہوسکتی کہ مغرب میں سورۂ طور کے برابر تلاوت فرما کر آں حضرت ﷺ نے کبھی روزے کو افطار فرمایا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ مدعا تو کیسے ثابت ہوسکتا ہے کہ تعجیلِ مستحب کا وقت اتنا لمبا اور طویل ہے کہ اس میں سورۂ طور کے برابر قراءت کے ساتھ مغرب ادا کر کے بھی افطار کیا جاسکتا ہے اور پھر بھی یہ افطار تعجیلِ مستحب کے دائرہ کے اندر ہی رہتا ہے۔

غور کرنا چاہیے کہ جب احادیث سے مغرب کی نماز کے اندر دوسری چھوٹی سورتوں کا پڑھنا حضور ﷺ سے بکثرت ثابت ہے، اسی وجہ سے قصارِ مفصل کے پڑھنے کو فقہا نے مغرب

کی نماز میں مستحب فرمایا ہے اور نمازِ مغرب سے قبل روزہ کے افطار کرنے پر بھی آں حضرت ﷺ کا دائمی عمل تھا اور اس کے مستحب ہونے پر فقہا کی تصریحات بھی اوپر گزر چکی ہیں، تو اب کسی خاص دن کی مغرب کی نماز کے اندر طویل سورت قراءت کرنے (جو کبھی بیانِ جواز اور وقتِ مغرب کے طول کو بیان کرنے کے لیے کی گئی ہوگی) اور کسی خاص دن کے افطار بعد الصلوٰۃ (بالفرض اگر وہ ثابت ہو) دونوں کو ملا کر تعجب ہوتا ہے کہ اس سے یہ نتیجہ کیسے نکال لیا گیا کہ نمازِ مغرب میں سورۂ طور کے برابر تلاوت کے بعد افطار فرمایا گیا ہے۔

اور یہ تو بہت ہی عجیب بات ہے کہ مختلف اوقات کے ان دو واقعات کو ملا کر افطار کے مستحب وقت کے طویل ہونے پر استدلال کیا گیا ہے۔

اس استحباب کے اثبات کے لیے استدلالِ مذکور کی صحت اوّل تو دو امروں کے ثبوت پر موقوف ہے: ایک تو یہ کہ دائمی طور پر طویل سورتوں کا مغرب میں پڑھنا آں حضرت ﷺ سے ثابت ہو۔ دوسرے بعد از مغرب افطار کرنا آپ کا دائمی عمل ہو۔ جب تک یہ دونوں امور دائمی طور پر ثابت نہ ہوں اس وقت تک افطار کے مستحب وقت کا اس قدر طویل ہونا ثابت نہیں ہو سکتا جس کا دعویٰ کیا گیا ہے، کیوں کہ ایک آدھ مرتبہ اگر ایسا واقعہ ہوا بھی ہو کہ سورۂ طور کے برابر تلاوت کرنے کے بعد حضور ﷺ نے افطار فرمایا ہو تو اس میں بیانِ جواز و اباحت کے احتمال ہونے کے ساتھ یہ بھی احتمال ہے کہ اس کو آں حضرت ﷺ کی خصوصیت پر محمول کیا جائے کیوں کہ آپ کے لیے وقتِ قلیل میں قراءتِ کثیرہ بعید نہیں۔ جیسا کہ داؤد علیہ السلام کے لیے حدیث میں آیا ہے کہ گھوڑا کسنے کا حکم دیتے اور کسنے تک زبور ختم کر لیتے۔ اگر کسی دن کی مغرب میں سورۂ طور پڑھنے سے یہ استدلال صحیح ہے کہ مغرب میں سورۂ طور کے برابر تلاوت کرنے کے بعد بھی افطار کرنا تعجیلِ مستحب کے دائرہ میں ہے باوجود یہ کہ سورۂ اعراف سورۂ طور سے بہت طویل ہے، اگر اس سے استدلال کیا جاتا تو مقصود کے زیادہ موافق ہوتا، اگرچہ حقیقت میں وہ مُثبت مدعا نہ ہوتا۔ کما ذکر مفصلاً۔

تعجیلِ افطار اور اسی طرح تاخیرِ سحور کا مسئلہ حضرات اکابر صوفیا رحمہم اللہ کے نزدیک بھی معمول بہا اور ان کے کلام میں بھی مذکور ہے۔ چناں چہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اور افطار میں جلدی کرنا اور سحری کو دیر سے کھانا سنت ہے۔ اس بارے میں آں حضرت ﷺ بڑا مبالغہ کرتے تھے اور شاید سحری کی تاخیر اور افطار کی جلدی میں اپنے عجز و احتیاج کا اظہار ہے جو مقامِ بندگی کے مناسب ہے اور کھجور یا چھوہارے سے افطار کرنا سنت ہے۔[1]

حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت میں تعجیلِ افطار اور سحری کی تاخیر کے اندر آں حضرت ﷺ کے مبالغہ فرمانے کا ذکر ہے۔ اس پر خاص غور کیا جائے اور تعجیلِ افطار اور تاخیرِ سحور میں جو حکمت حضرت نے بیان فرمائی ہے یہ ان ہی حضرات کا حصہ ہے جن کو مقامِ عبدیت سے نوازا گیا ہے۔

افادہ: اب آخر میں ایک ایسی تحریر پیش کر کے اس مسئلۂ تعجیلِ افطار کو ختم کیا جاتا ہے جس کے تسلیم کرنے اور حجت ہونے میں ان حضرات کو بھی مجالِ گفتگو نہیں ہو سکتی جو شیعہ اثرات سے متاثر ہونے کی وجہ سے افطارِ صوم میں تاخیر کر کے خواہ مخواہ مسلمانوں میں اختلاف اور خلفشار کا سبب بن جاتے ہیں۔

فاضل بریلوی مولوی احمد رضا خان صاحب اس سوال کے جواب میں کہ دعائے افطار: اَللّٰهُمَّ لَكَ صُمْتُ وَعَلٰى رِزْقِكَ أَفْطَرْتُ افطار سے پہلے پڑھی جاوے یا افطار کے بعد پڑھنی چاہیے؟ تحریر کرتے ہیں:

اگر عمرو بعد غروبِ شمس یہ دعائیں پڑھ کر افطار کرے اور زید بعد غروب فوراً افطار کر کے پڑھے تو دیکھنا چاہیے کہ ان میں کس کا فعل اللہ عزوجل کو زیادہ محبوب ہے۔ حدیث شاہد عدل ہے کہ فعلِ زید زیادہ پسند حضرت جل وعلا ہے کہ رب العزت تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: إن أحب عبادي إلي أعجلهم فطرًا (مجھے اپنے بندوں میں سے وہ زیادہ پیارا ہے جو ان میں سب سے زیادہ جلد افطار کرتا ہے۔) شک نہیں کہ صورتِ مذکورہ میں زید کا افطار جلد تر ہوا، تو یہی طریقہ زیادہ پسندیدہ ومرضی رب اکبر ہوا۔ جل جلاله و عم نواله.

عادتِ کریمہ تھی کہ غروب کے قریب کسی کو حکم فرماتے کہ بلندی پر جا کر آفتاب کو دیکھتا رہے۔ وہ نظر کرتا ہوتا اور حضور اقدس ﷺ اس کی خبر کے منتظر ہوتے اُدھر اس نے عرض کی کہ سورج

---

[1] مکتوب: ۴۵/۱

ڈوبا اِدھر حضور ﷺ نے خرما وغیرہ تناول فرمایا۔

اس کے بعد حدیث سہل رضی اللہ عنہ اور حدیث ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کو جس کا ترجمہ اوپر کیا گیا ہے حاکم اور ''طبرانی کبیر'' سے بالفاظ نقل کرنے کے بعد ''کشف الغمہ'' سے نقل کرتے ہیں:

كانت عائشة رضي الله عنها تقول: رأيت رسول الله ﷺ وهو صائم يترصد غروب الشمس بتمرة فلما توارت ألقاها في فيه.

اس کے بعد لکھتے ہیں۔

یہ تینوں حدیثیں بھی اس تقدیمِ افطار کا پتہ دیتی ہیں کہ اخبارِ افطار میں اصلاً فصل نہ تھا۔ کما لا یخفی۔[1]

فاضل بریلوی اتنی تاخیر کو بھی پسند نہیں کرتے کہ غروب کے بعد مختصر طور پر دعائے افطار پڑھ کر افطار کیا جائے بلکہ ان کے نزدیک پسندیدۂ رب العزت یہ ہے کہ غروب کے بعد فوراً افطار کرلیا جائے۔ افطار کے بعد دعا پڑھی جائے۔ افطار میں تاخیر کرنے والوں اور ان لوگوں کو ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرنا چاہیے۔ جن کو غروب ہوجانے کے باوجود بھی افطار کے وقت ہونے میں شک ہی رہتا ہے اور اس شک کو مٹانے کے لیے غروب کے بعد دس بارہ منٹ تک تاخیر کرکے افطار کرتے ہیں۔

علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانہ کی اس بدعت تعجیلِ سحور اور تاخیرِ افطار کے متعلق کیا خوب فرمایا ہے:

من البدع المنكرة ما أحدث في هذا الزمان من إيقاع الأذان الثاني قبل الفجر بنحو ثُلُث ساعة في رمضان، وإطفاء المصابيح التي جعلت علامة لتحريم الأكل والشرب لمن يريد الصيام؛ زعمًا ممن أحدثه أنه للاحتياط في العبادة، ولا يعلم بذلك إلا آحاد الناس، وقد جرّهم ذلك إلى أن صاروا لا يؤذنون إلا بعد الغروب بدرجة لتمكين الوقت فيما زعموا، فأخروا الفطر وعجلوا السحور وخالفوا السنة، فلذلك قلّ

[1] العروس المعطار في زمن دعوة الإفطار: ۹،۸،۷

عنهم الخير وكثر فيهم الشر، والله المستعان.[1]

مسئلہ: کھجور یا چھوہارے سے روزہ کھولنا بہتر اور افضل ہے اگر میسّر ہو، ورنہ پانی سے افطار کرلے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ افطار کرنے والے کو چاہیے کہ کھجور پر افطار کرلے، یقیناً وہ سبب برکت اور زیادتی ثواب کا باعث ہے، اگر کھجور نہ ملے تو پانی پر افطار کرلے بے شک وہ پاک کرنے والا ہے۔ آں حضرت ﷺ کا یہ معمول اوپر گزر چکا ہے کہ نمازِ مغرب سے پہلے روزہ افطار فرماتے، اس وقت اگر کھجور نہ ہوتی تو پانی سے روزہ افطار فرماتے تھے۔ افطار میں آپ ﷺ کو یہ پسند تھا کہ تین کھجوریں ہوں یا ایسی چیز ہو جس کو آگ میں نہ پکایا گیا ہو، اگرچہ آگ پر پکی ہوئی چیز سے روزہ کھولنے میں بھی کوئی خرابی روزہ میں نہیں آتی، مگر بہتر یہ ہے کہ کوئی دوسری چیز ہو اور کھجور ہو تو سب سے افضل ہے۔

فائدہ: بعض آدمی نمک سے افطار کرنے میں ثواب سمجھتے ہیں یہ عقیدہ غلط ہے۔ کھجور اور پانی کے سوا جس چیز کے ساتھ بھی روزہ افطار کیا جائے سب چیزیں برابر ہیں البتہ ہر میٹھی چیز بھی کھجور کے حکم میں ہے۔ ''زادالمعاد'' میں ہے:

فإن إعطاء الطبيعة الشيء الحلو مع خلو المعدة أدعى إلى قبوله وانتفاع القوى به، لا سيما القوة الباصرة؛ فإنها تقوى به، وحلاوة المدينة التمر.[2]

بعض احادیث سے پانی میں ملے ہوئے دودھ سے روزہ افطار کرنے کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

فائدہ: کھجور سے افطار کرنے میں "زاد المعاد" اور "أشعة اللمعات" کے بیان کے موافق یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ معدہ کے خالی ہونے اور کھانے کی خواہش کی حالت میں کھانے کو معدہ خوب قبول کرتا ہے۔ ایسی حالت میں جو شیرینی معدہ میں پہنچتی ہے تو بدن کو اس کا بہت فائدہ ہوتا ہے۔ خاص طور پر قوتِ باصرہ کو شیرینی سے خاص نفع ہوتا ہے اور شیرینی چوں کہ عرب میں کھجور ہی کی ہوتی ہے اور وہ ان کے مزاجوں کے بھی بہت مناسب ہے، اس لیے کھجور سے افطار کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے۔ اور یہ حکمت چوں کہ ہر میٹھی چیز کے افطار کرنے میں حاصل ہوسکتی ہے اس لیے

---

[1] بذل المجهود شرح أبي داود: ۱۴۱/۳، وزرقاني على الموطأ: ۱۵۸/۲

[2] ۱۶۰/۱، أشعة اللمعات: ۸۳/۲

ہر میٹھی چیز کھجور کے حکم میں ہے۔ کما في ''بہشتی زیور''۔ لیکن کھجور سے افطار کرنے میں ایک دوسری حکمت حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے معلوم ہوتی ہے جس کا مقتضیہ ہے کہ کھجور سے جو نفع حاصل ہوتا ہے وہ کسی شیرینی سے بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ چناں چہ وہ فرماتے ہیں:

اور تمر سے روزہ افطار کرنے میں برکت کا سبب یہ ہے کہ اس کا درخت ایک ایسا درخت ہے جو انسان کی طرح جامعیت اور اعدلیت کے طور پر پیدا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نخل کو بنی آدم کی عمہ (پھوپھی) فرمایا ہے۔ کیوں کہ آدم علیہ السلام کی بقیہ مٹی سے پیدا ہوا ہے پس اس کے پھل سے جو تمر ہے افطار کرنا صاحبِ افطار کا جزو بن جاتا ہے اور اس کی حقیقتِ جامع اس جزئیت کے اعتبار سے اس کے کھانے والے کی حقیقت کی جزو ہو جاتی ہے اور اس کا کھانے والا اس اعتبار سے ان بے شمار کمالات کا جامع ہوجاتا ہے جو اس تمر کی حقیقتِ جامع میں مندرج ہے۔ یہ مطلب اگرچہ اس کے مطلق کھانے میں بھی حاصل ہوجاتا ہے، لیکن افطار کے وقت جو روزے دار کی شہوت کا مانع اور لذاتِ فانیہ سے خالی ہونے کا وقت ہے اس کا کھانا زیادہ تاثیر کرتا ہے اور یہ مطلب کامل اور پورے طور پر ظاہر ہوتا ہے اور سحری میں بھی تمر کے کھانے کی ترغیب فرمائی۔ گویا اس کا کھانا تمام ماکولات کے کھانے کا فائدہ رکھتا ہے اور اس کی برکت جامعیّت کے اعتبار سے افطار کے وقت تک رہتی ہے۔[1]

مسئلہ: افطار کے بعد مستحب ہے کہ یہ دعا پڑھے:

اَللّٰهُمَّ لَكَ صُمْتُ وَعَلٰى رِزْقِكَ أَفْطَرْتُ.

خدایا! میں نے تیرے ہی لیے روزہ رکھا ہے اور تیری ہی دی ہوئی روزی پر افطار کیا ہے۔

فائدہ: افطار کے وقت کی دُعا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے يَا وَاسِعَ الْفَضْلِ، اغْفِرْ لِيْ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَعَانَنِيْ فَصُمْتُ وَرَزَقَنِيْ فَأَفْطَرْتُ کا پڑھنا بھی منقول ہے۔ ان میں سے جس دعا کو چاہے پڑھ لے۔

[1] مکتوبات: ۱/ ۱۶۲

وَبِكَ اٰمَنْتُ وَ عَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ کی تحقیق

فائدہ: اَللّٰهُمَّ لَكَ صُمْتُ کے بعد دعائے مذکور میں جولوگوں نے وَبِكَ اٰمَنْتُ وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ زیادہ کرلیا ہے اس کی کچھ اصل بحیثیت روایت کے نہیں ہے۔ اگرچہ معنی اس کے صحیح ہیں بہتر یہی ہے کہ دعائے ماثورہ پر زیادہ نہ کرے۔ جتنی منقول ہے اسی قدر کو پڑھے زیادتی کو چھوڑ دے اور اگر پڑھے تو سنت سمجھ کر نہ پڑھے۔

فائدہ: ''ابن ماجہ'' میں روایت ہے کہ افطار کے وقت روزہ دار کے لیے ایک ایسی دُعا ہے کہ اس کو رد نہیں کیا جاتا۔ لیکن بعض مساجد میں جو افطار سے قبل اجتماعی طور پر دعا کرنے کا دستور ہے اس کا کچھ ثبوت نہیں، اس لیے ہر شخص اپنے طور پر دعا میں مشغول رہے۔ ویسے بھی ہر شخص کی حاجتیں مختلف ہوتی ہیں اس لیے اس وقت میں انفرادی طور پر ہر شخص کو اپنی حاجت کے موافق دعا کرنی چاہیے۔

مسئلہ: کسی روزہ دار کے روزہ کو افطار کرانے کا بڑا ثواب ہے۔ حدیث شریف میں اس کی ترغیب آئی ہے اور روزہ کھلوانے کا ثواب روزہ دار کے برابر آیا ہے اور لطف یہ کہ روزہ دار کے ثواب میں اس سے کسی قسم کی کمی بھی نہیں آتی۔ اس لیے حسبِ گنجایش روزہ کے افطار کرانے میں حصہ لینا مستحب ہے۔ مگر خاص کر چودھویں یا کسی خاص تاریخ کے روزے کو افطار کرانے کا کوئی خاص ثواب شریعت سے ثابت نہیں ایسا سمجھنا گناہ ہے۔ اسی طرح بچوں کے روزہ رکھنے پر روزہ کشائی کے انتظام کو ضروری نہ سمجھنا چاہیے۔

فائدہ: بعض لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ دوسرے کی دی ہوئی چیز سے روزہ افطار نہیں کرتے، سمجھتے ہیں کہ میرے روزہ کا ثواب روزہ کھلوانے والے کو مل جائے گا۔ یہ غلط خیال ہے، روزہ کھلوانے کا ثواب الگ ملتا ہے، روزہ دار کے ثواب میں اس سے کچھ کمی نہیں آتی، پھر دوسرے کی دی ہوئی چیز سے افطار نہ کرنا خواہ مخواہ کا بخل اور اس کو ثواب سے محروم کرنا ہے۔

انتباہ: آج کل مساجد میں افطاری کے وقت جو ہنگامہ برپا ہوتا ہے وہ سراسر آدابِ مسجد اور اس

کے احترام کے خلاف ہے۔ اس وقت بڑوں کی چیخ وپکار اور بچوں کو شور وغل سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور اکثر بچوں کے ننگے پاؤں ہونے کی وجہ سے مسجد کے نجاست میں ملوث ہونے کا بھی خطرہ ہوتا ہے، جس سے مسجد کو بچانا واجب ہے۔ ''درمختار'' میں ہے کہ ایسے وقت بچوں کو مسجد میں داخل کرنا مکروہ تحریمی ہے جب کہ مسجد کے نجس ہونے کا گمان غالب ہو، ورنہ مکروہ تنزیہی ہے:

ویحرم إدخال صبیان و مجانین حیث غلب تنجیسهم و إلا فیکره. قال العلامة: و المراد بالحرمة كراهة التحريم لظنية الدليل (إلخ)، و عليه فقوله: و إلا فیکره أي تنزيهًا.[1]

پھر کھانا[2] تقسیم کرتے وقت تمام صفیں اور فرشِ مسجد کھانے سے ملوث ہو جاتا ہے۔ ان سب امور کی اصلاح واجب ولازم ہے۔ اگر ذیل میں درج شدہ ہدایات پر سختی سے عمل کیا جاوے تو امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ان خرابیوں کا انسداد ہو جائے گا۔

ایک تو اس کا خیال رکھا جاوے کہ مسجد کے اندر کھجور یا کسی خشک چیز کے علاوہ چاول یا دوسری کوئی تر چیز اپنی افطاری کے لیے نہ تو خود مسجد میں لے کر آئیں اور نہ اس قسم کی کوئی دوسری چیز افطاری کے لیے مسجد میں بھیجیں۔ کیوں کہ ایسی ہی چیزوں کے استعمال کرنے اور تقسیم کرنے میں عام طور پر مسجد کا فرش اور صفیں وغیرہ خراب ہوتی ہیں اور اسی طرح طعام کی بھی بے ادبی ہوتی ہے۔

دوسرے کم عمر بچوں کو جو کچھ تقسیم کرنا ہو مسجد سے باہر ہی دے دیا جائے، ان کو مسجد کے اندر نہ داخل ہونے دیا جائے۔ ایک بات یہ خیال میں رہے کہ جس قدر طعام اس نیت سے مسجد وغیرہ میں بھیجا جاوے گا کہ بچوں وغیرہ بے روزہ داروں کو تقسیم کیا جائے، اس قدر میں

---

[1] شامی: ۶۶۵ [2] اس مسئلہ میں سرگروہ جماعت بریلویہ مولوی احمد رضا خان صاحب بھی علمائے حق کے ساتھ ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: مسجد میں ایسا کھانا پینا کہ مسجد میں گرے اور مسجد آلودہ ہو مطلقاً حرام ہے، معتکف ہو یا غیر معتکف۔ اسی طرح ایسا کھانا جس سے نماز کی جگہ گھرے۔ اور اگر یہ دونوں باتیں نہیں تو غیر معتکف کو مکروہ اور معتکف کو مباح ہے۔ (احکام شریعت: ۱/۱۴۵)

روزہ افطار کرانے کا ثواب نہیں ملے گا۔ حدیث شریف میں پاگلوں اور کم عمر بچوں کے مسجد میں داخل کرنے اور مسجد میں آوازوں کے بلند کرنے اور شور وغل کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ البتہ بچوں کو نماز کی عادت ڈالنے کے لیے جب وہ سات سال کی عمر کے ہو جائیں مسجد میں آنے کی اجازت ہے مگر اس وقت بھی خیال رکھا جائے کہ ان کے پاؤں وغیرہ پاک ہوں اور مسجد کے آداب واحترام کے ساتھ وہ مسجد میں آئیں۔ وارثوں اور سرپرستوں کے ذمہ ضروری ہے کہ ایسی عمر کے بچوں کو جب وہ نماز کے لیے آویں تو آدابِ مسجد کی تعلیم دیں اور مسجد میں جانے کا ان کو طریقہ سکھلاویں۔

فائدہ: اگر روزہ افطار کرنے کے وقت کئی شخصوں کے دیے ہوئے کھانے کو استعمال کیا جائے تو لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ روزہ کھلوانے کا ثواب کس کو ملے گا؟ تو قواعد سے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ چوں کہ طعام کے دینے والوں کی سب کی ہی نیت روزہ کھلوانے کی ہوتی ہے، اس نیت کی وجہ سے افطار کرانے کا ثواب بھی سب کو ہی ملے گا۔ ویسے بھی روزہ کھلنے کے وقت جو کچھ کھایا پیا جاتا ہے، وہ سب بحکم افطار ہے۔ اگرچہ حقیقی افطار کسی کے ایک لقمہ سے ہی حاصل ہو جاتا ہے اور ممکن ہے جس کے طعام سے یہ حقیقی افطار حاصل ہوا ہو اس کو کچھ زیادہ ثواب بھی عطا کیا جاوے۔ واللہ أعلم.

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی کے کھانے کو افطاری کے وقت استعمال بھی نہ کیا گیا ہو بلکہ افطار کے بعد اس کو استعمال کیا گیا ہو تو بھی افطاری کے لیے کھانا بھیجنے والوں کو نیت کی وجہ سے افطار کرانے کا ثواب ملے گا۔

تنبیہ: بعض لوگ افطاری میں اس قدر مشغول ہو جاتے ہیں کہ ان سے نماز مغرب کی رکعت تک فوت ہو جاتی ہے اور بعض حضرات تو ایسے وقت نماز ادا کرتے ہیں کہ جماعت ختم ہو چکتی ہے اور امام کی تکبیرِ تحریمہ تو کسی اللہ کے بندہ کو افطاری کے بعد نصیب ہوتی ہوگی۔ افطاری کی خاطر نماز کی جماعت کے تاکیدی حکم سے غفلت اور بے پرواہی برتنا کس قدر بُرا اور مذموم ہے، وہ ظاہر ہے۔ اور خاص طور پر رمضان المبارک کے مہینہ میں جماعت کی

فضیلت سے محروم رہنا کتنی افسوس ناک بات ہے۔ اس ماہِ مبارک میں تو جماعت کا خاص اہتمام کرنا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ کوئی نماز بغیر جماعت کے ادا نہ ہو۔ اس لیے بہتر طریقہ یہی ہے کہ افطار کے وقت سنت کے موافق مختصر طریقہ پر کھجور یا پانی کے گھونٹ سے روزہ کھول لیا جائے۔ پھر جماعت میں شامل ہوکر نماز کے بعد کھانے میں مشغول ہوں۔

مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی نے حضرت رسولِ خدا ﷺ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ایک جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم سے افطار قبل الصلوٰۃ اور حضرت عمر وعثمان رضی اللہ عنہما سے افطار بعد الصلوٰۃ کی روایات کی تطبیق میں اسی وجہ کو مستحسن فرمایا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

وأما إذا أمكن الاقتصار على نفس الإفطار بأكل تمرة أو بشرب قطرة ثم يصلي ويتعشى، فهٰذا جمع حسن ووجه مستحسن.[1]

اور چوں کہ روزہ دار کو اکثر افطار کے وقت کھانے کی طرف میلان ہوتا ہے اس وجہ سے اگر اقامتِ جماعت میں لوگوں کی رعایت کر کے کچھ توقف کر لیا جایا کرے تو گنجایش معلوم ہوتی ہے اور یہ میلان تاخیرِ نماز کے لیے شرعاً عذر ہوسکتا ہے۔ ایسے وقت میں جب کہ طعام کی طرف میلان ہو نماز کو مؤخر کرنے میں کراہت نہیں ہے۔ قدرِ رکعتین تاخیر کی کراہت بلا عذر تاخیر کرنے کے ساتھ خاص ہے۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

أن ما في "القنية" من استثناء التأخير القليل محمول على ما دون الركعتين، وأن الزائد على القليل إلى اشتباك النجوم مكروه تنزيهًا وما بعده تحريمًا إلا بعذر.[2]

اور عذر کی مثال میں ''درمختار'' نے سفر اور کونه على أكل کو بیان فرمایا ہے۔ اس کی تائید میں شامی نے فرمایا ہے:

أي لكراهة الصلاة مع حضور طعام تميل إليه نفسه، والحديث "إذا أقيمت الصلاة وحضر العَشاء فابدؤوا بالعَشاء". رواه الشيخان.[3]

تو معلوم ہوا کہ جس وقت طعام کی طرف طبیعت کا میلان زیادہ ہو اور کھانا حاضر بھی ہو

---

[1] التعليق الممجد [2] شامي: ۳۴۳/۱ [3] شامي: ۳۴۲/۱

اس کو شاید تاخیر نماز کے لیے عذر مانا گیا ہے۔ اس لیے اگر جماعت کی اقامت میں کچھ توقف کر کے لوگوں کو مہلت دی جائے کہ ان کے میلان الی الطعام کی شدت میں کچھ قدر کمی آ جائے اور وہ کچھ کھا پی لیا کریں تو اس کی بھی گنجائش ہے مگر یہ صورت تو بہت ہی قبیح ہے کہ جماعت کے کھڑے ہو جانے کے بعد لوگ نماز کی پروا نہیں کرتے اور مسجد کے اندر ہی کھانے پینے میں مشغول رہتے ہیں۔ البتہ اس توقف اور مہلت میں بھی اعتدال سے کام لیا جائے۔ اقامت میں اتنا وقفہ نہ کیا جائے کہ نمازیوں کو جماعت کے انتظار میں تکلیف ہونے لگے۔ بعض ائمہ افطاری کے بعد آرام کرنے لگ جاتے ہیں، لوگوں کو ان کے انتظار میں تکلیف ہوتی ہے، اس لیے ایسا نہ کرنا چاہیے۔ افطاری کے وقت کھانے پینے میں تقلیل اور اختصار کی مقصود ہے تا کہ نماز مغرب جلدی ادا ہو سکے۔ حدیث انس رضی اللہ عنہ جو اوپر گزر چکی ہے اس میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔

قطب الارشاد حضرت علامہ گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی املائی تقریر میں ہے:

قوله: "رطبات وتميرات وحسوات" كل ذلك بتنكير اللفظ وتصغيره إشارة إلى تقليل ما يؤكل حينئذ مسارعة إلى أداء الصلاة۔[1]

نمازِ تراویح کا بیان

نماز تراویح کے متعلق حدیث شریف میں بہت سے فضائل وارد ہوئے ہیں جن کا احصا وشمار بہت دشوار ہے سمجھنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص ایمان کے ساتھ ثواب کی غرض سے روزہ رکھے اور اسی طرح ایمان کے ساتھ ثواب کی غرض سے تراویح پڑھے تو حق تعالیٰ اس کے گزشتہ گناہ معاف فرما دیں گے۔

خدا کے بندو! اور کیا چاہتے ہو؟ کیا مغفرت سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہے؟ مگر افسوس ہے کہ ہمیں اس کی قدر نہیں رہی اور اس عظیم الشان سنت کے ادا کرنے میں اس قدر بدعملیاں کی جاتی ہیں کہ کچھ ٹھکانہ نہیں۔

---

[1] الکوکب الدری: ۱/۲۶۹

مسئلہ: نمازِ تراویح کی بیس رکعات سنتِ مؤکدہ ہیں، اور تراویح میں ایک مرتبہ پورا قرآن پاک پڑھنا یا سننا بھی سنتِ مؤکدہ ہے۔ یہ دونوں عمل علیحدہ علیحدہ دو سنتیں ہیں۔ اس لیے جو لوگ سورتوں کے ساتھ نمازِ تراویح ادا کرتے ہیں اور پورا قرآن مجید تراویح میں پڑھتے یا سنتے نہیں، وہ تراویح کی سنت تو ادا کرتے ہیں لیکن تراویح میں پورا قرآن مجید پڑھنے یا سننے کی سنت ان کے ذمہ باقی رہتی ہے۔ اسی طرح جو لوگ چند راتوں میں قرآن پاک پورا سن کر تراویح چھوڑ دیتے ہیں ان کے ذمہ تراویح کی سنت باقی رہتی ہے۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کے ختم ہوجانے کے بعد اکثر لوگ تراویح کے ادا کرنے میں جو سستی کرنے لگتے ہیں، یہ بھی ان کی غلطی ہے۔ ختم قرآن مجید کے بعد بھی رمضان المبارک کی تمام راتوں میں عیدالفطر کے چاند دیکھنے تک تراویح کا پڑھنا سنت ہے۔

مسئلہ: عورتیں اس سنتِ تراویح سے بہت محروم رہتی ہیں، حالاں کہ عورتوں کے لیے بھی مردوں کی طرح ہی تراویح کا پڑھنا سنتِ مؤکدہ ہے۔

التراويح سنة مؤكدة لمواظبة الخلفاء الراشدين (للرجال والنساء) إجماعًا.[1]

مگر عورتیں اپنی تراویح تنہا پڑھیں، جماعت نہ کریں۔

صرف عورتوں کی جماعت تراویح میں بھی مکروہِ تحریمی ہے۔ "درمختار" میں ہے:

ويكره تحريمًا جماعة النساء، ولو في التراويح.[2]

اسی طرح عورتوں کے لیے مسجد میں جا کر جماعتِ تراویح، جمعہ، عیدین وغیرہ میں شامل ہونے کو فقہا نے منع فرمایا ہے:

ويكره حضورهن الجماعة ولو لجمعة وعيد ووعظ مطلقًا... إلخ؛ لفساد الزمان.[3]

فائدہ: اکثر مساجد کے اندر تراویح کے ادا کرنے کی جلدی میں عشا کی نماز یا عشا کی اذان

---

[1] درمختار: ۱/۴۵۹ [2] درمختار برحاشیہ شامی: ۱/۵۲۸ [3] درمختار برحاشیہ شامی: ۱/۵۲۹

اس کے وقت سے پہلے ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں یا تو اذانِ عشا اپنے وقت سے پہلے ہو جاتی ہے جس کا حکم یہ ہے کہ وقت کے ہو جانے کے بعد اس کو دوبارہ کہنا چاہیے، ورنہ اس صورت میں جماعت بغیر اذان سمجھی جائے گی جو کہ خلافِ سنت ہے۔ اور اگر عشا کی نماز ہی وقتِ عشا سے پہلے ہوگئی تو یہ بہت ہی سخت بات ہے، کیوں کہ وقت سے پہلے جو نماز بھی پڑھی جائے گی اس سے فرض ادا نہ ہوگا، بلکہ اس کا دوبارہ پڑھنا فرض ہے، اس لیے ضروری ہے کہ عشا کے وقت کا لحاظ کر کے اذان اور عشا کی جماعت کی جایا کرے۔ اس کے لیے عام موسموں میں تخمینہ گھڑی سے یہ ہے کہ غروبِ آفتاب کے بعد ڈیڑھ گھنٹہ گزرنے پر اذانِ عشا کہی جائے اور اس کے بعد جتنی دیر مناسب سمجھیں نمازیوں کا انتظار کر کے فرض کی جماعت کر لی جائے۔ غروب کے بعد ڈیڑھ گھنٹہ گزرنے سے پہلے عام موسموں میں عشا کی اذان نہ دی جائے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر غروبِ آفتاب کے بعد جب غروب کی جگہ سے سرخی زائل ہو کر سفیدی بھی زائل ہو جاتی ہے اس وقت عشا کا وقت شروع ہوتا ہے اور اس کا اندازہ گھڑی سے اکثر موسموں میں اسی قدر ہے جو اوپر لکھا گیا ہے۔ لیکن اگر غروبِ شمس سے پونے دو گھنٹہ کے بعد عشا کی اذان و نماز پڑھی جاوے تو کبھی غلطی نہ ہوگی۔ کیوں کہ غروبِ آفتاب سے سفیدی زائل ہونے کا فرق کم سے کم بہ ماہِ فروری و مارچ و دسمبر و اکتوبر ایک گھنٹہ ۲۰ منٹ اور زیادہ سے زیادہ بماہِ جون، شروع جولائی ایک گھنٹہ ۳۷ منٹ تک ہوتا ہے۔[۱]

مسئلہ: تراویح کے اندر قراءت میں نہ اس قدر جلدی کرنی چاہیے کہ حروف ہی سمجھ میں نہ آئیں اور نہ اس قدر ٹھہر کر قرآن پڑھا جاوے کہ فرض نماز اور تراویح کی قراءت میں فرق ہی نہ رہے، بلکہ درمیانہ اور معتدل طریقہ پر قراءت کی جانی چاہیے تاکہ مقتدی تنگی میں نہ پڑیں:

وفي "الحجة" يقرأ في الفرض بالترسل حرفًا حرفًا، وفي التراويح بين بين، أي بأن تكون بين الترسل والإسراع، وفي النفل له أن يسرع بعد أن يقرأ كما يفهم.[۲]

[۱] ابوداؤد: ۳۲۹/۲ [۲] شامی: ۵۰۵/۱

حدیث شریف میں ہے کہ خوش خبری دو اور نفرت مت دلاؤ، اور آسانی کرو اور تنگی میں مت ڈالو۔

فائدہ: بعض حفاظ کی عادت ہے کہ پہلی رکعات میں قراءت بہت زیادہ پڑھ دیتے ہیں جس سے لوگ تنگی میں پڑتے اور تھک جاتے ہیں، پھر پچھلی رکعتوں میں بہت تھوڑا پڑھتے ہیں۔ اوپر کی حدیث سے اس طریقہ کی غلطی بھی واضح ہوگئی۔ تراویح کی رکعات میں تسویہ (برابری) اور اعتدالی رکھنا افضل ہے۔

والأفضل للإمام تعديل القراءة أي تقدير بالقراءة في الركعتين على سبيل المساواة والعدل؛ لئلا تكون أحدهما أطول من الأخرى.[1]

اور اگر ہر شفعہ کی پہلی رکعت دوسری رکعت سے طویل ہو تو بھی جائز ہے۔

وفي "فتاوى قاضي خان": لو طول الأولى على الثانية في التراويح لا بأس به، بل المختار عند محمد... إلخ.[2]

مگر اتنا تفاوت کرنا جس سے مقتدی تنگی میں پڑنے لگیں درست نہیں۔

ويكره أيضا للإمام أن يثقل عليهم، أي على القوم بالتطويل الزائد على حد السنة في القراءة وسائر الأذكار.[3]

مسئلہ: بعض حفاظ قرآن سنانے پر اجرت مقرر کر لیتے ہیں، یہ کسی طرح بھی شرعاً جائز نہیں ہے۔ حضرات فقہائے کرام نے امامت اور تعلیمِ قرآن وغیرہ پر تو بضرورتِ زمانہ اجرت کے جواز کا فتویٰ دیا ہے لیکن قرآن کی تلاوت (پڑھنے) پر اجرت کو ناجائز فرمایا ہے۔

المفتى به جواز أخذ الشيء على تعليم القرآن، لا على القراءة المجردة.[4] فالحاصل أن ما شاع في زماننا من قراءة الأجزاء بالأجرة لا يجوز.[5]

ایک مقام پر شامی نے کہا ہے:

ولا ضرورة في استيجار شخص يقرأ على القبر أو غيره.[6]

[1] صغیری: ۲۰ [2] صغیری: ۱۸۸ [3] شامی: ۴۷/۵ [4] صغیری: ۱۹۲ [5] ۴۷/۵ [6] ۳۵/۵

اس قراءة على غير القبر میں تراویح بھی شامل ہے، کیوں کہ تراویح میں بھی قرآن شریف ثواب کے لیے ہی پڑھا جاتا ہے۔ تو تراویح میں قرآن شریف پڑھ کر اجرت لینا تلاوت کر کے اجرت لینا ہوا، جو ناجائز ہے۔ لہٰذا علمائے متأخرین نے جو تعلیم قرآن وغیرہ بعض ایسی اہم اور ضروری عبادات پر اجرت کو ضرورتِ زمانہ کی وجہ سے جائز کیا ہے جو کہ دین کے لیے موقوف علیہ ہیں، ان پر قیاس کر کے تراویح میں تلاوت قرآن پر اُجرت کے جواز کو ثابت کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ اس زمانے میں جو قبر وغیرہ پر قرآن مجید پڑھ کر اُجرت لینے کا دستور ہے یہ بھی چوں کہ أجرة على التلاوة ہے اس لیے ناجائز ہے اور اُجرت پر قرآن پڑھنے سے چوں کہ پڑھنے والے ہی کو ثواب نہیں ملتا، اس لیے اس طرح پڑھ کر میت کو ثواب پہنچانے سے اس کو کچھ ثواب نہیں پہنچتا۔

قال تاج الشريعة في شرح "الهداية": إن القرآن بالأجرة لا يستحق الثواب لا للميت ولا للقارئ. وقال العيني في شرح "الهداية": ويمنع القارئ للدنيا، والآخذ والمعطي آثمان.

فالحاصل أن ما شاع في زماننا من قراءة الأجزاء بالأجرة لا يجوز ؛ لأن فيه الأمر بالقراءة وإعطاء الثواب للآمر والقراءة لأجل المال، فإذا لم يكن للقارئ ثواب لعدم النية الصحيحة فأين يصل الثواب إلى المستأجر، ولولا الأجرة ما قرأ أحد لأحد في هذا الزمان.

والاستيجار على التلاوة وإن صار متعارفًا فالعرف لا يجيزه ؛ لأنه مخالف للنص. والعرف إذا خالف النص يرد بالاتفاق. فاحفظ.[1]

مسئلہ: جس جگہ بلا اُجرت قرآن تراویح میں سنانے والا کوئی نہ ملے تو چھوٹی سورتوں سے تراویح پڑھ لیا کریں۔

مسئلہ: سامع کے لیے بھی اجرت سماعِ قرآن لینا جائز نہیں ہے، اس مسئلہ میں بعض حضرات

---

[1] ۲۰۶/۵

اکابر کو یہ شبہ ہوا تھا کہ اس کو تعلیم قرآن پر قیاس کر کے اُجرت کو جائز کہا جاوے۔ مگر بعد میں خود انھوں نے ہی اس کا فرق یہ بتلایا ہے کہ نماز کے اندر تعلیم قرآن سے نماز فاسد ہوجاتی ہے اور سامع کے بتلانے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ نیز بھولے ہوئے کو بتلانا یہ نماز کی اصلاح ہے اور اصلاحِ نماز عبادت ہے۔ معلوم ہوا کہ سامع کا بتلانا تعلیم میں داخل نہیں ہے، اس لیے تعلیم پر قیاس کر کے سماعت پر اجرت کا لینا جائز نہیں ہے۔[1]

مسئلہ: ڈاڑھی منڈانے والے اور اسی طرح جس کی ڈاڑھی کتروانے کی وجہ سے ایک مشت سے کم ہو اس کی امامت مکروہِ تحریمی ہے۔ تراویح میں بھی اس کو امام بنانا مکروہِ تحریمی ہے۔ اکثر کہہ دیا جاتا ہے کہ ڈاڑھی منڈوں کی نماز ڈاڑھی منڈے کے پیچھے ہوجاتی ہے۔ مگر یہ غلط ہے۔ ڈاڑھی منڈوں کی نماز بھی ڈاڑھی منڈے امام کے پیچھے مکروہِ تحریمی ہے۔

فائدہ: بہت سے حافظ بھی ڈاڑھی منڈوانے یا کتروانے کے مرض میں مبتلا ہیں، ان کی امامت بھی مکروہِ تحریمی ہے۔ تراویح اور دوسری نمازوں میں ان کو ہرگز امام نہ بنایا جاوے۔ اس مسئلہ سے لوگ بہت غافل ہیں اور اپنی نمازوں کو مکروہِ تحریمی بنا رہے ہیں۔

مسئلہ: نابالغ کے پیچھے بالغ کی نماز نہیں ہوتی، اس کو تراویح میں بھی امام نہ بنایا جائے، اور لڑکا جب تک چاند کے حساب سے پورا پندرہ سال کا نہ ہوجائے یا کوئی علامت بلوغ کی اس میں نہ پائی جائے اس وقت تک وہ نابالغ کے حکم میں ہی ہے۔

مسئلہ: تراویح کی جتنی دیر میں چار رکعات پڑھی جاتی ہیں اتنی ہی دیر چار رکعات کے بعد بیٹھنا مستحب ہے۔ تراویح کی بیس رکعات کے بعد وتر سے پہلے بھی بیٹھنا چاہیے۔ اس میں لوگ غفلت کرتے ہیں، اس کو خوب یاد رکھا جاوے۔ ''درِمختار'' میں ہے:

(يجلس ندبًا) قال الشامي: وما يفيده كلام "الكنز" من أنه سنة. تعقبه الزيلعي بأنه مستحب لا سنة. وبه صرح في "الهداية": (بين كل أربعة بقدرها، وكذا بين الخامسة والوتر) قال الشامي: صرح به في

---

[1] وعظ التهذيب: ۹۷

"الهداية".[۱]

ہاں اگر نمازیوں کی گرانی اور کمی جماعت کا اندیشہ ہو تو چار رکعات کی مقدار سے کم بھی بیٹھنا جائز ہے۔ اس وقفہ میں اختیار ہے چاہے تنہا نوافل پڑھے چاہے دُعا اور درود شریف وغیرہ میں مشغول رہے یا تین مرتبہ یہ تسبیح پڑھ لے:

سُبْحَانَ ذِي الْمُلْكِ وَالْمَلَكُوْتِ، سُبْحَانَ ذِي الْعِزَّةِ وَالْعَظْمَةِ وَالْقُدْرَةِ وَالْكِبْرِيَاءِ وَالْجَبَرُوْتِ، سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ، سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَّبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوْحِ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ نَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ نَسْئَلُكَ الْجَنَّةَ وَنَعُوْذُ بِكَ مِنَ النَّارِ.[۲]

بعض مساجد میں تراویح شروع کرنے سے پہلے یہ تسبیح پڑھتے ہیں اور بیس رکعات ہونے کے بعد وتروں سے پہلے اس کو نہیں پڑھتے، یہ رواج غلط ہے۔ تراویح کی ہر چار رکعات کے بعد اس تسبیح کو پڑھنا مستحب ہے۔ بیس رکعات کے بعد وتروں سے پہلے بھی اس کو پڑھنا چاہیے۔ جیسا کہ اوپر گزرا۔

فائدہ: آج کل ہمارے علاقہ میں بعض جگہ تراویح کی ہر چار رکعت کے بعد بیٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بلند آواز کے ساتھ سب کے مل کر درود کہنے کا جو طریقہ مروج اور شائع ہو رہا ہے، یہ محض ایک رواج ہے، اس کا کوئی شرعی ثبوت نہیں، نہ بلادِ عرب میں اس کا کہیں نام ونشان ہے۔ میدانِ جنگ اور ان بعض مواقع کے علاوہ جن کے اندر بعض ذکروں کے جہر کا ثبوت ملتا ہے، اس طرح بلند آواز کے ساتھ ذکر کرنا جس میں جہرِ مفرط ہو ناجائز ہے۔

وقد حرر المسألة في "الخيرية" وحمل ما في فتاوى القاضي على الجهر المضر.[۳]

اور اس میں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ اس شور میں امام کی تکبیرِ تحریمہ بہت لوگوں کو نہیں سنائی دیتی امام اَلْحَمْدُ شروع کر دیتا ہے اور کئی آدمیوں نے ابھی اپنی تکبیرِ تحریمہ بھی نہیں کہی

---

۱ شامی ۱/۶۶۱ ۲ شامی: ۱/۶۶۱ ۳ ۵/۳۵۱

ہوئی، اور اگر اس وقت کوئی مسبوق نماز پڑھ رہا ہوگا تو اس وجہ سے بھی بلند آواز کے ساتھ ذکر کرنا جائز نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ نیز دیگر سلف صالحین سے یہ طریقہ منقول نہیں، حالاں کہ ان ہی کے اسوۂ حسنہ کی پیروی میں نجات مضمر ہے، اور نہ ہی فقہ کی کتابوں میں اس رواج کا کوئی ثبوت ملتا ہے۔ اور جس چیز کا ثبوت نہ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلفِ صالحین سے ہوتا ہو اور نہ ہی معتبر کتبِ فقہ سے اس کا ثبوت ملتا ہو اس کا التزام کرنا ناجائز ہے، اس لیے اس رواج کو ترک کر کے صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین نیز سلفِ صالحین رحمہم اللہ کے طریقہ اور کتب فقہ حنفی کے موافق تراویح کو ادا کرنا چاہیے۔

مسئلہ: ختم قرآن شریف کے دن ضرورت سے زیادہ روشنی کا کرنا اور جھنڈیاں وغیرہ لگانا یہ اسراف میں داخل اور ناجائز ہے۔ اور تقسیم شیرینی کے لیے جبراً چندہ لینا اور تقسیم کے وقت مسجد میں شور وشغب کرنا اور اس تقسیم کو ضروری اور لازمی سمجھنا اور تقسیم نہ کرنے والوں پر ملامت وطعن کرنا یہ جملہ امور بھی شرعاً ناجائز ہیں، اور تقسیم شیرنی کے وقت جو مسجد کی بے حرمتی اور خلافِ ادب باتیں ہوتی ہیں اور تقسیم کنندہ سے چھینا جھپٹی کرتے ہوئے بعض مرتبہ گالی گلوچ تک نوبت پہنچ جاتی ہے اور اتنا شور وغل ہوتا ہے کہ ایسا چوپایوں اور مہذب بیٹھکوں میں بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔ ان سب امور کی اصلاح واجب ہے۔

فائدہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سورۂ بقرہ کے ختم پر ایک اونٹنی ذبح کر کے بطور شکریہ کے تقسیم کی تھی۔ اب بھی اگر کوئی شخص ختم کے موقع پر شکرانہ کے طور پر از خود کچھ تقسیم کر دے تو اس میں کچھ حرج نہیں۔

حضرت حکیم الامت تھانوی قدس اللہ سرہ نے ایک مرتبہ اپنے قرآن مجید کے ختم کے موقع پر افطاری کے وقت کباب تقسیم فرمائے تھے۔ مگر اس وقت جس طرح چندہ سے رقم جمع کر کے تقسیم کرنے کا رواج ہے وہ قابلِ ترک ہے۔

شبینہ: بعض جگہ ایک شب میں قرآن ختم کرنے کا رواج ہے، لیکن اس میں ایک خرابی تو یہ ہوتی ہے کہ اکثر نفلوں کی جماعت میں قرآن پڑھا جاتا ہے اور نفلوں میں تین یا تین آدمیوں سے

زیادہ کی جماعت کرنا مکروہ ہے۔

دوسرے غور کر کے دیکھا جاوے تو اس میں اکثر نیت نمود وشہرت اور دکھلاوے کی ہوتی ہے۔ حفاظ تو زیادہ تر داد ملنے کے امیدوار رہتے ہیں اور بعض عوض مالی کا طمع بھی رکھتے ہیں اور مہتمم اور منتظم کو اکثر تو سامعین میں شامل ہو کر قرآن مجید سننے کا موقع ہی کم ملتا ہے۔ چائے، شربت وغیرہ کے انتظام سے ہی ان کو فرصت نہیں ملتی اور اگر بھاگے دوڑے شامل ہوئے بھی تو اطمینان اور سکونِ قلب مفقود ہوتا ہے، کیوں کہ دل تو انتظام میں پھنسا ہوا ہوتا ہے۔ رہے سامعین تو اکثر کی یہ حالت ہوتی ہے کہ کوئی لیٹا ہے، کوئی بیٹھا ہے کوئی گفتگو میں مصروف ہے۔ اس بے توجہی اور بے پرواہی کے ساتھ قرآن پاک کا سننا قرآن کی بے حرمتی اور بے ادبی ہے، اس سے آج کل کے اس نئے مروّجہ شبینہ کا حال بھی معلوم ہو سکتا ہے جس میں سننے اور پڑھنے والے کسی کے لیے بھی نماز کی پابندی نہیں ہے۔ بغیر نماز کے ہی پڑھنے والے پڑھتے ہیں اور سننے والے بغیر نماز کے ہی سنتے ہیں۔ کیوں کہ اس میں بھی نفلوں کی جماعت کی خرابی کے سوا مندرجہ بالا سب قباحتیں موجود ہوتی ہیں۔

البتہ اگر خلوصِ نیت سے ریا اور دکھلاوے کے بغیر، دلی شوق ورغبت کے ساتھ قرآن مجید کو پڑھا اور سنا جائے اور سنانے والے بھی اخلاص کے ساتھ پڑھنے کے علاوہ تلاوت قرآن مجید میں صحت لفظی اور تجوید کا پورا لحاظ رکھیں اور مالی عوض کا بھی ان کو لالچ نہ ہو۔ پھر چاہے قرآن مجید ایک شب میں ختم ہو جائے یا جس قدر بھی آسانی کے ساتھ ہو سکے اسی قدر کو غنیمت سمجھیں تو یہ ایک امرِ محمود اور قرآن مجید کی اشاعت اور لوگوں کو اس کی طرف رغبت وشوق دلانے کا باعث ہے۔ اور اگر نماز میں قرآن مجید سننے کا شوق ہو تو پھر ان امور کے لحاظ کے ساتھ اس امر کا بھی خاص خیال رکھا جائے کہ نفلوں کے اندر جماعت میں تین یا تین سے زیادہ آدمی شامل نہ ہونے پائیں۔ پھر بھی افضل یہی ہے کہ تین راتوں میں قرآن پاک ختم کریں، اس سے کم میں ختم نہ کیا جاوے، البتہ تنہا نفلوں میں جس قدر چاہیں پڑھیں۔ بعض سلف صالحین سے ایک شب وروز میں تین مرتبہ قرآن پاک کا ختم کرنا بھی ثابت ہے۔ مگر یہ عمل ان کا قرآن پاک کے ساتھ شغف وانہماک اور محبت کی وجہ سے تھا اور پھر وہ تنہا اور اکیلے اس پر شوق ورغبت کے

ساتھ عمل کرتے تھے۔ ان کے عمل سے مروجہ شبینوں کے جواز پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔

تنبیہ: آج کل اکثر شبینہ میں آلۂ مکبر الصوت (لاؤڈ سپیکر) کے استعمال کا رواج بھی ہو گیا ہے۔ اس میں بھی چند خرابیاں ہیں:

اگر ایک وقت میں دو یا دو سے زیادہ مقامات پر شبینہ ہو رہا ہو اور ہر مقام پر آلہ مکبر الصوت کا استعمال بھی ہو رہا ہو تو ایک مقام کی قراءت دوسرے مقام کی قراءت سے ٹکرائے گی، اس طرح آوازوں میں تصادم ہو کر کسی جگہ کی قراءت بھی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اور اگر نماز میں شبینہ ہو رہا ہوگا تو اس میں قراءت کے اندر تصادم ہونے کے علاوہ بعض اوقات تکبیراتِ انتقالیہ میں بھی یہ التباس پیش آئے گا کہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ ہمارے امام نے کہا ہے یا دوسری جگہ کے امام نے، تو اس طرح بعض آدمیوں کی نماز فاسد ہو جانے کا بھی خطرہ ہے۔ جیسا کہ عام طور پر جمعہ کے روز خطبہ سے پہلے کی تقریروں میں اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ ایک مسجد کی آواز دوسری مساجد میں آلہ مکبر الصوت کے ذریعے ٹکراتی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض مساجد میں امام قراءت کر رہا ہوتا ہے، دوسری طرف سے کہیں اشعار، کہیں وعظ یا خطبہ کی آواز اس سے ٹکرا رہی ہوتی ہے اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ امام کیا پڑھ رہا ہے، اس ٹکراؤ اور تصادم کی وجہ سے آوازیں بالکل گڈمڈ ہو کر ایک عجیب تماشا بن جاتا ہے۔ خصوصاً جب ہوا تیز ہو اور دوسری طرف نماز بھی آلہ مکبر الصوت کے بغیر ہو رہی ہو پھر تو امام کی قراءت پر دوسری آواز غالب ہو کر کچھ بھی پتہ چلنے نہیں دیتی، نہ قراءت کا نہ تکبیرات کا، یہ صورتِ حال کفار کے اس قول کے مشابہ ہے جس کا تذکرہ نص قرآنی ﴿ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ ﴾[1] میں فرمایا گیا ہے۔

اور اگر ایک وقت میں ایک ہی مقام پر شبینہ میں آلہ مکبر الصوت کا استعمال ہو رہا ہے تو بھی اس امر کا خیال نہیں رکھا جاتا کہ دوسری مساجد اور مقامات میں نماز ہو چکی ہے یا نہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے مقامات میں ابھی لوگ نماز میں مشغول ہوتے ہیں کہ ادھر شبینہ شروع ہو جاتا ہے اور اس طرح دوسرے مقامات کے نمازیوں کی نماز میں خلل واقع ہوتا ہے حالاں کہ قرآن پاک اور ہر ذکر کا یہی حکم ہے اس کو اس طرح زور سے پڑھنا بالکل ناجائز ہے

[1] حٰم السجدة: ٢٦

کہ اس کی وجہ سے کسی نمازی کی نماز میں خلل واقع ہو۔

دوسری خرابی اس صورت میں یہ ہے کہ اس سے رات کے وقت اکثر لوگوں کی نیند میں خلل واقع ہوتا ہے۔ جو لوگ شوق ورغبت کے ساتھ قرآن کریم سننے کے لیے تیار ہوں، ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کو تمام رات نیند سے روکے رکھنا اور باز رکھنا جائز نہیں ہے۔ پھر ان میں بہت سے لوگ ضعیف اور بوڑھے بھی ہوتے ہیں اور کئی بیمار ہوتے ہیں ان کو آلہ مکبر الصوت کی آواز کی وجہ سے نیند نہیں آتی اور تکلیف ہوتی ہے۔

لو قرأ على السطح والناس نيام يأثم، أي لأنه يكون سببا لإعراضهم عن استماعه؛ أو لأنه يؤذيهم بإيقاظهم.[1]

ایک خرابی یہ بھی ہے کہ جو لوگ قرآن کریم کے سننے کی طرف متوجہ نہیں اور اپنے حوائج میں مشغول اور منہمک ہیں۔ ان کے سامنے قرآن کریم کو زور سے پڑھنا بے ادبی میں داخل ہے اور اس کے احترام کے خلاف ہے۔ ایسی جگہوں میں قرآن کریم کی تلاوت کرنے سے پڑھنے والا گناہ گار ہوتا ہے اور یقیناً اس آلہ کے ذریعہ ایسے لوگوں کو بھی آواز پہنچتی ہے جو اس کو سننے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، تو گویا یہ بھی مواضعِ اشتغال میں پڑھنا ہوا:

إلا أنه يجب على القارئ احترامه بأن لا يقرأه في الأسواق ومواضع الاشتغال، فإذا قرأه فيها كان هو المضيع لحرمته، فيكون الإثم عليه دون أهل الاشتغال؛ دفعا للحرج.[2]

ایک اور خرابی یہ ہے کہ بعض علما کے نزدیک خارج از نماز بھی قرآن کریم کی تلاوت کے وقت سامعین کو خاموش رہنا اور توجہ کے ساتھ قرآن کریم کا سننا واجب ہے جب کہ ان کو کوئی عذر نہ ہو۔ تو جن لوگوں کو اس آلہ کے ذریعہ قرآن کریم کی آواز پہنچے گی اور وہ بغیر عذر کے خاموشی اور توجہ کے ساتھ اس کو نہیں سنیں گے تو ترک واجب کی وجہ سے گناہ گار ہوں گے۔ اس طرح اس آلہ کا استعمال گویا بہت لوگوں کو گناہ گار بنانے کا ذریعہ اور سبب بنتا ہے:

(يجب الاستماع للقراءة مطلقا) أي في الصلاة وخارجها ؛ لأن الآية

---

[1] شامی: ۱/۵۰۹　[2] شامی: ۱/۵۱۰

وإن كانت واردة في الصلاة على ما مر فالعبرة لعموم اللفظ لا لخصوص السبب. ثم هذا حيث لا عذر... إلخ[1]

ایک خرابی یہ ہے کہ سجدہ کی آیت کو ایسے لوگوں کے سامنے زور سے تلاوت کرنے کو علما نے پسند نہیں کیا جو سجدہ کے لیے تیار نہ ہوں، مگر اس آلہ کے ذریعہ سجدہ کی آیت کی سماعت گھر بیٹھے ایسے لوگوں کو بھی ہو جاتی ہے جو قطعاً اس وقت سجدہ کے واسطے تیار نہیں ہوتے، اب اگر انھوں نے سجدہ کرلیا تو خیر ورنہ گناہ گار ہوں گے:

واستحسن إخفاؤها من سامع غير متهيئ للسجود؛ لأنه لو جهر بها لصار موجبًا عليهم شيئًا ربما يتكاسلون عن أدائه، فيقعون في المعصية ..... وينبغي أنه إذا لم يعلم بحالهم أن يخفيها.[2]

مسئلہ: جب تک سننے والے کو یہ پتہ نہ چلے کہ یہ سجدہ کی آیت ہے اس وقت تک اس کے ذمہ سجدۂ تلاوت نہیں ہوتا۔ مگر جب آیتِ سجدہ پڑھ کر پڑھنے والا سجدہ میں چلا گیا تو سننے والے کو اس آلہ کے ذریعہ پتہ چل گیا کہ یہ آیتِ سجدہ پڑھی گئی تھی اور پہلے وہ اس کو سن بھی چکا تھا، تو اب سننے والے پر سجدہ واجب ہوگیا۔ بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ سجدہ کی آیت کی تلاوت کے وقت آلہ کی آواز کو بند کردیں گے مگر عام طور پر اس میں سستی اور لاپرواہی ہو جاتی ہے۔ ان امور کی وجہ سے آلہ مکبر الصوت (لاؤڈ سپیکر) کا استعمال شبینہ میں نہیں کرنا چاہیے۔

فضیلت قرآن

رمضان المبارک میں ایک اور بہت ہی مہتم بالشان امر کا ظہور ہوا ہے۔ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے آخری صحیفہ کا آخری رسول پر نازل ہونا ہے کہ جس کے بعد نہ کوئی صحیفہ آئے گا اور نہ کوئی رسول۔ غور تو فرمائیے کہ اوّل تو الہامِ ربانی ہی اپنے اندر کس قدر عظمت رکھتا ہے کہ وہ کلامِ الٰہی ہے، اور پھر کلامِ الٰہی بھی ایسا مکمل اور جامع کہ اس کے بعد کسی اور صحیفہ کی گنجائش اور ضرورت ہی نہیں رہی۔ اسی واسطے قرآن مجید کا رمضان شریف میں نازل ہونا رمضان کے لیے

---

[1] ۵۰۹/۱۹ [2] شامی: ۷۳۰/۱

باعثِ شرف وعظمت ہے اور قرآن کریم کو رمضان المبارک سے خاص تعلق اور گہری خصوصیت حاصل ہے۔ چناں چہ رمضان المبارک میں اس کا نازل ہونا، حضور ﷺ کا رمضان شریف میں تلاوتِ قرآن کا شغل نسبتاً زیادہ رکھنا، اور جبریل علیہ السلام کا رمضان شریف میں دور کرنا، تراویح میں ختمِ قرآن کا مسنون ہونا، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور بزرگانِ امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا ألف ألف صلاۃ وتحیۃ کا رمضان میں تلاوت کا خاص اہتمام کرنا، یہ سب امور اس خصوصیت کو بتلاتے ہیں۔ لہٰذا اس مہینہ میں تلاوت قرآن کے معمول کو بہ نسبت دوسرے معمولات ذکر و شغل کے بڑھانا اور زیادہ کرنا چاہیے، اور اہتمام کے ساتھ کثرت سے تلاوت قرآن میں مشغول رہنا چاہیے۔

حکیم الامت تھانوی قدس اللہ سرہ کی عادتِ شریفہ تھی کہ وہ رمضان مبارک میں سالکین کی تعلیم وتلقینِ خاص کو بند فرمادیتے تھے۔ البتہ افادۂ عامہ پہلے سے زیادہ ہوجاتا تھا اور احباب کو مشورہ دیا کرتے تھے کہ قرآن مجید کی تلاوت کو اس ماہِ مبارک میں دوسرے معمولات پر غالب رکھیں۔

رمضان المبارک کے ساتھ جس طرح روزہ اور قرآن کریم دونوں کو خصوصی تعلق ہے اسی طرح آپس میں بھی ان دونوں عبادتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ بہت گہرا تعلق اور مناسبت ہے۔ یہ دونوں عبادتیں یعنی روزہ اور قرآن کریم کئی خاصیتوں میں مشترک ہیں۔

حدیث شریف میں ہے کہ روزہ اور قرآن کریم دونوں قیامت کے دن شفاعت کریں گے۔ روزہ کہے گا: اے رب! میں نے اس کو دن میں کھانے پینے سے باز رکھا تھا، میری شفاعت اس کے حق میں قبول کیجئے۔ اور قرآن کہے گا: میں نے اس کو رات کو جگایا تھا اس لیے میری شفاعت قبول فرمائیے۔ پس دونوں کی شفاعت قبول کی جائے گی۔

ایک اور خاصیت ان دونوں میں مشترک پائی جاتی ہے، یعنی تلاوتِ قرآن اور روزہ میں، اور وہ خاصیت قربِ خاص حق تعالیٰ کا ہے۔ تلاوت میں بھی خاص قرب ہوتا ہے ایسے ہی روزہ دار کو بھی خاص قرب ہوتا ہے حق تعالیٰ کا۔ یہ دوسری بات ہے کہ تلاوت میں وجۂ قرب اور ہو اور روزہ میں وجۂ قرب خاص ہوتا ہے کہ کلام کو خاص مناسبت ہوتی ہے متکلم سے، اور ظاہر ہے کہ جو شخص اس کی تلاوت کرے گا اس کو خاص تعلق ہوگا

جیسے کسی نے کوئی دیوان وغیرہ تصنیف کیا ہو اور ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اس کے دیوان کو پڑھ رہا ہے مصنف کو اس کے ساتھ خاص تعلق پیدا ہو جائے گا، خواہ وہ پڑھنے والا کلام سمجھتا بھی نہ ہو جب بھی اس کے ساتھ خاص محبت ہوگی اور اس کی طرف خاص عنایت مبذول ہوگی۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم بغیر سمجھے پڑھنا بھی موجب محبت حق ہے، بلکہ ایک طرح اس شخص کے ساتھ محبت زیادہ ہوگی جو بدوں سمجھے ہوئے اس کے کلام کو پڑھ رہا ہو، کیوں کہ ممکن ہے کہ سمجھنے والے کو مضامین سے حظ حاصل ہوتا ہو اس وجہ سے اس کے کلام کی تلاوت کرتا ہو اور مصنف کی محبت تلاوت کا باعث نہ ہوئی ہو، بخلاف اس شخص کے جو بدوں سمجھے ہوئے تلاوت کرتا ہو کہ اس کا باعث سوائے محبت مصنف کے اور کچھ نہیں۔

اصل دولت قرب خداوندی ہے اور وہ کلام اللہ کے سمجھنے پر موقوف نہیں۔ گو سب کے لیے اس کی اجازت نہیں کہ سب کے سب بدوں سمجھے ہوئے پڑھیں، بلکہ تھوڑے لوگ ایسے بھی ضرور ہونے چاہییں کہ خود بھی کلام اللہ کو سمجھتے ہوں اور دوسروں کو بھی سمجھا سکیں اور فضل کلی اس کو سمجھ کر پڑھنے ہی میں ہے۔ مگر ایک حیثیت سے اس شخص پر حق تعالیٰ کی زیادہ عنایت ہوگی جو بدوں سمجھے ہوئے کلام اللہ کی تلاوت کرتا ہو، کیوں کہ صرف حق تعالیٰ کی محبت اس کا باعث ہو سکتی ہے، سو کلام اللہ کا اصل نفع اس کے سمجھنے پر موقوف نہیں ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے حق تعالیٰ جل شانہٗ کو خواب میں دیکھا۔ عرض کیا کہ اے اللہ! وہ کون سا عمل ہے جو آپ سے زیادہ قریب کرنے والا ہے؟ ارشاد ہوا: وہ عمل تلاوت قرآن ہے۔ آپ نے عرض کیا: بِفَہْمٍ أَوْ بِلَا فَہْمٍ (کیا سمجھ کر یا بلا سمجھے)؟ ارشاد ہوا: بِفَہْمٍ أَوْ بِلَا فَہْمٍ (سمجھ کر ہو یا بدوں سمجھے ہو)۔ راز اس میں یہ ہے کہ مصنف اپنے کلام کے پڑھنے سے خوش ہوا کرتا ہے۔ پس جب بندہ حق تعالیٰ کے کلام کو پڑھے گا تو اللہ تعالیٰ خوش ہوں گے۔

تلاوت کی فضیلت کی ایک وجہ یہ ہے کہ جتنے بھی حق تعالیٰ کے افعال ہیں بندہ کے ویسے ہی افعال حق کی نقل نہیں ہوتے، صرف ایک تلاوت ہی ایسا فعل ہے کہ بندے کی تلاوت بالکل نقل ہوتی ہے کلام حق کی، یعنی جیسے اللہ تعالیٰ کلام کر رہے ہیں یہ بھی کلام کر رہا ہے۔ مثلاً: بندہ کا دیکھنا خدا تعالیٰ کے دیکھنے کی نقل نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ کا کلام جو پڑھ رہا ہے

وہ اس کے صیغوں کو ویسے ہی ادا کر رہا ہے جس طرح خدا تعالیٰ کلام فرماتے ہیں۔ مثلاً: بندہ نے تلاوت کی ﴿ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴾[1] یا پڑھا ﴿ وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ ﴾[2] یا اس کو ادا کیا ﴿ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا ﴾[3] وعلی هذا القیاس ہر جزو کی تلاوت میں قال اللّٰہ تعالیٰ کا اضافہ نہیں کیا جاتا۔ تو جیسے حق تعالیٰ کلام فرماتے ہیں اسی طرح بندہ بھی کلام کر رہا ہے اور تلاوت کا طریقہ بھی اہل طریق نے اس طرح تجویز کیا ہے کہ بندہ کے پڑھنے کے وقت یہ تصور کرے کہ گویا بندہ گراموفون ہے اور متکلّم حق سبحانہ تعالیٰ ہیں کہ اپنے کلام کو حق تعالیٰ نے اس میں بند کر دیا ہے اور وہ اس میں سے بلا قصد نکل رہا ہے؟ گویا یہ تجلّی کلامی ایسی ہی ہو رہی ہے جیسے شجرۂ طور پر ہوئی تھی۔ درخت سے آواز آ رہی تھی کہ ﴿ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا ﴾[4] وہ کلام حقیقت میں شجر کا نہ تھا، تو شجرہ تو محض واسطہ تھا، متکلّم اللہ تعالیٰ تھے، اسی طرح بندہ کی آواز سے اللہ تعالیٰ کلام فرما رہے ہیں جس طرح نَے یعنی بانسری میں سے آواز نکلتی ہے کہ وہ حقیقت میں نَے کی آواز نہیں بلکہ بجانے والے کی آواز ہے کہ نَے میں ہو کر نکل رہی ہے۔

پس تلاوت ایسی چیز ہے کہ اس میں پورا تشبہ ہے بندہ کو حق تعالیٰ کے ساتھ، اور جس کو کسی سے تشبہ ہو وہ اس کا مقرب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بادشاہ سواری پر نکلتے ہیں تو بعض مصالح سے مصاحبین کو اپنے جیسا لباس پہناتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تلاوت کرنے والے بندوں کو گویا اپنا خاص لباسِ کلام پہنایا۔ گویا بندے خاص مصاحب ہیں کہ ان کو لباسِ کلام سے آراستہ فرمایا ہے، بڑے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کے سینوں میں کلام اللہ ہے۔

کلام اللہ بڑی دولت ہے اس کی بے قدری نہ چاہیے۔ اس کی قدر کرو اور پڑھو خواہ سمجھ کر یا بے سمجھے، کیوں کہ کلام اللہ کی تلاوت سمجھ کر ہو یا بے سمجھے ہو اس میں خاصیت تشبہ بالحق کی ہے۔ اور یہی خاصیت ہے روزہ کی کہ اس میں بھی حق تعالیٰ کے ساتھ تشبہ ہے کیوں کہ خدا تعالیٰ کی شان ہے نہ کھانا نہ پینا نہ بی بی رکھنا، اور روزہ میں بندہ کی یہی حالت

[1] الأنبياء: ٦٩ [2] البقرة: ٣٥ [3] البقرة: ٦٦ [4] طه: ١٤

ہوتی ہے۔ روزہ میں ایک صمدیت کی شان ہے، لہٰذا دونوں عملوں میں تشبہ بالحق ہوا، یعنی تلاوت قرآن میں اور روزہ میں۔ یہ دونوں عمل رمضان میں ہیں اس لیے دونوں عملوں کو رمضان سے مناسبت ہوئی۔ ایک مناسبت قرآن اور روزہ میں یہ ہے کہ کلام اللہ سے انوار پیدا ہوتے ہیں، یہی خاصیت روزہ کی ہے کہ اس سے بھی انوار پیدا ہوتے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ انوار پیدا ہونے کی وجہ علیحدہ علیحدہ ہو، یعنی تلاوت میں اور وجہ ہو اور روزہ میں اور، وہ یہ کہ تلاوت عبادتِ وجودی ہے اور روزہ عدمی دونوں میں تفاوت ہے، مگر نورانیت پیدا کرنے میں مشترک ہیں۔

چناں چہ روزہ سے تو نور اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ کھانے سے قوتِ بہیمیہ میں ترقی ہوتی ہے اور نارِ شہوت بھڑکتی ہے اور اس کا غلبہ منافی ہے نور کے، اور جب روزہ میں آدمی کھانے پینے سے رُکے گا تو نارِ شہوت میں کمی ہوگی اور اس کمی سے نور میں ترقی ہوگی۔

مگر روزہ کے بعد بھی مادۂ شہوت باقی رہتا ہے اور اس کے رہنے میں بھی حکمت ہے کیوں کہ نارِ شہوت گو ایک درجہ میں منافی ہے نور کے، مگر بدوں اس کے نورانیت بھی حاصل نہیں ہوتی، اگر شہوت نہ ہوتی تو اجر کیسے ملتا؟ کیوں کہ نامرد کا زنا سے رکنا کوئی کمال نہیں اور نہ اس کو زنا سے بچنے پر کچھ ثواب ہے، پس اجر کے لیے مادۂ شہوت ہونا چاہیے۔ شہوت کی مثال ایسی ہے جیسے حمام میں خس وخاشاک سے آگ جلتی ہو کہ وہ ایک درجہ میں پانی کے لیے ضرری چیز ہے مگر پانی کے اندر اس سے حرارت ونورانیت آگئی۔ اگر آگ نہ ہو تو حرارت ونورانیت کیسے آئے؟ اور یہ نورانیت آئی کیسے؟ یہ آڑ کی وجہ سے آئی کہ پانی اور آگ میں ایک آڑ حائل ہے، یہ آڑ ہی کی برکت ہے کہ پانی میں نورانیت آگئی۔ اسی طرح نارِ شہوت گو ایسی چیز ہے کہ بعض مرتبہ نارِ شیطانی کی طرف پہنچا دیتی ہے۔ لیکن تقویٰ کی آڑ سے اگر اس کی حفاظت کی جائے تو اسی سے نورانیت بھی پیدا ہوتی ہے:

شہوت دنیا مثال گل خن است
کہ ازو حمام تقویٰ روشن ترست

خلاصہ یہ ہے کہ روزہ میں ترک باعث ہے نور کا اور تلاوت میں وجود سبب ہے نور کا۔

اس بیان سے یہ شبہ بھی رفع ہوگیا جو بعض نئے خیال کے لوگ کیا کرتے ہیں کہ ایسی حالت میں قرآن پڑھنے کا کیا نفع جب ہم اس کو سمجھتے ہی نہیں؟ مگر قرآن پڑھنے میں جو فائدہ ہے اس سے یہ لوگ ناواقف ہیں۔ اُوپر ان بعض فائدوں کا ذکر ہوچکا ہے۔

علاوہ بریں رسول اللہ ﷺ کو قرآن کے الفاظ کا اس قدر اہتمام تھا کہ فرشتہ کے ساتھ ساتھ پڑھنے کی مشقت اس اندیشہ سے برداشت فرماتے تھے کہ ان محبوب الفاظ میں سے کوئی لفظ میرے حافظہ میں سے نکل نہ جائے۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ کے منع کرنے کی نوبت آئی اور حق تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ کام ہمارے ذمہ ہے کہ قرآن پاک کو آپ ﷺ کے دل پر جمادیں گے۔ ﴿ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴾[1]۔

اس تسلی کے بعد حضور ﷺ فرشتے کے ساتھ نہیں پڑھتے تھے۔ جب حضور ﷺ کو الفاظِ قرآن کا اس درجہ اہتمام تھا تو ہم کو بھی ان کا اہتمام کرنا چاہیے کہ بدوں الفاظ کے معانی کی حفاظت نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا معانی کی نگہبانی یہی ہے کہ الفاظ کو یاد کیا جائے۔ جو نوتعلیم یافتہ الفاظِ قرآن کے پڑھنے کو بے فائدہ سمجھتے ہیں، درحقیقت وہ معانی قرآن کی بھی قدر نہیں کرتے، ورنہ اس کی حفاظت کے ہر سامان کی ان کو قدر ہوتی۔

صاحبو! الفاظ قرآن کو اس کی حفاظت میں بہت بڑا دخل ہے کیوں کہ الفاظ قرآن کا یہ معجزہ ہے کہ وہ نہایت سہولت سے حفظ ہوجاتے ہیں۔ تم اپنے حفظ پر کیا ناز کرتے ہو ذرا ''کافیہ'' یا اور کوئی نظم ونثر کی کتاب تو حفظ کرکے دیکھو آپ کو اس وقت اپنے حفظ کی حقیقت معلوم ہوجائے گی۔ یہ خدا تعالیٰ ہی کی تو حفاظت ہے کہ قرآن جیسی ضخیم کتاب کا حفظ کرنا ایسا آسان کردیا ہے کہ بچے تک حفظ کرلیتے ہیں۔ بلکہ تجربہ شاہد ہے کہ حفظ قرآن بچپن ہی میں اچھا ہوتا ہے۔ بڑے ہوکر ویسا حفظ نہیں ہوتا جیسا بچپن میں ہوتا ہے، اور یقیناً بچپن میں بچہ معانی قرآن سمجھنے کے قابل نہیں ہوتا۔ تو جو لوگ بدوں معانی سمجھے الفاظ قرآن کے پڑھنے کو بے کار کہتے ہیں، اب اگر ان لوگوں کے مشورہ پر بچوں کو قرآن نہ پڑھایا جائے تو اس کا انجام یہی ہوگا کہ حفظ کا دروازہ بند ہوجائے گا۔ یہ لوگ حق تعالیٰ کا مقابلہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ

[1] القيامة: ١٦

قرآن کے حافظ پیدا کرنا چاہتے ہیں تا کہ یہ محفوظ رہے اور یہ لوگ دنیا سے حفظِ قرآن کو مٹانا چاہتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کو قرآن کے الفاظ سے اس قدر عشق تھا کہ آپ ﷺ خود تو تلاوت کرتے ہی تھے، ایک دفعہ آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ مجھے قرآن سناؤ۔ انھوں نے عرض کیا: أعليك أقرأ وعليك أنزل؟ (أو كمال قال) (کیا حضور کو میں سُناؤں حالاں کہ آپ ہی پر تو قرآن اُترا ہے؟) فرمایا: ہاں، میں دوسرے کی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔

آخر حضور ﷺ نے صحابی سے یہ درخواست کیوں کی؟ حالاں کہ سارا قرآن آں حضرت ﷺ کو حفظ تھا اور اس کے معانی بھی آپ ﷺ کے ذہن مبارک میں حاضر تھے۔ صرف اسی لیے کہ قرآن کے الفاظ سے حضور ﷺ کو عشق تھا اور دوسرے سے سننے میں بہ وجہ یکسوئی کے زیادہ مزہ آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ صرف الفاظِ قرآن بھی بدوں لحاظِ معنی کے مطلوب ومقصود ہیں۔

صاحبو! اس سے بڑھ کر الفاظ قرآن کا نفع اور کیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ قرآن پڑھنے والے کی قراءت کی طرف بہت توجہ فرماتے ہیں اور اس کو نہایت توجہ سے سنتے ہیں اس سے بھی الفاظ کا مقصود ہونا ظاہر ہے کیوں کہ قراءت اور استماع الفاظ ہی کے متعلق ہے نہ کہ معانی کے۔

علاوہ ازیں اصل مقصود تمام طاعات سے قربِ حق ہے۔ حق تعالیٰ کے یہاں سے اولاً الفاظ آئے ہیں اور معانی ان کے تابع ہوکر آئے ہیں، پس الفاظ کو اللہ تعالیٰ سے قرب زیادہ ہوا۔ بفرضِ محال اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر ایسے الفاظ عطا کیے جاتے جن کے معانی بالکل قابلِ فہم نہ ہوتے تو بھی محبانِ خدا کے رقص کرنے کے لیے یہی بات کافی تھی کہ وہ محبوب کا عطیہ اور اس کا تحفہ ہے۔ کیوں کہ محبوب اگر عاشق کو کوئی چیز دے تو اس میں دو لذتیں ہوتی ہیں: ایک لذت تو محبوب کے ہاتھ سے ملنے کی ہے۔ دوسری لذت اس چیز کے استعمال کرنے کی۔ پھر عشاقِ الٰہی کے لیے تو الفاظِ قرآن ہی رقص کے واسطے کافی تھے۔ اس لیے کہ وہ عطیہ محبوب ہے اور وہ اولاً بالذات ہم کو ملے ہیں گو ان میں معانی بھی نہ ہوتے۔ مگر معانی کے ساتھ دو لذتیں جمع ہوگئیں، تو

اب یہ کیوں کر ہوسکتا ہے کہ لذتِ معانی سے لذتِ الفاظ کو چھوڑ دیا جائے بلکہ دونوں لذتیں قابلِ لحاظ ہیں۔ اور الفاظ کی لذت اس لیے بہت زیادہ قابلِ لحاظ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اولاً آئے ہیں۔ گویا باعتبارِ قصد کے معانی اصل ہیں اور الفاظ ان کے تابع ہیں۔

غرض بعض جہات سے الفاظ کو زیادہ قرب ہے اور بعض جہات سے معانی کو زیادہ قرب ہے اور کوئی ایک دوسرے سے مغنی اور بے پروا کرنے والا نہیں۔

الحمد للہ مختلف وجوہ سے اس مسئلہ کو ثابت کردیا گیا ہے کہ الفاظِ قرآن بدوں فہم معنی کے بھی مطلوب ہیں اور ان کا پڑھنا ہرگز بے کار نہیں۔ اب یہ دعویٰ بالکل باطل ہوگیا کہ بدوں معنی کے الفاظ پڑھنے سے کیا فائدہ؟ اس خیال کے لوگوں نے ایک قرآن صرف اردو ترجمہ کی صورت میں بدوں متنِ قرآن کے شائع کیا ہے۔ خوب سمجھ لیجیے کہ اس کا خریدنا حرام و ناجائز ہے، کیوں کہ اس کا منشا وہی ہے کہ یہ لوگ الفاظ قرآن کو بے کار سمجھتے ہیں۔

دوسرے اس میں بڑی خرابی یہ ہے کہ اگر یہ صورت شائع ہوگئی تو اندیشہ ہے کہ کبھی یہود ونصاریٰ کی طرح مسلمانوں کے پاس بھی صرف قرآن کا ترجمہ ہی رہ جائے اور اصل غائب ہوجائے۔ جیسا کہ تورات وانجیل کے تراجم ہی آج کل دنیا میں رہ گئے ہیں اور اصل کتاب معدوم ہوگئی۔ پھر ترجمہ کے اندر ہر شخص کو آسانی سے تحریف کا موقع مل جائے گا اور جب اصل قرآن بھی ترجمہ کے ساتھ ہوگا تو کسی کی تحریف چل نہیں سکتی، کیوں کہ اس سے ہر شخص ترجمہ کا مقابلہ کرکے اس کی صحت وخطا کا موازنہ کرسکتا ہے۔[1]

---

[1] فائدہ: ایسی ہی وجوہات کی بنا پر بغیر قرآن مجید کے صرف ترجمہ کے لکھنے کو فقہائے کرام نے تصریحاً منع اور ناجائز لکھا ہے۔ چناں چہ ''درمختار'' کے قول: وتجوز كتابة آية أو آيتين بالفارسية لا أكثر پر علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: في "الفتح" عن "الكافي": إن اعتاد القراءة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفًا بها يُمنع، وإن فعل في آية أو آيتين لا، فإن كتب القرآن و تفسير كل حرف وترجمته جاز... إلخ. (شامی: ۴۵۳) اور علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ نے شرح ہدایہ ''فتح القدیر'' کے ص: ۲۰۱، ج: ۱ پر یہ عبارت تحریر فرمائی ہے جس کا حوالہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے منقولہ بالا عبارت میں دیا ہے۔ اس مسئلہ ''عدم جواز کتابت ترجمہ قرآن مجرد از قرآن'' کی تحقیق حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ نے اپنی تصنیف ''بوادر النوادر'' کے ص: ۳۱۷، جلد: ۱ اور ''امداد الفتاویٰ'': ۳۸/۴ پر =

اس خیال کے بعض لوگوں نے ایک زمانہ میں یہ حرکت بھی شروع کی تھی کہ نماز کے اندر

= ایسی شرح وبسط اور تفصیل کے ساتھ اسی مذکورہ بالاعنوان سے فرمائی ہے کہ اس سے زیادہ بسط وتفصیل متصور نہیں ہے۔ اہل علم حضرات کو اس تحقیق کی طرف رجوع کرنے سے ان شاء اللہ تعالیٰ اس مسئلہ کے متعلق بڑا اطمینان حاصل ہوگا۔

اس جگہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مذکورہ مفاسد اور اسی طرح کے دیگر مفاسد کی بنا پر جن کا ذکر تطویل کے خوف سے اس مقام پر نہیں کیا گیا، قرآن مجید کے بغیر صرف ترجمہ کا لکھنا اور شائع کرنا اگرچہ ناجائز اور واجب المنع ہے۔ لیکن ناجائز اور ممنوع ہونے کے باوجود اگر ایسا ترجمہ لکھ کر شائع کر دیا جائے تو پھر مسئلہ یہ ہے کہ اس کا احترام کرنا لازم ہوگا اور اس ترجمہ کو بھی بغیر وضو کے ہاتھ لگانا اسی طرح ناجائز ہوگا جس طرح قرآن مجید کو بغیر وضو کے چھونا ممنوع ہے اور ناجائز ہے۔ نیز ترجمہ کے پڑھنے اور سننے والوں پر قرآن مجید کے پڑھنے اور سننے والوں کی طرح سجدۂ تلاوت بھی واجب ہو جائے گا۔

''عالمگیریہ'' میں ہے: ولو كان القرآن مكتوبا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة رحمه الله وكذا عندهما على الصحيح. هكذا في الخلاصة. (۲۴/۱) ۔ نیز ''عالمگیریہ'' میں ہے۔ وإذا قرأ آية السجدة بالفارسية فعليه وعلى من سمعها السجدة – فهم السامع أو لا – إذا أخبر السامع أنه قرأ آية السجدة. (۸۵/۱)

فقہاء رحمہم اللہ کی عباراتِ مذکورہ سے واضح ہے کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا حکم بھی بعض احکام میں مثل قرآن مجید کے ہے۔ اسی وجہ سے اس ترجمہ کو وضو کے بغیر ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے اور اس ترجمہ کے پڑھنے اور سننے والوں پر سجدۂ تلاوت بھی واجب ہو جاتا ہے۔ جب یہ ترجمہ بھی احترام وغیرہ احکام میں قرآن مجید کے مماثل ہے اور یہ یقینی بات ہے کہ عام طور پر لوگ اس ترجمہ کو قرآن مجید سے خالی دیکھ کر قرآن مجید کی طرح اس کا احترام نہیں کریں گے اور اس کو ہاتھ لگانے کے لیے وضو کا اہتمام نہیں کریں گے، بغیر وضو کے ہی اس کو ہاتھ لگایا کریں گے اور اس کی طرف پیٹھ کرنے اور اس سے اونچی جگہ بیٹھنے سے بھی پرہیز نہیں کریں گے اور بعض جری اور بے باک لوگ تو شاید اس کی طرف پاؤں کرنے کی جرأت بھی کرنے لگیں۔ اسی طرح اس ترجمہ کے بوسیدہ اوراق کا استعمال بھی ان کے ناقابل انتفاع ہو جانے کی صورت میں دوسرے معمولی کاغذوں اور اوراق کی طرح ہی کریں گے جو کہ بے حد گستاخی اور انتہائی بے ادبی ہے تو ایسی صورت میں ایسے ترجمہ کی اشاعت کی اجازت کیسے دی جا سکتی ہے؟ ان مفاسد کی وجہ سے بھی قرآن مجید کے بغیر صرف ترجمہ کا شائع کرنا ناجائز اور ممنوع ہے۔ کیوں کہ اس کی اشاعت ان ناجائز اور ممنوع امور کے ارتکاب کا سبب بنتی ہے اور جو چیز ناجائز امر کا سبب بنتی ہو وہ بھی بحکم مقدمة الحرام حرام ناجائز اور ممنوع ہو جاتی ہے۔

قرآن کا اردو ترجمہ پڑھنے لگے تھے اور دلیل وہی تھی کہ بے سمجھے قرآن پڑھنے سے کیا نفع ہے؟ اس کے چند جواب عقلی اور نقلی اوپر گزر چکے ہیں۔

ایک اور جواب جوان لوگوں کے مذاق کے موافق اور اس خیال کی جماعت پر زیادہ اثر انداز ہوسکتا ہے، ذیل میں تحریر ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ بعض خاصیتیں قرآن مجید کے الفاظ کی ہیں اور بعض خاصیتیں اس کے معانی کی۔ معانی کی خاصیت تو یہ ہے کہ ان کو سمجھ کر پڑھنے سے قرآن کا مطلب معلوم ہوگا، اور الفاظ کی خاصیت متکلّم کی عظمت وشوکت اور صولت کا استحضار ہے اور یہ صرف قرآن ہی کے الفاظ کے ساتھ خاص ہے، دوسری کسی زبان کو خواہ اس میں کیسا ہی فصیح وبلیغ ترجمہ کردیا جائے ہرگز نصیب نہیں ہوسکتی۔ اور عبادت سے مقصود معبود کی عظمت دل میں پیدا کرنا ہے اور افعالِ جوارح سے اس عظمت کا ظاہر کرنا ہے نہ کہ صرف استحضار قصص وواقعات۔

پس جو لوگ اردو ترجمہ سے نماز پڑھیں گے ان کے دل میں خدا تعالیٰ کی وہ عظمت نماز کے اندر پیدا نہیں ہوگی جو الفاظ قرآن کے ساتھ نماز سے پڑھنے والوں کے دل میں آتی ہے کیوں کہ جو لوگ نماز میں ایسی زبان میں قرآن پڑھیں گے جو بندوں کی ایجاد ہے جو یقیناً اصلی کلام الٰہی کے برابر باعظمت وباشوکت نہ ہوگی۔ نیز ان لوگوں کو نماز میں یکسوئی بھی حاصل نہ ہوگی۔ کیوں کہ یکسوئی کے لیے استحضارِ عظمت ضروری ہے اور ترجمہ سے اس درجہ استحضار عظمت نہ ہوگا جو اصل قرآنی الفاظ سے ہوتا ہے۔ غرض محبت وعشق خداوندی کے لحاظ سے بھی اور نقل وعقل کے اعتبار سے بھی الفاظ قرآن کے اہتمام کا نہایت ضروری ہونا ثابت ہوگیا۔

پس مسلمانوں کو تعلیم قرآن اور تلاوت قرآن کا پابندی کے ساتھ اہتمام کرنا چاہیے۔ اور جب الفاظ قرآن مقصود ہیں تو ان کے صحیح پڑھنے کا بھی اہتمام ضروری ہے۔ کیوں کہ جب تک الفاظ کو صحیح طور پر ادا نہ کیا جائے گا اس وقت تک وہ عربی زبان نہ کہلائے گی۔ اس واسطے شرعاً علم تجوید کا حاصل کرنا ضروری اور واجب ہے۔ حتیٰ کہ علامہ جزری نے فرمایا ہے کہ جو معلّم تجوید کے ساتھ نہ پڑھاتا ہو اس کو تنخواہ لینا جائز نہیں ہے۔[1] البتہ جو شخص قرآن کے صحیح کرنے

[1] نہایۃ القول المفید

کے لیے پوری کوشش میں لگ جائے اور کسی قاری سے حروف کے صحیح کرنے کی مشق شروع کردے، مگر پھر بھی اس کی زبان کے اندر نقص ہونے کی وجہ سے حروف صحیح نہیں ہوئے اور قاری نے کہہ دیا کہ تم سے اُمید نہیں ہے کہ تمھاری زبان درست ہوگی۔ تو اس وقت وہ معذور ہے اور اس کو اجازت ہے کہ جس طرح بھی وہ پڑھ سکتا ہے پڑھتا رہے، اب اس پر غلط پڑھنے کی وجہ سے کوئی مؤاخذہ نہیں ہے اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو وہی ثواب دیں گے جو صحیح پڑھنے والوں کو دیا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ

الماهر بالقران مع السفرة الكرام البررة، والذي يقرأ القرآن و يتتعتع فيه وهو عليه شاق فله أجران.[1]

قرآن کا ماہر ان فرشتوں کے ساتھ ہوگا جو لکھنے والے بزرگ نیکوکار ہیں، اور وہ شخص جو قرآن پڑھنے میں اٹکتا ہے اور قرآن کا پڑھنا اس پر مشکل ہوتا ہے اس کے واسطے دوہرا ثواب ہے۔

فائدہ: ماہر قرآن سے وہ شخص مراد ہے جس کو قرآن خوب یاد ہو اور پڑھنے میں اس کو دشواری پیش نہ آتی ہو۔ اور فرشتوں سے مراد وہ فرشتے ہیں جو کہ لوح محفوظ سے اللہ تعالیٰ کی کتابیں لکھتے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ ماہر قرآن دنیا میں ان فرشتوں جیسا عمل کرتا ہے کہ بے تکلف قرآن کو فرشتوں کی طرح پڑھتا ہے اور آخرت میں اس کو درجات ملیں گے، ان میں وہ فرشتوں کا رفیق ہوگا۔ اور دوہرے ثواب سے مراد یہ ہے کہ ایک ثواب پڑھنے کا اور دوسرا ثواب اس میں مشقت اُٹھانے کا ملتا ہے۔ اس میں رغبت دلائی ہے اٹک کر پڑھنے والے کو قرآن پاک کی طرف کہ اس طرح پڑھنے میں بھی فضیلت اور ثواب حاصل ہے بلکہ مشقت کے اعتبار سے اس میں زیادہ ثواب ہے۔ قرآن کریم کے پڑھنے اور پڑھانے پر بڑا اجروثواب ملتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ.[2]

تم میں سے سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن کریم کو سیکھے اور سکھلاوے۔

کلام پاک چوں کہ دین کی اصل ہے اس کی حفاظت اور بقا پر ہی دین کا مدار ہے اس

[1] بخاری ومسلم [2] بخاری

لیے اس کے سیکھنے اور سکھانے کا افضل ہونا ظاہر ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا: صاحبِ قرآن (مراد حافظِ قرآن ہے) کو کہا جائے گا کہ قرآن پڑھ اور اوپر چڑھ (یعنی بہشت کے درجوں پر) اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو ٹھہر ٹھہر کر دنیا میں پڑھتا تھا۔ پس تیرا ٹھکانہ وہی ہے جہاں آخری آیت پر تو پہنچے۔ یعنی قرآن کی ایک ایک آیت پڑھتا جا اور جنت کے ایک ایک درجہ کے اوپر چڑھتا چلا جا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ جنت کے درجات بقدر آیاتِ قرآنیہ کے ہیں، پس اگر صاحبِ قرآن تمام قرآن پڑھے گا تو جنت کے اس آخری درجہ پر پہنچ جائے گا جو اس کے حال کے لائق اور مناسب ہوگا۔ گویا ہر آیت قرآن کریم کی جنت کا ایک درجہ ہے، جتنی آیتوں کی تلاوت کرے گا اتنے درجے جنت کے مل جائیں گے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ اگر دنیا میں بکثرت تلاوت کرتا رہا تب تو آخرت میں بھی یاد رہے گا ورنہ اس وقت بھول جائے گا اور کچھ نہ پڑھ سکے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرماویں کہ ہم میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کو والدین نے اپنے دینی شوق میں قرآن مجید یاد کرا دیا تھا مگر وہ اپنی لاپرواہی اور بے توجہی سے دنیا ہی میں اس دولت کو ضائع کر دیتے ہیں۔ اور جو شخص قرآن پاک کے یاد کرنے اور اس میں محنت و مشقت برداشت کرتا ہوا مر جائے بروئے حدیث وہ بھی حفاظ کی جماعت میں شمار کر لیا جائے گا۔

ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: جس شخص کو قرآن کریم میری یاد اور مانگنے سے باز رکھے (یعنی جس کو قرآن یاد کرنے اور معانی سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں قرآن کے سوا ذکر و دعا کرنے کا موقع نہیں ملتا) تو میں اس کو مانگنے والوں سے بہتر دیتا ہوں۔ اور کلام الٰہی کی بزرگی تمام کلاموں میں ایسی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی بزرگی اس کی تمام مخلوق پر (ایسے ہی جو شخص قرآن مجید کے ساتھ مشغول ہے اس کی فضیلت ان تمام لوگوں پر ہے جو غیر کلام الٰہی میں مشغول ہیں)۔

رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ کی کتاب (قرآن کا) ایک حرف پڑھے اس کے واسطے ہر حرف پر ایک نیکی ہے اور ہر نیکی دس نیکی کے برابر ہے (یعنی ہر حرف پر دس نیکیاں

لکھی جاتی ہیں)۔(پھر فرمایا:) میں یہ نہیں کہتا کہ سارا (الـم) ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے اور لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔ یعنی الـم کہنے پر تیس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ کلام پاک کی تلاوت میں ہر ہر حرف پر ایک ایک نیکی شمار کی جاتی ہے اور ہر نیکی پر حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے دس حصے اجر دینے کا وعدہ ہے اور یہ کم سے کم درجہ ہے اور جس کے لیے چاہتے ہیں اجر زیادہ بڑھا دیتے ہیں۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ ناقل ہیں کہ ابو اُمامہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ قرآن شریف کو حفظ کیا کرو، اس لیے کہ حق تعالیٰ جل شانہٗ اس قلب کو عذاب نہیں فرمائے گا جس میں کلام پاک محفوظ ہو۔[1]

جو لوگ حفظ قرآن کو فضول بتاتے ہیں وہ خدارا ذرا ان فضائل پر بھی غور کریں کہ یہی ایک فضیلت ایسی ہے جس کی وجہ سے ہر شخص کو حفظ قرآن پر جان دے دینا چاہیے۔ نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بروایت دیلمی نقل کیا ہے کہ حاملینِ قرآن یعنی حفاظ اللہ تعالیٰ کے سایہ کے نیچے انبیا اور برگزیدہ لوگوں کے ساتھ ہوں گے۔[2]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص کے قلب میں قرآن شریف کا کوئی حصہ بھی محفوظ نہیں وہ بمنزلہ ویران گھر کے ہے۔ اور جو قلب کلامِ پاک سے خالی ہو اس پر شیطان کا تسلط زیادہ ہوتا ہے۔ اس حدیث شریف میں حفظ کی کس قدر تاکید ہے کہ اس دل کو ویران گھر ارشاد فرمایا جس میں کلام پاک محفوظ نہیں۔[3]

تلاوت قرآن پاک سے دلوں کا وہ زنگ بھی دور ہوتا ہے جو کثرت معاصی اور اللہ جل شانہٗ کی یاد سے غفلت کی وجہ سے دلوں پر لگ جاتا ہے۔ کثرت تلاوت سے دل صاف اور منور ہو جاتے ہیں اور وہ مکانات بھی روشن اور چمکیلے ہو جاتے ہیں جس میں کلام پاک کی تلاوت کی جاتی ہے۔ ''شرح احیاء'' میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ جن گھروں میں کلام پاک کی تلاوت کی جاتی ہے وہ مکانات آسمان والوں کے لیے ایسے چمکتے ہیں جیسا کہ زمین والوں کے لیے آسمان پر ستارے۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرمایا ہے کہ کوئی قوم اللہ تعالیٰ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہو کر تلاوت کلام اور اس کا ورد نہیں کرتی

[1] از فضائل [2] از فضائل [3] از فضائل

نگران پر سکینہ نازل ہوتی ہے (سکینہ سے مراد ایسی چیز ہے جو جامع ہے طمانینت اور سکون قلب اور رحمتِ خاص کو جو ملائکہ کے ساتھ نازل ہوتی ہے)، اور رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے، اور ملائکہ رحمت ان کو گھیر لیتے ہیں، اور حق تعالیٰ جل شانہٗ ان کا ذکر ملائکہ کی مجلس میں فرماتے ہیں۔

اس حدیث شریف میں قرآن کے مکاتب اور مدرسوں کی خاص فضیلت بیان کی گئی ہے جو بہت سی اَنواعِ اِکرام کو شامل ہے، ان میں ہر ہر اکرام ایسا ہے کہ جس کے حاصل کرنے میں اگر کوئی شخص اپنی تمام عمر خرچ کردے تب بھی اَرزاں ہے، بالخصوص آخری فضیلت آقا کے دربار میں ذکر، محبوب کی مجلس میں یاد ایک ایسی نعمت ہے جس کا مقابلہ کوئی چیز بھی نہیں کرسکتی۔[1]

قرآن پاک کی تلاوت کے وقت ملائکہ کے ڈھانپ لینے کا ذکر متعدد روایات میں وارد ہوا ہے۔ اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کا مفصل واقعہ کتبِ حدیث میں آتا ہے کہ انھوں نے تلاوت کرتے ہوئے اپنے اوپر ایک ابر سا چھایا ہوا محسوس کیا اور اس میں چراغوں کے مانند روشنی دیکھی، جب انھوں نے اس کا ذکر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ ملائکہ تھے جو تیرا قرآن شریف سننے کے لیے آئے تھے (ملائکہ اژدہام اور کثرت کی وجہ سے ابر سا معلوم ہوتے تھے)، اور یہ چراغ کی طرح روشن فرشتوں کے منہ تھے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ضعفائے مہاجرین کی جماعت میں بیٹھا ہوا تھا، ان لوگوں کے پاس کپڑا بھی اتنا نہ تھا کہ جس سے پورا بدن ڈھانپ لیں بعض لوگ بعض کی اوٹ کرتے تھے (مجمع میں ستر کے علاوہ اور بدن کے کھلنے سے بھی حجاب معلوم ہوا کرتا ہے اس لیے ایک دوسرے کے پیچھے بیٹھ گئے تھے کہ بدن نظر نہ آوے) اور ایک شخص قرآن شریف پڑھ رہا تھا کہ اتنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہوئے اور بالکل ہمارے قریب کھڑے ہوگئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے پر قاری چپ ہوگیا (یہ خاموشی ادب کی وجہ سے تھی) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کیا اور پھر دریافت فرمایا کہ تم لوگ کیا کر رہے تھے؟ ہم نے عرض کیا کہ کلام اللہ سن رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمام تعریف اسی اللہ کے لیے ہے جس نے میری اُمت میں

[1] از فضائل

ایسے لوگ پیدا فرمائے کہ مجھے ان میں ٹھہرنے کا حکم کیا گیا۔ اس کے بعد حضور ﷺ ہمارے بیچ میں بیٹھ گئے تاکہ سب کے برابر رہیں، کسی کے قریب کسی سے دور نہ ہوں۔

قرآن شریف پڑھنے کے فضائل تو ہیں ہی بے حد۔ اس کے سننے کے فضائل بھی متعدد روایات میں آئے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا فضیلت ہوگی کہ سید المرسلین ﷺ کو بھی ایسی مجلس میں شرکت کا حکم ہوا ہے، جیسا کہ اس روایت سے معلوم ہوا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ منبر پر تشریف فرما تھے۔ ارشاد فرمایا کہ مجھے قرآن شریف سنائیں۔ میں نے عرض کیا: حضور ﷺ پر تو خود نازل ہی ہوا ہے، حضور کو کیا سناؤں؟ ارشاد ہوا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ دوسرے سے سنوں۔ اس کے بعد انھوں نے سورۂ نساء سے سنایا تو حضور ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

ایک مرتبہ سالم مولیٰ حذیفہ رضی اللہ عنہ کلام مجید پڑھ رہے تھے کہ حضور اکرم ﷺ دیر تک کھڑے ہوئے سنتے رہے۔ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا قرآن شریف سنا تو تعریف فرمائی۔ ان روایات سے قرآن مجید سننے کی فضیلت اور ان کا ثواب معلوم ہوتا ہے۔

اوپر کی احادیث و روایات میں قرآن مجید کی تلاوت وسماعت پر جو ثواب بیان فرمایا گیا ہے یہ اس وقت ہے جب نماز سے باہر اور بے وضو قرآن کریم پڑھا یا سنا جائے لیکن اگر قرآن مجید کی تلاوت نماز میں کی جائے یا وضو کے ساتھ اس کو پڑھا جائے تو پھر قرآن کا ثواب بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

چناں چہ صاحبِ احیاء نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جس شخص نے نماز میں کھڑے ہو کر کلام پاک پڑھا اس کو ہر حرف پر سو نیکیاں ملیں گی، اور جس شخص نے نماز (نفل) میں بلا عذر بیٹھ کر پڑھا اس کے لیے پچاس نیکیاں، اور جس نے بغیر نماز کے وضو کے ساتھ پڑھا اس کے لیے پچیس نیکیاں، اور جس نے بلا وضو پڑھا اس کے لیے دس نیکیاں، اور جو شخص پڑھے نہیں بلکہ پڑھنے والے کی طرف کان لگا کر سنے اس کے لیے بھی ہر حرف کے بدلے ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔

مسئلہ: بعض علما کا فتویٰ ہے کہ قرآن پاک کا سننا پڑھنے سے زیادہ افضل ہے اس لیے کہ قرآن

پاک کا پڑھنا نفل ہے اور سننا فرض ہے اور فرض کا درجہ نفل سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔

مسئلہ: بغیر وضو قرآن شریف کو ہاتھ لگانا جائز نہیں مگر تلاوت بغیر ہاتھ لگائے کر سکتا ہے۔

فائدہ: قرآن کا پڑھنا نماز کے اندر فرض ہے اور جس قدر بھی طویل قراءت کی جائے گی وہ سب فرض سے ملحق ہوکر اس پر فرض کی ادائیگی کا ثواب ملے گا اس لیے نماز میں قراءت کرنے اور سننے والوں دونوں کو برابر ہر حرف پر سو سو نیکیاں ملیں گی۔

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تراویح کے اندر قرآن پاک کا پڑھنا اور اس کا سننا کس قدر ثوابِ عظیم اور فضیلت رکھتا ہے۔ قرآن پاک کا پڑھنا اور سننا جس طرح بہت بڑے اجر وثواب کا کام ہے اسی طرح قرآن پاک کی تعلیم دینا اور اس کو سکھلانا بھی بہت بڑا کارِ ثواب اور فضیلت کا باعث ہے۔

حاکم نے بریدہ رضی اللہ عنہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ جو شخص قرآن شریف پڑھے اور اس پر عمل کرے اس کو ایک تاج پہنایا جائے گا جو نور سے بنا ہوا ہوگا، اور اس کے والدین کو ایسے دو جوڑے پہنائے جائیں گے کہ تمام دنیا ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ عرض کریں گے: یا اللہ! یہ جوڑے کس صلہ میں ہیں؟ تو ارشاد ہوگا کہ تمھارے بچہ کے قرآن شریف پڑھنے کے عوض میں۔ [1]

''جمع الفوائد'' میں ''طبرانی'' سے منقول ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ جو شخص اپنے بیٹے کو ناظرہ قرآن شریف سکھلاوے اس کے سب اگلے اور پچھلے گناہ معاف ہوجاتے ہیں، اور جو شخص حفظ کرائے اس کو قیامت میں چودھویں رات کے چاند کے مشابہ اُٹھایا جائے گا اور اس کے بیٹے سے کہا جائے گا کہ پڑھنا شروع کر۔ جب بیٹا ایک آیت پڑھے گا، باپ کا ایک درجہ بلند کیا جائے گا حتیٰ کہ اسی طرح تمام قرآن شریف پورا ہو۔ [2]

حضرت معاذ جہنی رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ جو شخص قرآن شریف پڑھے اور اس پر عمل کرے اس کے والدین کو قیامت کے دن ایک تاج پہنایا جاوے گا جس کی

---

[1] از فضائل [2] از فضائل

روشنی آفتاب کی روشنی سے بھی زیادہ ہوگی، اگر وہ آفتاب تمھارے گھروں میں ہوتا، پس کیا گمان ہے تمھارا اس شخص کے متعلق جو خود عامل ہے؟ یعنی آفتاب اتنی دور سے اس قدر روشنی پھیلا رہا ہے اگر وہ گھر کے اندر آجائے تو یقیناً بہت زیادہ روشنی اور چمک کا سبب ہوگا، تو قرآن پڑھنے والے کے والدین کو جو تاج پہنایا جائے گا اس کی روشنی اس روشنی سے زیادہ ہوگی جس کو گھر میں طلوع ہونے والا آفتاب پھیلا رہا ہو۔ بچہ کے قرآن شریف پڑھنے پر والدین کے یہ فضائل اور ان کو یہ اجر وثواب صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ اس کی تعلیم کا سبب بنے اور انھوں نے کوشش کر کے قرآن پاک پڑھانے کے لیے اس کو مکتب و مدرسہ میں بھیجا۔ دنیا کے چار پیسے کے لالچ میں آکر قرآن کی تعلیم سے منہ نہیں موڑا۔ اس کی تعلیم کو بے کار نہیں بتلایا، اضاعت عمر نہیں سمجھا اس کو بے کار دماغ سوزی اور بے نتیجہ عرق ریزی نہیں کہا۔

آج اس کی تعلیم پر بڑے زور سے اس لیے انکار کیا جاتا ہے کہ مسجد کے ملانوں نے یہ اپنے ٹکڑوں کے لیے دھندا کر رکھا ہے۔ مگر خدارا ذرا غور تو کیجیے کہ (بقول شما) ان خود غرض ملانوں کی خود غرضیوں کے ثمرات ونتائج تو آپ دنیا میں یہ دیکھ رہے ہیں کہ حکومت برطانیہ کے تقریباً دو سو سالہ عہد حکومت میں تعلیم قرآن کے اندر حکومت کی ہر طرح سے رکاوٹ کے باوجود اور جبریہ تعلیم کے قوانین کے نفاذ کے باوجود جس کے ذریعہ والدین بچوں کو جبراً قرآن کے مکاتب سے ہٹانے پر مجبور کر دیے گئے تھے اور قرآن پاک کی تعلیم حفظ یا ناظرہ پڑھانے کے بجائے پرائمری پڑھانا ان پر لازم اور ضروری کر دیا گیا تھا، اور ادھر قوم کی طرف سے بھی ان کو خود غرض لالچی مُلّا کہہ کر عضوِ معطل کی طرح سمجھ لیا گیا تھا۔ لیکن اس سب کے باوجود ان ملّانوں نے اپنوں کے طعنے برداشت کیے، غیروں کے اعتراضات سنے مگر قرآن پاک کی امانت کو گلے لگائے رکھا۔ آج اسی کی برکت ہے کہ اس زمانے میں بھی قرآن پاک کے حفاظ لاکھوں کی تعداد میں اس ملک کے اندر موجود ہے جن کے سینے کلامِ الٰہی کی امانت کے گنجینے اور اس کے الفاظ کی حفاظت کے خزینے ہیں۔

غور تو کیجیے کہ اگر آپ کی ان بے غرضانہ تجاویز جبریہ قوانین پر عمل درآمد ہوجاتا تو ان کے ثمرات کیا ہوتے؟ اور ان تجاویز کے ذریعے کلام پاک کی نشر واشاعت میں کس قدر مدد ملتی؟

خدارا انصاف کیجیے کیا جبریہ تعلیم کے قوانین کالازمی نتیجہ یہی نہ ہوتا کہ قرآن مجید کا ملک میں ایک بھی نام لینے والا نہ ملتا اور ملک کا ملک حفاظ قرآن سے یکسر خالی ہو جاتا؟ خدانخواستہ قرآن مجید کے دنیا سے ختم ہو جانے کے بعد کیا پھر مسلمانوں کی کوئی قومی خصوصیت باقی رہ سکتی ہے؟

گر ہمی خواہی مسلماں زیستن
جز بقرآں نیست ممکن زیستن

سربرآوردگانِ قوم کی خدمت میں التماس

سربرآوردگان قوم کی خدمت میں التماس ہے کہ اگر آپ اسلام کے مدعی ہیں اور مسلم ہونے کا دعویٰ ہے اور آپ کے نزدیک اسلام صرف زبانی جمع خرچ کا نام نہیں ہے بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرماں برداری سے بھی آپ کے اسلام کو سروکار ہے تو پھر قرآن پاک کی اشاعت اور اس کی تعلیم کا انتظام بھی آپ کے ذمہ فرض اور لازم ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کی یہی صورت ہے کہ جس جس جگہ قرآن پاک اور علومِ دینیہ کی تعلیم کا انتظام ہے اس کی اعانت اور سرپرستی کی جائے اور جس مقام پر انتظام نہیں ہے اس جگہ تعلیم قرآن کا انتظام کیا جائے۔ اس فریضہ کی ادائیگی سے آپ یہ کہہ کر سبکدوش نہیں ہو سکتے کہ مکتب کے میاں جی بچوں کی عمر ضائع کر دیتے ہیں، اس لیے ہم وہاں نہیں پڑھانا چاہتے۔ قرآن پاک کی حفاظت اور اس کا حفظ کرنا امت پر فرضِ کفایہ ہے۔ اگر کوئی بھی (العیاذ باللہ) حافظ نہ رہے تو تمام مسلمان فرض کے تارک اور گناہ گار ہوں گے۔ اس زمانہ ضلالت وجہالت میں جہاں ہم مسلمانوں کے اندر اور بہت سے دینی امور کے بارے میں گمراہیاں پھیل رہی ہیں وہاں ایک عام آواز یہ بھی اٹھ رہی ہے کہ قرآن شریف کے حفظ کرنے کو فضول سمجھا جا رہا ہے، اس کے الفاظ رٹنے کو حماقت بتلایا جاتا ہے اور اس کو دماغ سوزی اور تضییع اوقات کہا جاتا ہے۔

افسوس حضور اکرم ﷺ تو فرماویں کہ اے ابوذر (رضی اللہ عنہ)! اگر تو صبح کو جا کر ایک آیت کلام اللہ شریف کی سیکھ لے تو نوافل کی سو رکعات سے افضل ہے۔ اور حضور ﷺ کا ارشاد کہ قرآن شریف کی خبر گیری کیا کرو اسی صورت میں قرآن شریف سینوں میں محفوظ اور یاد رہ سکتا ہے۔

اور ہم مسلمان اس کے پڑھنے اور یاد کرنے کو حماقت اور بے کار اضاعت وقت سمجھیں۔ قرآن پاک سے اس قدر غفلت اور بے توجہی! پھر بھی ہماری تباہی کے لیے کسی اور چیز کے انتظار کی ضرورت باقی ہے؟

قرآن شریف کا حفظ یاد ہو جانا درحقیقت یہ خود قرآن شریف کا ایک کھلا معجزہ ہے۔ اسی وجہ سے حق تعالیٰ جل شانہ نے اس کے یاد ہو جانے کو سورۂ قمر میں بطور احسان کے ذکر فرمایا اور بار بار اس پر تنبیہ فرمائی:

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾[1]

ہم نے کلام پاک کو حفظ کرنے کے لیے سہل کر رکھا ہے کوئی ہے حفظ کرنے والا؟

صاحب جلالین فرماتے ہیں کہ استفہام اس آیت میں امر کے معنی میں ہے۔ تو تعجب کی بات ہے کہ جس چیز کی حق تعالیٰ جل شانہ بار بار تاکید فرما رہے ہوں اور جس لطف واحسان کو عام فرما رکھا ہو ہم اس کی یہ قدردانی کریں کہ اس کو فضول سمجھیں۔

فضیلت شبِ قدر

اس مبارک مہینہ میں ایک عظیم الشان نعمت اور بڑی بھاری دولت لیلۃ القدر کا ہونا ہے جس کی وجہ سے رمضان المبارک کی عظمت اور برکت میں اور بھی چار چاند لگ گئے اور اس کی شان دوبالا ہوگئی۔ اس رات کی فضیلت میں یہی بات کچھ کم نہیں تھی کہ اس کی فضیلت کے بیان کے لیے قرآن پاک میں ایک پوری سورت (سورۂ قدر کے نام سے) نازل ہو چکی ہے جس میں بیان فرمایا گیا ہے کہ اس رات میں عبادت کرنا ہزار مہینہ کی عبادت سے افضل اور بہتر ہے۔ جتنا ثواب ہزار مہینوں کی عبادت سے ملتا ہے اس سے کہیں زیادہ ثواب صرف اس ایک رات کی عبادت میں ملتا ہے، اور اس زیادہ ثواب کی کوئی حد بھی بیان نہیں فرمائی گئی۔

اس بنا پر اگر کوئی یوں امید رکھے کہ بے شمار ثواب ملے گا جو شمار ہی میں نہیں آسکتا تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس کو "أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ" کے مطابق بے شمار ثواب ملے گا۔ حق تعالیٰ بندے

---

[1] القمر: ۱۷

کے ساتھ اس کے ظن کے مطابق معاملہ فرماتے ہیں۔ یہ جو مشہور ہے کہ اس شب کا ثواب ہزار مہینہ کے برابر ہے، یہ غلط ہے، بلکہ اس رات کی عبادت کا ثواب ہزار مہینہ سے کہیں زیادہ ہے۔

اس کے علاوہ بہت سی احادیث اس کے فضائل اور اس میں عبادت کرنے کی ترغیب میں وارد ہوئی ہیں۔ ''درمنثور'' میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ شبِ قدر حق تعالیٰ جل شانہ نے میری امت کو مرحمت فرمائی ہے پہلی اُمتوں کو نہیں ملی۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص لیلۃ القدر میں ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے (عبادت کے لیے) کھڑا ہوا اُس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔

فائدہ: ثواب کی امید رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ محض اللہ کی رضا اور ثواب کے حصول کی نیت سے کھڑا ہوا، یعنی عبادت کرے ریا وغیرہ کسی بدنیتی سے نہ کھڑا ہو۔ کھڑا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نماز پڑھے اور اسی حکم میں ہے کسی اور عبادت تلاوتِ قرآن اور ذکر وغیرہ میں مشغول ہونا۔

فائدہ: حدیثِ بالا اور اس جیسی احادیث میں گناہ سے مراد علما کے نزدیک صغیرہ گناہ ہوتے ہیں۔ کیوں کہ کبیرہ گناہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے۔ احادیث میں صغائر (چھوٹے) کی قید دو وجہ سے مذکور نہیں ہوئی: اول تو یہ کہ مسلمان کی شان یہ ہے ہی نہیں کہ اس کے ذمہ کوئی کبیرہ گناہ ہو کیوں کہ اگر کبیرہ گناہ اس سے صادر ہو جاتا ہے تو اس وقت تک اس کو چین ہی نہیں آتا جب تک کہ وہ اس گناہ سے توبہ نہیں کر لیتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جب لیلۃ القدر جیسے مواقع آتے ہیں تو اپنی بداعمالیوں پر ندامت اس کے لیے گویا لازم ہے اور توبہ کی حقیقت گزشتہ پر ندامت اور آیندہ کو نہ کرنے کا عزم ہے۔

شبِ قدر کی تعیین میں علما کے بہت اقوال ہیں۔ راجح قول یہ ہے کہ وہ اس مبارک مہینہ کی آخری عشرہ کی پانچ طاق راتوں میں سے کسی ایک رات میں ہوتی ہے اور کسی سال کسی رات میں غیر معیّن طور پر ہوتی ہے۔ ہر سال ایک ہی رات میں نہیں ہوتی مگر ہوتی ان ہی پانچ راتوں میں سے کسی ایک رات میں ہے اس لیے مختلف راتوں میں اس کا ہونا بیان کیا گیا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتی ہیں کہ لیلۃ القدر کو رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔ بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی رائے ہے کہ وہ رمضان المبارک کی ۲۷ شب ہوتی ہے۔

فائدہ: اخیر عشرہ اکیسویں رات سے شروع ہوتا ہے۔ بیسواں روزہ گزار کر جو رات آئے گی وہ اکیسویں ہوگی۔ اسی طرح طاق راتیں وہ ہیں جن کے بعد طاق عدد کا روزہ ہو کیوں کہ شریعت میں رات پہلے آتی ہے اس کے بعد دن آتا ہے۔ سبحان اللہ! شریعت نے بندوں کے ضعف کی کس قدر رعایت فرمائی ہے کہ عشرۂ اخیرہ کی ہر رات کو شبِ قدر کی تلاش کے لیے مقرر نہیں فرمایا بلکہ وتر (طاق) راتیں مقرر کیں۔ تاکہ درمیان میں ایک رات آرام کرلیا کریں۔ کیوں کہ دن کو سونے میں اتنی راحت نہیں ملتی جتنی رات کے سونے میں ملتی ہے۔ یعنی اگر عشرۂ اخیرہ کی ہر رات کو شبِ قدر تلاش کرنے کا حکم ہوتا تو اس صورت میں دسوں راتیں جاگنے ہی میں گزرتیں تو عشاق کے لیے بہت دشواری پیش آتی۔

اس رات میں دوسری راتوں کی نسبت معمول سے زیادہ جاگنا مناسب ہے۔ اب قوی کمزور اور ہمتیں ضعیف ہوگئی ہیں تحمل و برداشت کے موافق ان راتوں میں شب بیداری کرنی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ رات بھر جاگ کر صبح کی جماعت فوت کردے۔ عشا کی نماز کو جماعت سے ادا کر کے سوجانا اور پھر صبح کی نماز باجماعت ادا کرنا اس سے بہتر ہے کہ شب بھر جاگ کر صبح کی جماعت کو فوت کردے۔ اگر زیادہ کچھ بھی نہ ہو سکے تو ان راتوں میں نماز باجماعت کا خاص اہتمام کرے تاکہ اس کی برکت سے بالکل ہی محروم نہ رہ جائے۔

رہی یہ بات کہ ان راتوں میں کون سی عبادت کرنا زیادہ بہتر ہے۔ سو سب سے بہتر اس رات میں نفل پڑھنا ہے۔ کیوں کہ ان راتوں میں قیام کی افضلیت آئی ہے اور قیام نفلوں میں ہوتا ہے۔ اگر کچھ حصہ رات کا تلاوت قرآن اور ذکر اللہ میں گزار دے تو اور بھی بہتر ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اگر مجھے شبِ قدر کا پتہ چل جائے تو کیا دُعا مانگوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا پڑھنے کے لیے فرمایا:

اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ.

اے اللہ! بے شک تو معاف کرنے والا ہے اور پسند کرتا ہے معاف کرنے کو، پس معاف فرمادے مجھے بھی۔

فائدہ: نہایت جامع دعا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے لطف وکرم سے آخرت کے مطالبہ سے معاف فرمائیں تو اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے:

من نگویم کہ طاعتم بپذیر
قلم عفو بر گناہم کش

بعض احادیث میں شبِ قدر کی چند علامات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ ان میں سے یہ علامت کہ اس رات کے بعد جب صبح کو آفتاب نکلتا ہے تو بغیر شعاع کے نکلتا ہے، بہت سی روایات میں وارد ہوئی ہے اور ہمیشہ پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بعض علامات کا ذکر روایات میں آتا ہے مگر ان علامات کا پایا جانا لازمی نہیں ہے۔

بعض علامات ان حضرات کے کلام میں ذکر کی گئی ہیں جن کو اس رات کی دولت نصیب ہوئی ہے۔ ابنِ ابی لبابہ رضی اللہ عنہ اور ایوب بن خالد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس شب میں سمندر کا پانی بالکل میٹھا تھا۔ مشائخ نے لکھا ہے کہ شبِ قدر میں ہر چیز سجدہ کرتی ہے حتیٰ کی درخت زمین پر گر جاتے ہیں اور پھر اپنی جگہ کھڑے ہوجاتے ہیں مگر ایسی چیزوں کا تعلق امورِ کشفیہ سے ہے جو ہر شخص کو محسوس نہیں ہوتے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ عشرۂ اخیرہ کی طاق راتوں میں اور راتوں سے زیادہ عبادت میں مشغول رہیں، کوئی علامت نظر آئے یا نہ آئے اس کی فکر میں نہ پڑیں۔ روشنی وغیرہ علامات کشفی طور پر کسی کو نظر بھی آجاتی ہیں لیکن اگر کچھ بھی نظر نہ آوے پھر بھی اس رات کی عبادت کا اجر وثواب حاصل کرنے کی غرض سے جس قدر ہوسکے عبادت میں لگا رہے۔ اور مناسب ہے کہ جتنی دیر جاگنا چاہے اس کے تین حصے کرلے، ایک حصہ میں نوافل پڑھے اور ایک حصہ میں تلاوت کلام اللہ کے اندر مشغول رہے اور تیسرا حصہ استغفار، درود شریف، دعا وغیرہ ذکر اللہ میں گزار دے۔ ﴿اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَاَقِمِ

الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ؕ وَ لَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ ؕ [1] میں ان ہی تین عبادتوں نماز اور تلاوت کلام اللہ اور ذکر اللہ کو ایک جگہ جمع فرمادیا گیا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ العزیز نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا تو دریافت فرمایا کہ اب بزرگوں کی نسبت میں وہ کیفیت نہیں ہوتی جو پہلے بزرگوں کی نسبت میں ہوتی تھی اس کی کیا وجہ ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ پہلے بزرگ تین چیزوں کی پابندی فرماتے تھے: کثرتِ نوافل، کثرتِ تلاوت اور کثرتِ ذکر اللہ، اب اس زمانہ میں ذکر اللہ کی کثرت کا تو بزرگوں کو کچھ خیال ہے مگر تلاوت اور نوافل کی کثرت کا اہتمام کم ہوگیا ہے اِلَّا نادرًا، اس لیے نسبت مع اللہ کی کیفیت میں بھی فرق آگیا۔

واقعی اب جو لوگ اللہ والے کہلاتے ہیں ان کے یہاں بھی اکثر صرف کثرتِ ذکر کی ہی تعلیم کا اہتمام ہوتا ہے، نوافل وتلاوت کا خیال ہی نہیں رہا۔ گو ابتدائے سلوک میں سالک کے لیے ذکر اللہ کی کثرت زیادہ مفید اور یکسوئی پیدا کرنے کے اندر معین ہے، مگر اب تو صوفیائے زمانہ کو ذکر کی پابندی کرتے ہوئے تو کچھ دیکھا بھی جاتا ہے، اگرچہ اس میں بھی اب بہت کمی آتی جارہی ہے مگر آخری عمر تک تلاوت کلام اللہ کی پابندی اور نوافل کی کثرت کا تو کہیں نام ونشان بھی نہیں اِلا ما شاء اللہ، ہمارے اسلاف کا تو یہ طریقہ نہ تھا۔

فضیلتِ اعتکاف

رمضان کے عشرۂ اخیرہ میں ایک خاص عبادت اعتکاف بھی ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ مسجد میں اعتکاف کی نیت کرکے ٹھہر جائے اور بلا ضرورتِ شدیدہ مسجد سے نہ نکلے۔ اعتکاف پر جو ثواب کا وعدہ ہے وہ ہر حالت میں مل جائے گا خواہ مسجد میں سوتا ہی رہے۔ یہ کیسی عجیب عبادت ہے! اس کی عقلی وجہ یہ ہے کہ مسجد کی حقیقت دربارِ خداوندی اور آستانۂ شاہی کی ہے، اسی واسطے مسجدوں کے آداب میں ہے کہ بازاروں کی طرح ان میں آوازیں بلند نہ کی جائیں، طہارت اور صفائی کو لازم سمجھیں، تو اب اعتکاف کی حقیقت دربارِ خداوندی میں پڑا رہنا ہوا۔

---

[1] العنکبوت: ۴۵

اور ظاہر ہے کہ اگر کسی دنیا دار انسان کے دروازہ پر کوئی پڑا رہے تو وہ بھی آخر اس کو روٹی دے دیتا ہے کہ میرے دروازے پر پڑا ہوا ہے۔ حق تعالیٰ تو ارحم الراحمین ہیں وہ ایسے شخص پر کیوں نہ عنایت فرمائیں گے۔ خوب کہا گیا:

خسرو غریب است و گدا افتادہ در کوئے شما باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری۔

حدیث شریف میں اعتکاف کی ایک خاص فضیلت کا ذکر آیا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ معتکف گناہوں سے محفوظ رہتا ہے اور اس کے لیے نیکیاں اتنی ہی لکھی جاتی ہیں جتنی کہ کرنے والے کے لیے۔ پہلے جملہ کا مضمون تو ظاہر ہے کہ سب معاصی سے بچنے کا ثواب ملتا ہے، کیوں کہ واقع میں وہ سب معاصی سے بچا رہا۔ دوسرے جملے کا مطلب یہ ہے کہ بہت سے وہ نیک اعمال جن کو معتکف اعتکاف میں بیٹھنے کی وجہ سے نہیں کر سکتا، مثلاً مریض کی عیادت، جنازہ کی نماز میں شرکت وغیرہ، ایسے امور کا ثواب بھی اس کو بغیر کیے ہی ملتا رہے گا۔ اللہ اکبر! کس قدر رحمت اور فیاضی ہے کہ ان امور کا ثواب بغیر کیے صرف نیت ہی پر دے دیا جاتا ہے۔ اگر معتکف کو ان کا ثواب نہ ملتا تو شاید یہ حسرت ہوتی کہ اچھا اعتکاف کیا، ایک عبادت کے سبب بہت سے ثواب کے کاموں سے محروم رہ گئے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جو شخص ایک دن کا اعتکاف بھی اللہ کی رضا کے واسطے کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے اور جہنم کے درمیان تین خندقیں آڑ بنا دیتے ہیں جن کی مسافت آسمان اور زمین کی درمیانی مسافت سے بھی زیادہ چوڑی ہے۔

بہر حال معتکف کی مثال اس شخص کی سی ہے کہ کسی کے در پہ جا پڑے کہ اتنے میری درخواست قبول ہو ٹلنے کا نہیں:

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے
یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

اور اعتکاف کا مقصد اور اس کی روح اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے ساتھ خود کو وابستہ کر لینا ہے کہ سب سے ہٹ کر اور ساری مشغولیتوں کے بدلہ میں اسی کی ذات پاک سے مشغول ہو جائے اور اس کے غیر کی طرف سے منقطع ہو کر ایسی طرح اس میں لگ جائے کہ

خیالات تفکرات سب کی جگہ اس کی پاک فکر اور اس کی محبت سما جائے:

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھا رہوں تصورِ جاناں کیے ہوئے

اعتکاف کی خصوصیتیں بہت ہیں اس میں قلب کو دنیا و مافیہا سے یکسو کر لینا ہے اور نفس کو مولیٰ کے سپرد کر دینا اور آقا کی چوکھٹ پر پڑ جانا ہے:

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑا رہوں
سر زیر بار منت دربار کیے ہوئے

نیز اس میں ہر وقت عبادت کے اندر مشغولی رہتی ہے کہ آدمی سوتے جاگتے ہر وقت عبادات میں لگا ہوا شمار ہوتا ہے اور اس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تقرب بڑھتا رہتا ہے۔

مسائلِ اعتکاف

مسئلہ: رمضان المبارک کے اخیر عشرہ کا اعتکاف سنتِ مؤکدہ علی الکفایہ ہے۔ نبی کریم ﷺ کی عادتِ کریمہ ان ایام میں اعتکاف فرمانے کی تھی۔ اس لیے ہر بستی میں کم از کم ایک آدمی کو ضرور اعتکاف میں بیٹھنا چاہیے۔ ورنہ تمام اہلِ بستی کو سنتِ مؤکدہ کے ترک کرنے کا گناہ ہوگا۔

مسئلہ: رمضان شریف کے آخری عشرہ کا اعتکاف کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ بیسویں تاریخ کے سورج غروب ہونے سے پہلے ایسی مسجد میں اعتکاف کی نیت سے داخل ہو جائے جس میں جماعتِ پنجگانہ ہوتی ہو اور عید کا چاند نظر آنے تک وہاں ہی رہے۔ عید کا چاند نظر آنے پر غروب کے بعد اعتکاف ختم ہو جاتا ہے۔

گھر میں جو جگہ نماز کے لیے پہلے سے مقرر ہو عورت اس میں اعتکاف کے لیے بیٹھ سکتی ہے اگر پہلے سے کوئی ایسی جگہ مقرر نہ ہو تو گھر میں ایک جگہ مقرر کر کے بہ نیت اعتکاف اس میں بیٹھ جائے۔ بلا ضرورت اس سے باہر نہ نکلے۔ اور عورت کا حیض و نفاس سے پاک ہونا اعتکاف کے لیے شرط ہے۔

مسئلہ: معتکف کے واسطے ضرورتِ طبعی پیشاب پاخانہ وغیرہ اور شرعی ضرورت، مثلاً: اذان

دینے اور نمازِ جمعہ وغیرہ ادا کرنے کے لیے اعتکاف کی مسجد سے باہر نکلنا درست ہے:

(وحرّم عليه) أي على المعتكف اعتكافاً واجباً ..... (الخروج إلا لحاجة الإنسان) طبيعية كبول وغائط وغسل لو احتلم ولا يمكنه الاغتسال في المسجد (أو) شرعية كعيد وأذان ..... (الجمعة وقت الزوال).[1]

مگر جمعہ کی نماز سے اس قدر پہلے جائے کہ جامع مسجد میں پہنچ کر تحیۃ المسجد اور جمعہ کی سنت پڑھنے کے بعد خطبہ سن سکے۔ زیادہ دیر پہلے نہ جائے لیکن وقت کے اندازہ کرنے میں اگر غلطی ہوجائے تو معاف ہے۔ اور جمعہ کے بعد کی سنتیں بھی جامع مسجد میں ٹھہر کر دوسری مسجد کے معتکف کے لیے پڑھنا جائز ہے:

(ومن بَعُد منزله) أي معتكفه (خرج في وقت يدركها) مع سنتها أي مع الخطبة ..... لا شك أن صلاة التحية بالاستقلال أفضل من الإتيان بها في ضمن الفريضة، يحكم في ذلك رأيه ويستن بعدها أربعًا أو ستًا على الخلاف.[2]

فائدہ: اعتکاف سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اس میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا خوب موقع میسّر آتا ہے۔ اس لیے معتکف ہر وقت انتظارِ صلوٰۃ کی وجہ سے نماز میں ہی شمار ہوتا ہے، کیوں کہ انتظارِ صلوٰۃ بحکمِ صلوٰۃ ہے۔ اور اسی وجہ سے معتکف کے لیے ضروری ہے کہ اعتکاف ایسی مسجد میں کرے جس میں نمازِ پنجگانہ کی جماعت کا انتظام ہو۔

تنبیہ: اذانِ جمعہ سے قبل جو آج کل وعظ کہنے کا رواج ہے دوسری مسجد کے معتکف کو اس کے سننے کے لیے جامع مسجد میں نہ جانا چاہیے۔ ہاں اگر تحیۃ المسجد اور جمعہ کی سنت پڑھنے کے بعد جماعت کے قیام میں اندازہ سے زیادہ دیر لگ گئی تو ایسے وقت اگر جماعت کے انتظار کی حالت میں وعظ بھی سنتا رہا ہے تو کچھ حرج نہیں۔

مسئلہ: جو لوگ دیہات سے جمعہ پڑھنے کے لیے قصبات کے اندر آیا کرتے ہیں اگر وہ اپنے

---

[1] درمختار، شامی: ۱۸۱/۱ [2] شامی: ۱۸۱/۱

گاؤں میں اعتکاف کریں اعتکاف میں بیٹھنے کے بعد وہ اپنے ہی گاؤں میں ظہر کی نماز باجماعت ادا کریں۔ اگر جماعت نہ ہوسکے تو بغیر جماعت کے ہی ادا کرلیں۔ مگر حالتِ اعتکاف میں دوسرے شہر میں جمعہ ادا کرنے کے لیے نہ جائیں۔

مسئلہ: ضرورتِ طبعی اور شرعی کے بغیر مسجدِ اعتکاف سے تھوڑی دیر کے لیے باہر نکلنا بھی اعتکاف کو توڑ دیتا ہے۔ چاہے یہ نکلنا بھول کر ہی ہو۔ اعتکاف میں بھول معاف نہیں ہے۔

مسئلہ: اعتکاف کی حالت میں غسلِ جنابت (فرض غسل) کے لیے تو مسجد سے باہر جانا جائز ہے، جب کہ مسجد کے اندر غسل کرنا ممکن نہ ہو اسی طرح اگر کوئی ایسی جگہ نہ ہو کہ مسجد میں بیٹھ کر وضو کرسکے اور مسجد کا فرش غسالۂ وضو سے ملوث نہ ہو تو وضو کے لیے بھی مسجد سے باہر جانا جائز ہے۔ مگر گرمی کی وجہ سے مسجد سے باہر جا کر غسل کرنا جائز نہیں ہے۔ اس سے اعتکاف نہیں رہے گا۔

مسئلہ: حالتِ اعتکاف میں خاموش رہنے کو عبادت سمجھنا مکروہ تحریمی ہے:

(و) يكره تحريمًا (صمت) إن اعتقده قربة وإلّا لا.[1]

البتہ فضول باتیں نہ کرے، تلاوت کلام اللہ یا اور کسی عبادت میں مشغول رہے۔ ضرورت کے موافق دنیوی مباح کلام کی بھی اجازت ہے۔ "درمختار" میں ہے:

ولا تكلم إلا بخير وهو ما لا إثم فيه، ومنه المباح عند الحاجة.[2]

مسئلہ: معتکف کو کھانا پینا اور سونا مسجد کے اندر جائز ہے اور اگر اپنے یا عیال کے لیے کسی چیز کے خریدنے کی ضرورت ہو تو اس کا خریدنا بھی معتکف کے لیے مسجد کے اندر جائز ہے۔ بشرطے کہ وہ چیز مسجد سے باہر ہو اور تجارت کے لیے نہ خریدتا ہو۔ "درمختار" میں ہے:

وخص المعتكف بأكل وشرب ونوم وعقد احتاج إليه لنفسه أو عياله فلو لتجارة كره أي تحريمًا؛ لأنها محل إطلاقيهم. "بحر".

إحضار مبيع فيه كما كره فيه مبايعة غير المعتكف مطلقًا للنهي، وكذا

[1] شامی: ۱۸۵/۲ [2] شامی: ۱۸۵/۲

أكله ونومه إلا لغريب. "أشباه". [1]

معتکف اور مسافر کے علاوہ دوسرے شخص کے لیے مسجد کے اندر کھانا پینا اور سونا مکروہ ہے۔ اسی طرح خرید وفروخت کرنا منع ہے۔ اس کی دلیل اوپر کی عبارت میں موجود ہے۔ البتہ عقدِ نکاح مسجد کے اندر مستحب ہے۔

صرح في "الأشباه" وغيره بأنه يستحب عقد النكاح في المسجد. [2]

اگر مسجد میں کھانے پینے کی ضرورت پیش آجائے تو چاہیے کہ اعتکاف کی نیت سے مسجد میں داخل ہو کر اول ذکر اللہ یا نماز میں مشغول ہو پھر بعد میں اپنی ضرورت پوری کرلے۔

علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

وإذا أراد ذلك ينبغي أن ينوي الاعتكاف فيدخل ويذكر الله تعالىٰ بقدر ما نوى، أو يصلي ثم يفعل ما شاء. [3]

اس جگہ وہ حضرات بھی غور فرمائیں جو افطاری کے وقت اعتکاف کی نیت کے بغیر ہی مسجد کے اندر کھانے پینے میں مشغول ہو جاتے ہیں اور صرف افطار کرنے پر اکتفا نہیں کرتے۔

فائدہ: جب نماز پڑھنے مسجد میں جایا کریں تو بھی اعتکاف کی نیت کرلیا کریں۔ اس طرح مسجد میں نماز پڑھنے کے علاوہ اعتکاف کا ثواب بھی مل جاتا ہے۔ یہ ایک مفت کی عبادت ہے جس سے لوگ غافل ہیں اور چوں کہ یہ اعتکاف مستحب ہے اس میں ایسے شرائط نہیں ہیں جیسے اعتکافِ نذر اور اعتکافِ سنتِ مؤکدہ میں ہوتے ہیں، اس کے لیے وقت کی مقدار بھی معیّن نہیں ہے، ایک منٹ کے لیے بھی ہوسکتا ہے۔

مسئلہ: معتکف کے لیے بھی غیر معتکف کی طرح اصح یہی ہے کہ مسجد کے اندر ریح کا اخراج نہ کرے۔

لا يخرج فيه الريح من الدبر، كما في "الأشباه". واختلف فيه السلف فقيل: لا بأس. وقيل: يخرج إذا احتاج إليه، وهو الأصح. [4]

لیکن بوجہ حرج کے اگر غیر اصح قول پر عمل کرلیا جائے تو بھی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

---

[1] ۱۸۴/۲ [2] شامی: ۴۱۹/۱ [3] فتاویٰ ہندیہ، شامی: ۴۱۹/۱ [4] شامی: ۶۱۵/۱

باقی مسائلِ اعتکاف نیز صوم وغیرہ کے "بہشتی زیور" وغیرہ کتب سے معلوم ہوسکتے ہیں۔ تفصیلی مسائل کی اس مختصر رسالہ میں گنجایش نہیں ہے۔

اب دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ماہِ رمضان المبارک کے اعمال فاضلہ کی توفیق بخشے اور روزہ تلاوتِ قرآن کریم، لیلۃ القدر، تراویح اور اعتکاف وغیرہ جملہ عبادات کے حقوق ادا کرنے کی توفیق مرحمت فرماویں۔ اور خاص طور پر قرآن مجید کی تلاوت اور اس کے آداب کی رعایت نیز مساجد کا احترام کرنا ہم سب کے لیے آسان فرماویں۔ آمین

بحرمة سيد المرسلين وآله الطاهرين وأصحابه أجمعين.

مسئلۂ انجکشن درحالتِ صوم

اب ایک مسئلہ روزہ کی حالت میں انجکشن لگانے کی تحقیق لکھ کر اس رسالہ کو ختم کیا جاتا ہے۔ عام طور پر اس مسئلہ میں اہلِ علم نے بھی غور نہیں فرمایا اور بعض اہلِ علم نے تو انجکشن سے روزہ کے فاسد ہوجانے کا فتویٰ دے دیا اور اس کی وجہ یہ لکھی کہ:

۱۔ ٹیکہ سے غذا وغیرہ جو کھانے پینے سے حاصل ہوتی ہے وہی حاصل ہوسکتی ہے۔

۲۔ ٹیکہ سے زبان پر ذائقہ آجاتا ہے۔

۳۔ احتقان پر اور سعوط پر اس کا قیاس بہت قریب ہے۔

لیکن تحقیق یہ ہے کہ انجکشن سے روزہ نہیں ٹوٹتا اور جتنے دلائل اوپر پیش کیے گئے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انجکشن کے ذریعہ جو دوا وغیرہ بدن میں پہنچائی جاتی ہے تو وہ جوف عروق (رگوں کے اندر) میں پہنچتی ہے اور خون کے ذریعے شرائیں یا اوردہ میں اس کا سریان ہوتا ہے۔ تو جس جس جگہ خون کا دوران ہوگا صرف ان ہی جگہ میں خون کے ساتھ دوا بھی پہنچے گی۔ اور عروق میں کوئی منفذ (راستہ) نہیں جس سے ہوکر دوا وغیرہ معدہ میں پہنچ جائے، البتہ مسامات کے ذریعہ چھن کر دوا کا اثر معدہ میں پہنچتا ہے، لیکن فسادِ صوم کے لیے دوا و غذا کا جوف معدہ میں بذریعۂ منفذ کے پہنچنا شرط ہے، مسامات کے ذریعہ بدن میں پہنچنا مفسدِ صوم نہیں، کیوں کہ مسامات کے ذریعے دوا کا اثر ہی پہنچتا ہے جوہر نہیں پہنچتا۔ اور اگر

جوہر کا پہنچنا ثابت ہو تو بھی مفسد نہیں، کیوں کہ بذریعۂ منفذ نہیں پہنچا۔ اسی لیے فقہا نے ہر زخم پر دوا کے ڈالنے کو مفسدِ صوم نہیں کہا بلکہ جائفہ اور آمہ کی قید لگائی ہے، کیوں کہ ان ہی دو قسم کے زخموں کے ذریعہ دوا جوفِ بطن اور جوفِ دماغ میں پہنچتی ہے۔ اگر جوفِ عروق میں دوا کا پہنچنا مفسدِ صوم ہوتا تو جوفِ عروق کے اندر تو جائفہ اور آمہ کے علاوہ دوسری قسم کے زخموں سے بھی دوا پہنچ جاتی ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ "درمختار" میں ہے:

(أو داوى جائفة أو آمة) فوصل الدواء حقيقة إلى جوفه ودماغه.

اس پر علامہ شامی رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

أشار إلى أن ما وقع في ظاهر الرواية من تقييد الإفساد بالدواء الرطب مبني على العادة من أنه يصل، وإلا فالمعتبر حقيقة الوصول حتى لو علم وصول اليابس أفسد، أو عدم وصول الطري لم يفسد. وإنما الخلاف إذا لم يعلم يقينًا، فأفسد بالطري حكمًا بالوصول نظرًا إلى العادة، ونفياه. كذا أفاده في "الفتح".[1]

اور جوفِ دماغ میں دوا کے پہنچنے کے بعد بذریعۂ منفذ اس کا جوفِ معدہ میں پہنچ جانا عادتِ اکثر یہ ہے:

قال في "البحر": والتحقيق بين جوف الرأس وجوف المعدة منفذًا أصليًا، فما وصل إلى جوف الرأس يصل إلى جوف البطن.[2]

حاصل یہ کہ فسادِ صوم کا اصل مدار جوفِ معدہ میں کسی غذا و دوا کے پہنچنے پر ہے۔ اسی وجہ سے حقنہ اور قطور (کان میں دوا ڈالنا) اور سعوط (ناک میں دوا ڈالنا) کو بھی مفسدِ صوم تبعاً لجوف المعدہ کہا گیا ہے، کیوں کہ ان کے ذریعے دوا جوفِ معدہ میں پہنچ جاتی ہے۔ "شامی" میں ہے:

قلت: ولم يقيدوا الاحتقان والاستعاط والإقطار بالوصول إلى الجوف لظهوره فيها، وإلا فلا بد منه حتى لو بقي السعوط في الأنف ولم يصل

[1] ۲/۴۰۲ [2] ۲/۴۰۲

جوہر کا پہنچنا ثابت ہوتو بھی مفسد نہیں، کیوں کہ بذریعۂ منفذ نہیں پہنچا۔ اسی لیے فقہا نے ہر زخم پر دوا کے ڈالنے کو مفسدِ صوم نہیں کہا بلکہ جائفہ اور آمہ کی قید لگائی ہے، کیوں کہ ان ہی دو قسم کے زخموں کے ذریعہ دوا جوفِ بطن اور جوفِ دماغ میں پہنچتی ہے۔ اگر جوفِ عروق میں دوا کا پہنچنا مفسدِ صوم ہوتا تو جوفِ عروق کے اندر تو جائفہ اور آمہ کے علاوہ دوسری قسم کے زخموں سے بھی دوا پہنچ جاتی ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ ''درمختار'' میں ہے:

(أو داوى جائفة أو آمة) فوصل الدواء حقيقة إلى جوفه ودماغه.

اس پر علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

أشار إلى أن ما وقع في ظاهر الرواية من تقييد الإفساد بالدواء الرطب مبني على العادة من أنه يصل، وإلا فالمعتبر حقيقة الوصول حتى لو علم وصول اليابس أفسد، أو عدم وصول الطري لم يفسد. وإنما الخلاف إذا لم يعلم يقيناً، فأفسد بالطري حكمًا بالوصول نظرًا إلى العادة، ونفياه. كذا أفاده في "الفتح".[1]

اور جوفِ دماغ میں دوا کے پہنچنے کے بعد بذریعۂ منفذ اس کا جوفِ معدہ میں پہنچ جانا عادتِ اکثریہ ہے:

قال في "البحر": والتحقيق بين جوف الرأس وجوف المعدة منفذًا أصليًا، فما وصل إلى جوف الرأس يصل إلى جوف البطن.[2]

حاصل یہ کہ فسادِ صوم کا اصل مدار جوفِ معدہ میں کسی غذا و دوا کے پہنچنے پر ہے۔ اسی وجہ سے حقنہ اور قطور (کان میں دوا ڈالنا) اور سعوط (ناک میں دوا ڈالنا) کو بھی مفسدِ صوم تبعاً لجوف المعدہ کہا گیا ہے، کیوں کہ ان کے ذریعے دوا جوفِ معدہ میں پہنچ جاتی ہے۔ ''شامی'' میں ہے:

قلت: ولم يقيدوا الاحتقان والاستعاط والإقطار بالوصول إلى الجوف لظهوره فيها، وإلا فلا بد منه حتى لو بقي السعوط في الأنف ولم يصل

[1] ۱۳۰/۲

[2] ۱۳۰/۲

جو ہر کا پہنچنا ثابت ہو تو بھی مفسد نہیں، کیوں کہ بذریعۂ منفذ نہیں پہنچا۔ اسی لیے فقہا نے ہر زخم پر دوا کے ڈالنے کو مفسدِ صوم نہیں کہا بلکہ جائفہ اور آمہ کی قید لگائی ہے، کیوں کہ ان ہی دو قسم کے زخموں کے ذریعہ دوا جوفِ بطن اور جوفِ دماغ میں پہنچتی ہے۔ اگر جوفِ عروق میں دوا کا پہنچنا مفسدِ صوم ہوتا تو جوفِ عروق کے اندر تو جائفہ اور آمہ کے علاوہ دوسری قسم کے زخموں سے بھی دوا پہنچ جاتی ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ ''درمختار'' میں ہے:

(أو داوى جائفة أو آمة) فوصل الدواء حقيقة إلى جوفه ودماغه.

اس پر علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

أشار إلى أن ما وقع في ظاهر الرواية من تقييد الإفساد بالدواء الرطب مبني على العادة من أنه يصل، وإلا فالمعتبر حقيقة الوصول حتى لو علم وصول اليابس أفسد، أو عدم وصول الطري لم يفسد. وإنما الخلاف إذا لم يعلم يقينًا، فأفسد بالطري حكمًا بالوصول نظرًا إلى العادة، ونفياه. كذا أفاده في "الفتح".[1]

اور جوفِ دماغ میں دوا کے پہنچنے کے بعد بذریعۂ منفذ اس کا جوفِ معدہ میں پہنچ جانا عادتِ اکثریہ ہے:

قال في "البحر": والتحقيق بين جوف الرأس وجوف المعدة منفذًا أصليًا، فما وصل إلى جوف الرأس يصل إلى جوف البطن.[2]

حاصل یہ کہ فسادِ صوم کا اصل مدار جوفِ معدہ میں کسی غذا و دوا کے پہنچنے پر ہے۔ اسی وجہ سے حقنہ اور قطور (کان میں دوا ڈالنا) اور سعوط (ناک میں دوا ڈالنا) کو بھی مفسدِ صوم تبعاً لجوف المعدہ کہا گیا ہے، کیوں کہ ان کے ذریعے دوا جوفِ معدہ میں پہنچ جاتی ہے۔ ''شامی'' میں ہے:

قلت: ولم يقيدوا الاحتقان والاستعاط والإقطار بالوصول إلى الجوف لظهوره فيها، وإلا فلا بد منه حتى لو بقي السعوط في الأنف ولم يصل

---

[1] ۱۳۰/۲ [2] ۱۳۰/۲

إلى الرأس لا يفطر. ويمكن أن يكون الدواء راجعًا إلى الكل. تأمل.[1]

اور ''بدائع'' میں ہے:

وما وصل إلى الجوف أو إلى الدماغ من المخارق الأصلية كالأنف والأذن والدبر بأن استعط أو احتقن أو أقطر في أذنه فوصل إلى الجوف أو إلى الدماغ فسد صومه. أما إذا وصل إلى الجوف فلا شك فيه لوجود الأكل من حيث الصورة، وكذا إذا وصل إلى الدماغ؛ لأنه له منفذ إلى الجوف فكان بمنزلة زاوية من زوايا الجوف.

وأما ما وصل إلى الجوف أو إلى الدماغ من غير المخارق الأصلية بأن داوى الجائفة والآمة فإن داواها بدواء يابس لا يفسد؛ لأنه لم يصل إلى الجوف ولا إلى الدماغ، ولو علم أنه وصل يفسد.[2]

جب حقنہ اور سعوط میں دوا معدہ کے اندر بذریعہ منفذ پہنچتی ہے اور اسی پر افطار کا مدار ہے تو اب انجکشن کا حقنہ اور سعوط پر قیاس قیاس مع الفارق ہے، کیوں کہ انجکشن کے ذریعے دوا معدہ میں بواسطہ منفذ کے نہیں پہنچتی۔ اور اگر کسی انجکشن کے بعد اس کا ذائقہ زبان پر آجاتا ہے تو وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کبھی سرمہ وغیرہ کے آنکھ میں لگانے کے بعد اس کا اثر حلق میں آجاتا ہے۔ مگر یہ اثر مسامات کے ذریعے آتا ہے۔ آنکھ اور حلق کے درمیان میں کوئی منفذ نہیں ہے۔ اور مسامات کے ذریعہ کسی چیز کا صرف اثر ہی پہنچ سکتا ہے جوہر شے نہیں پہنچ سکتا اور مفسد صوم جوہر شے کا بذریعہ منفذ پہنچنا ہے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

(قوله: وإن وجد طعمه في حلقه) أي طعم الكحل أو الدهن. كما في "السراج". وكذا لو بزق فوجد لونه في الأصح. "بحر". قال في "النهر": لأن الموجود في حلقه أثر داخل من المسام الذي هو خلل البدن، والمفطر إنما هو الداخل من المنافذ للاتفاق على أن من

---

[1] ۱۳۰/۲ [2] امداد الفتاوی: ۱۳۱/۲

اغتسل في ماء فوجد برده في باطنه أنه لا يفطر.[۱]

اور "ہدایہ" میں ہے:

لأنه ليس بين العين والدماغ منفذ، والدمع يترشح كالعرق، والداخل من المسام لا ينافي، كما لو اغتسل بالماء البارد.[۲]

اور اس کے حاشیہ میں ہے:

لأنه ليس بين العين والدماغ منفذ فما وجد إنما هو أثره لا عينه.[۳]

اس جگہ اس مسئلہ پر بھی تنبیہ کرنا ضروری معلوم ہوا جو بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ روزہ کی حالت میں آنکھ کے اندر تر دوا کے ڈالنے کو منع سمجھتے ہیں، یہ غلط ہے۔ آنکھ میں تر یا خشک کسی قسم کی دوا روزہ کے لیے مفسد نہیں۔ کیوں کہ آنکھ میں دوا ڈالنے سے دماغ میں نہیں پہنچتی۔ اس لیے کہ حسبِ تصریحاتِ فقہا آنکھ اور دماغ کے درمیان کوئی منفذ نہیں ہے۔

والله عالم، وعلمه أتم وأحكم.

وههنا تمت الرسالة. والحمد لله الهادي في كل مقالة، العاصم من كل غواية وضلالة في البداية والنهاية، وصلى الله تعالىٰ علىٰ أفضل المخلوقات سيّدنا ومولانا محمد سيّد الكائنات وأكرم الموجودات، وعلىٰ آله وأصحابه صلاةً تسبق الغايات، على يد الأحقر الأفقر إلى الله الغني المدعو بـ عبد الشكور الترمذي عفي عنه ذنبه الجلي والخفي.

وهذا العبد الضعيف ليس في تحرير هذه العجالة وتسويد هذه الرسالة إلا كالقلم بين أصبعين والمتحرك على أثر عين، وهي من إفاضات العلامة الفهامة وبركات حبر الشريعة وخضر الطريقة شيخنا الفاضل المحدث الكبير والفقيه الخبير الجامع للعلم المعقول والمنقول مولانا ظفر أحمد العثماني التهانوي، لا زالت شموس فيوضهم بازغة وبدور

---

۱ ۱۳۳۲/۲ ۲ الہدایۃ: ۱/۱۹۷ ۳ حاشیۃ: ۱/۱۹۷

إقبالهم طالعة، ولا زلنا منغمسا في بحار لطفهم ومقتبسًا من أنوار فيوضاتهم، متعنا الله تعالى بطول بقائه ودوام حياته. في يوم الاثنين سبعة وعشرين من شهر رجب المرجب سنة خمس وثمانين بعد ثلاث مائة وألف من الهجرة النبوية، على صاحبها ألف ألف سلام وتحية.

عیدالفطر اور صدقۃ الفطر

جاننا چاہیے کہ اسلام نے سال بھر میں عید کے صرف دو دن مقرر کیے ہیں۔ ایک عیدالفطر کا دن اور دوسرا عیدالاضحیٰ کا، اور ان دونوں عیدوں کو ایسی اجتماعی عبادات کا صلہ قرار دیا ہے جو ہر سال انجام پاتی ہیں۔ اس لیے ان عبادات کے بعد ہر سال یہ عید کے دن بھی آتے رہتے ہیں۔

عیدالفطر تو رمضان المبارک کی عباداتِ فاضلہ صوم وصلوٰۃ وغیرہ کی انجام دہی کے لیے توفیقِ الٰہی کے عطا ہونے پر اظہارِ تشکر ومسرت کے طور پر منائی جاتی ہے اور عیدالاضحیٰ اس وقت منائی جاتی ہے جب کہ مسلمانانِ عالمِ اسلام کی ایک عظیم الشان اجتماعی عبادت یعنی حج کی تکمیل کر رہے ہوتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ عبادات کے اختتام اور انجام پانے کی خوشی کوئی دنیوی خوشی نہیں ہے جس کا اظہار دنیاوی رسم ورواج کے مطابق کرلیا جاتا ہے، یہ ایک دینی خوشی ہے اور اس کے اظہار کا طریقہ بھی دینی ہی ہونا چاہیے۔ اس لیے ان دونوں عیدوں میں اظہارِ مسرت اور خوشی منانے کا اسلامی طریقہ یہ قرار پایا کہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدۂ شکر بجا لایا جائے اور بطورِ شکر کے عید الفطر کے دن صدقۂ فطر ادا کیا جائے اور عیدالاضحیٰ میں بارگاہِ خداوندی میں قربانی پیش کی جائے اور اپنے خالق کی کبریائی اور عظمت وتوحید کے گیت گاتے ہوئے عیدگاہ میں جمع ہوکر اجتماعی طور پر سجدہ ریز ہوجائے، اور اس طرح اپنے مالک کی توفیق وعنایات کا شکر ادا کیا جائے۔ اس اسلامی طریقہ پر عید منانے کا طبعی اثر یہ ہونا چاہیے کہ مسلمان اپنی مسرت وخوشی کے اظہار میں بے لگام ہوکر نفسانی خواہشات کے تابع پڑنے سے باز رہے۔ اور دوسری قوموں کی طرح اس دن میں عیش ونشاط کی محفلیں آراستہ کرنے اور لذت وسرور میں بدمست ہوکر خدا فراموشی سے پرہیز واجتناب کرے۔

مقصد یہ ہے کہ عید کا دن مسلمانوں کے لیے ہنود و یہود اور عیسائیوں وغیرہ اقوامِ عالم کے قومی تہواروں کی طرح کا کوئی تہوار نہیں ہے اور نہ ایک دفعہ پیش آنے والے کسی تاریخی واقعہ کی یادگار کے طور پر ہر سال یہ دن منایا جاتا ہے۔ جیسا کہ عموماً دوسری قوموں کے تہوار ایسے ہی واقعاتِ تاریخیہ کی یادگار ہوتے ہیں، بلکہ یہ دن مسلمانوں کی عبادت کا ہے اور اس کو منانے کے لیے خاص شان وصفت کی عبادت نماز کو مقرر کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ جو مسلمان اس دن میں عمدہ لباس پہنتا اور ظاہری زیبائش وآرائش کرتا ہے اس کا مقصد اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کے ساتھ عیدگاہ میں پہنچ کر شکرانہ کے طور پر عبادت کا ادا کرنا ہی ہوتا ہے اور اس کی اس ساری زینت وآرائش کی غرض بھی ایک عبادت کی تکمیل اور اس کو عمدہ طریقہ پر ادا کرنا ہی ہوتا ہے۔

افسوس کہ ہم دوسری قوموں کی نقالی میں آکر رفتہ رفتہ عید کے اس اسلامی تصور اور اس کے حقیقی مقصد کو فراموش کرتے جارہے ہیں اور دوسروں کی دیکھا دیکھی ہم نے بھی عید کو ایک قومی تہوار اور محض کھیل تماشہ اور تھیٹر، سینما بینی کا دن سمجھ لیا ہے۔ اس لیے ہم بھی اس کو اپنی مرضی اور خواہشات کے مطابق منانے لگے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض جگہ تو عبادت کے لیے عید گاہ میں جاتے ہوئے اور واپسی میں ڈھول وغیرہ لے جاتے ہیں اور اس کو اظہارِ خوشی کا جائز طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ حالاں کہ یہ طریقہ بالکل غیر اسلامی اور روح عبادت کے خلاف ہے۔ دوسری قوموں کے تہواروں اور رسومات میں تو ایسے طریقے ہوتے ہیں مگر جس اسلامی عید کے منانے کا حکم سرورِ عالم ﷺ نے دیا ہے، اس عید میں کھیل تماشہ اور ڈھول تماشہ کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ بلکہ فکر سے کام لیا جائے تو عید کے اس اسلامی جشن مسرت میں تو قدم قدم پر احساس دلایا جاتا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اور اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرنے کا ہم کو کوئی اختیار نہیں ہے۔ عید کے دن سنت کے مطابق غسل کرنا، عمدہ لباس پہننا اور عیدگاہ کے راستہ میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور بڑائی کا اعلان اَللّٰہُ اَکْبَرُ اِلخ کے ذریعے کرتے جانا اور پھر دوگانہ نماز میں عام نمازوں سے چھ مرتبہ زیادہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ سے اللہ کی بڑائی کا اقرار کرنا، اظہارِ خوشی کے اس اسلامی طریقہ پر عمل کرنے کے بعد کیا کسی ہوش مند انسان کے لیے

یہ بات رہ جاتی ہے کہ وہ عیش ونشاط اور کھیل تماشہ کی مجلسوں میں شریک ہو اور خدا فراموشی کا مظاہرہ کرے؟

غرضے کہ شریعتِ اسلامیہ نے ان دونوں عیدوں کو عبادت کے طور پر مقرر فرمایا ہے اور ان میں اظہارِ خوشی کا طریقہ بھی عبادات کی صورت میں ہی مقرر کیا گیا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو عیدین کے متعلق ان کے خاص خاص احکامات وہدایات کے معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں فقہ کی معتبر کتابوں سے عیدین کے ضروری احکام کو اسی غرض سے پیش کیا جارہا ہے تاکہ ان دونوں عیدوں کے منانے کا اسلامی طریقہ معلوم کرکے مسلمان اس پر عمل پیرا ہوں اور ثوابِ آخرت کے مستحق قرار پائیں۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عنایت فرماویں۔ فقط

عیدین کے احکام

۱۔ دونوں عیدوں کی شب میں زیادہ عبادت کرنا مستحب ہے اور دونوں عیدوں کے دن میں روزہ رکھنا حرام ہے۔

۲۔ دونوں عیدوں کے دن نماز کی دو رکعتوں کا بطورِ شکریہ کے ادا کرنا واجب ہے۔

۳۔ اگر عید جمعہ کے دن ہو تو جمعہ اور عید دونوں کی نمازیں پڑھی جائیں گی۔

۴۔ جمعہ کی نماز کے صحیح اور واجب ہونے کے لیے جو جو شرطیں فقہِ حنفی کی کتابوں میں لکھی ہیں وہی سب شرطیں دونوں عیدوں کی نماز کے لیے بھی ضروری ہیں۔ البتہ نمازِ جمعہ سے پہلے تو خطبہ کا پڑھنا فرض اور شرط ہے اور عید کی نماز کے بعد خطبہ سنت ہے لیکن سننا اس خطبہ کا بھی جمعہ کے خطبہ کی طرح واجب ہے۔ خطبہ کے وقت کلام وغیرہ سب حرام ہے۔[1]

فائدہ: خطبہ میں خاموش بیٹھے رہنا واجب ہے جو لوگ شوروغل مچاتے ہیں وہ گناہ گار ہوتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ خطبہ چھوڑ کر چل دیتے ہیں وہ بھی برا کرتے ہیں اور بعض بیٹھنے والے بھی صف کا خیال نہیں رکھتے۔ حالاں کہ صف باندھے رہنا چاہیے۔[2]

۵۔ جمعہ کی نماز کی طرح عید کی نماز کے صحیح ہونے کے لیے بھی شہر وقصبہ یا ایسے بڑے

[1] درمختار [2] إفادة العوام ترجمہ خطبات الأحكام

گاؤں کا ہونا شرط ہے جس میں کثرت سے دکانیں ہوں اور اس کی آبادی قصبہ کے برابر ہو۔[۱] مثلاً اس کی آبادی چھوٹے بڑے مرد و عورت سب کا شمار تین ہزار نفوس تک پہنچ جاتا ہے۔[۲]

فائدہ: جو گاؤں اتنا بڑا نہ ہو کہ اس میں جمعہ یا عید کی نماز درست نہیں، تو اس لیے اس میں نماز ظہر ادا کرنا لازم ہے اور چوں کہ ایسے گاؤں میں یہ نفلی نماز ہوگی اور نفلی نماز کا اہتمام کے ساتھ باجماعت ادا کرنا مکروہِ تحریمی ہے اور دن کی نماز میں بلند آواز سے قراءت کا کرنا بھی مکروہِ تحریمی ہے۔ اس وجہ سے ایسے گاؤں میں جمعہ یا عید کی نماز پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے۔[۳]

عید کی سنتیں

عید کے دن تیرہ چیزیں سنت ہیں:

۱۔ شرع کے موافق اپنی آرائش کرنا۔

۲۔ غسل کرنا۔

۳۔ مسواک کرنا۔

۴۔ حسبِ طاقت عمدہ کپڑے پہننا۔

۵۔ خوش بو لگانا۔

۶۔ صبح کو بہت جلد اُٹھنا۔

۷۔ عید گاہ میں بہت جلد جانا۔

۸۔ عید الفطر میں صبح صادق کے بعد عید گاہ میں جانے سے پہلے کوئی میٹھی چیز کھانا اور عید الاضحیٰ میں نماز عید کے بعد اپنی قربانی کے گوشت میں سے کھانا مستحب ہے۔

۹۔ عید الفطر میں عید گاہ جانے سے پہلے صدقۂ فطر ادا کرنا۔

۱۰۔ عید کی نماز عید گاہ میں پڑھنا بغیر عذر شہر کی مسجد میں نہ پڑھنا۔

۱۱۔ ایک راستہ سے عید گاہ میں جانا اور دوسرے راستہ سے واپس آنا۔

---

[۱] در مختار و شامی [۲] بہشتی گوہر [۳] در مختار

۱۲۔ عیدگاہ جاتے ہوئے راستہ میں اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ عیدالفطر میں آہستہ آہستہ کہتے ہوئے جانا اور عیدالاضحیٰ میں بلند آواز سے کہنا۔

۱۳۔ سواری کے بغیر پیدل عیدگاہ میں جانا۔[1]

فائدہ: مستحب یہ ہے کہ وہ میٹھی چیز چھوارے ہوں اور ان کا عدد طاق ہو۔

فائدہ: عام طور پر عیدالفطر کی صبح کو بھی سحری کے وقت صبح صادق کے بعد کھائے۔[2]

فائدہ: نمازِ عیدالاضحیٰ سے پہلے نہ کھانا سب کے لیے مستحب ہے، خواہ قربانی کرے یا نہ کرے اور اگر نماز سے پہلے کھالیا تو بھی کچھ گناہ نہیں۔[3]

تنبیہ: اس کو روزہ سمجھنا غلط ہے۔ جیسا کہ اکثر عوام میں مشہور ہوگیا ہے۔

عیدین کی نماز کے احکام

۱۔ عیدین کی نماز کا وقت بقدر ایک نیزہ آفتاب بلند ہونے کے بعد (جس کا اندازہ پندرہ بیس منٹ ہے) اشراق کی نماز کے وقت کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے اور زوال یعنی سورج کے ڈھلنے تک رہتا ہے۔[4] مگر عیدالفطر کی نماز کو دیر کرکے پڑھنا تاکہ نماز سے پہلے صدقۂ فطر ادا کیا جا سکے اور عیدالاضحیٰ کو جلدی پڑھنا تاکہ نماز کے بعد قربانی جلدی ہو سکے مستحب ہے۔[5]

۲۔ نمازِ عید سے پہلے اس روز کوئی نفلی نماز پڑھنا عیدگاہ میں بھی اور دوسری جگہ بھی مکروہ ہے۔ اور نمازِ عید کے بعد صرف عیدگاہ میں نفل پڑھنا مکروہ ہے۔ نمازِ عید کے بعد دوسری جگہ نفل پڑھی جا سکتی ہے۔ یہ حکم عورتوں اور ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو کسی وجہ سے نمازِ عید نہ پڑھ سکیں۔[6]

۳۔ شہر کی مسجد میں اگر گنجائش ہو تب بھی باہر عیدگاہ میں نمازِ عید ادا کرنا افضل ہے اور

[1] نور الایضاح [2] مراقی الفلاح [3] درمختار [4] درمختار [5] شامی [6] شامی

ایک شہر کے کئی مقامات پر بھی نماز عید کا پڑھنا جائز ہے۔[1]

۴۔ نماز عید سے پہلے نہ اذان کہی جاتی ہے نہ اقامت (تکبیر)۔[2]

نماز کا طریقہ:

۵۔ پہلے اس طرح نیت کرے کہ میں دو رکعت واجب نماز عید چھ واجب تکبیروں کے ساتھ پڑھتا ہوں اور مقتدی امام کی اقتدا کی بھی نیت کرے۔ نیت کے بعد تکبیر تحریمہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہتے ہوئے دونوں ہاتھوں کو کانوں تک اٹھا کر ناف کے نیچے باندھ لے اور سُبْحَانَکَ اللّٰهُمَّ آخر تک پڑھ کر تین مرتبہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہے اور ہر مرتبہ تکبیر تحریمہ کی طرح دونوں ہاتھوں کو کانوں تک اٹھائے اور تکبیروں کے بعد چھوڑ دے اور تیسری تکبیر کے بعد ہاتھ باندھ لے۔ اور ہر تکبیر کے بعد اتنی دیر توقف کیا جائے کہ تین مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰہِ کہا جا سکے۔

ہاتھ باندھنے کے بعد امام اَعُوْذُ بِاللّٰہِ، بِسْمِ اللّٰہِ پڑھ کر سورۂ فاتحہ اور کوئی سورت پڑھے اور مقتدی خاموش رہے۔ پھر رکوع سجدہ کے بعد دوسری رکعت میں پہلے امام فاتحہ اور سورت پڑھے، اس کے بعد رکوع سے پہلے تین مرتبہ پہلی رکعت کی طرح تکبیریں کہی جائیں اور تیسری تکبیر کے بعد بھی ہاتھ نہ باندھے جائیں، پھر ہاتھ اٹھائے اور پھر چوتھی تکبیر کہہ کر رکوع کیا جائے۔ مقتدی بھی امام کے ساتھ ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر تکبیر کہے اور باقی نماز دوسری نمازوں کی طرح پوری کی جائے۔[3]

۶۔ عید الاضحیٰ (بقر عید) کی نماز کے بعد بھی تکبیرِ تشریق کہنا بعض کے نزدیک واجب ہے، اس لیے عید الاضحیٰ کی نماز کے بعد بھی یہ تکبیر کہی جائے۔[4]

۷۔ چوں کہ عموماً ہر نماز کے بعد دعا مانگنا مسنون ہے اس لیے نماز عید کے بعد تو دعا مانگنا مسنون ہوگا، مگر خطبہ کے بعد مسنون نہ ہوگا۔[5]

۸۔ امام نماز کے بعد دو خطبے پڑھے۔ خطبہ کو تکبیر سے شروع کرے۔ پہلے خطبہ میں نو مرتبہ تکبیر کہے اور دوسرے خطبہ میں سات مرتبہ، اور دونوں خطبوں کے درمیان میں خطبہ جمعہ کی طرح اتنی دیر تک بیٹھے جس میں تین مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰہِ کہا جا سکے۔ عید الفطر کے خطبہ میں

۱۔ در مختار ۲۔ در مختار ۳۔ مراقی الفلاح ۴۔ در مختار ۵۔ امداد الفتاویٰ

صدقۂ فطر کے احکام اور عیدالاضحیٰ کے خطبہ میں قربانی اور تکبیر تشریق کے احکام بیان کیے جائیں۔ بہتر یہ ہے کہ جو شخص نماز پڑھائے خطبہ بھی وہی پڑھے۔ [۱]

۹۔ اگر امام عید کی تکبیر کہنا بھول جائے اور رکوع میں اس کو خیال آئے تو اس کو چاہیے کہ وہ بغیر ہاتھ اٹھائے حالت رکوع میں ہی تکبیریں کہہ لے۔ قیام کی طرف نہ لوٹے، اگر قیام کی طرف لوٹ آیا تب بھی نماز ہو جائے گی، فاسد نہ ہو گی، اور ہر حال میں بوجہ کثرت ازدحام کے سجدۂ سہو نہ کرے۔ [۲]

۱۰۔ اگر کوئی شخص عید کی نماز میں ایسے وقت شریک ہوا کہ امام عید کی تکبیروں سے فارغ ہو گیا ہو، تو اب اگر قیام میں شریک ہوا ہے تو نیت باندھنے کے فوراً بعد تکبیریں کہہ لے اگرچہ امام قراءت شروع کر چکا ہو۔ اگر رکوع میں شریک ہوا تو اگر گمان غالب ہو کہ تکبیریں کہنے کے بعد امام کا رکوع مل جائے گا تو نیت باندھ کر پہلے تکبیریں کہہ لے اس کے بعد رکوع میں جائے۔ اور اگر رکوع نہ ملنے کا خوف ہو تو رکوع میں امام کے ساتھ شریک ہو جائے اور حالت رکوع ہی میں بجائے تسبیح کے تکبیریں کہہ لے، مگر اس حالت میں تکبیر کہتے ہوئے ہاتھ نہ اٹھائے۔ اور اگر تین مرتبہ تکبیریں کہنے سے پہلے ہی امام رکوع سے سر اٹھائے تو یہ مقتدی بھی کھڑا ہو جائے اور جس قدر تکبیریں رہ گئی ہوں، وہ اس سے معاف ہیں۔ [۳]

۱۱۔ اگر کسی کی عید کی ایک رکعت رہ گئی ہو تو امام کے سلام کے بعد جب وہ اس کو ادا کرنے لگے تو پہلے قراءت کرے اس کے بعد یہ تکبیریں کہے۔ اگر دونوں رکعتیں رہ گئی ہوں، یعنی دوسری رکعت کے رکوع کے بعد کوئی شخص شریک ہوا تو امام کے سلام کے بعد وہ اسی طرح عید کی نماز ادا کرے جس طرح امام نے ادا کی ہے۔ یعنی پہلی رکعت میں سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ کے بعد قراءت سے پہلے تکبیریں کہے اور دوسری رکعت میں قراءت کے بعد کہے۔ [۴]

۱۲۔ اگر کسی کو عید کی نماز نہ ملی ہو یعنی امام کے سلام کے بعد آیا ہے تو وہ شخص تنہا نمازِ عید نہیں پڑھ سکتا۔ بلکہ جو شخص نمازِ عید میں شریک ہو گیا ہو اور پھر کسی وجہ سے اس کی نماز فاسد ہو گئی ہو اس پر بھی اس کی قضا واجب نہیں۔ ہاں، اگر اس کے ساتھ کچھ اور آدمی بھی شریک ہو جائیں تو پھر پڑھنا واجب ہے۔ [۵]

۱۔ درمختار ۲۔ درمختار و شامی ۳۔ درمختار و شامی ۴۔ درمختار ۵۔ درمختار

۱۳۔ اگر کسی عذر سے پہلے دن نمازِ عید نہ پڑھی جاسکی ہو تو عید الفطر کی نماز دوسرے دن کے زوال تک اور عید الاضحیٰ کی بارہویں تاریخ کے زوال تک پڑھی جاسکتی ہے۔[۱]

۱۴۔ عید الاضحیٰ میں بغیر عذر بھی بارہویں تاریخ تک تاخیر کرنے سے نماز ہو جاتی ہے مگر مکروہ ہوتی ہے، اور عید الفطر میں عذر کے بغیر تاخیر کرنے سے بالکل نماز ہوتی ہی نہیں۔

عذر کی مثالیں: کسی وجہ سے امام نماز پڑھانے نہ آیا ہو اور اس کے بغیر نماز پڑھنے میں فتنہ کا اندیشہ ہو، یا بارش ہو رہی ہو، یا چاند کی تاریخ کی تحقیق نہ ہوئی ہو اور زوال کے بعد جب نماز کا وقت جاتا رہا تو چاند کی تحقیق ہوئی ہو۔[۲]

۱۵۔ امام نے نمازِ عید پڑھائی پھر بعد میں معلوم ہوا کہ بغیر وضو پڑھائی گئی، اب اگر لوگوں کے متفرق ہونے سے پہلے معلوم ہوگیا تو امام وضو کرے اور لوگوں کو دوبارہ نماز پڑھائے، اور اگر لوگ متفرق ہو چکے ہوں تو نماز کا اعادہ نہ کیا جائے وہی نماز جائز ہوگی۔[۳]

۱۶۔ جس شخص کو عیدگاہ میں وضو کرنے سے نمازِ عید کے نہ ملنے کا خوف ہو تو وہ تیمم کر کے نماز میں شریک ہو جائے۔[۴]

۱۷۔ عید الاضحیٰ کے دن منیٰ میں چوں کہ مناسکِ حج میں مشغولیت ہوتی ہے اس لیے اہلِ منیٰ پر عید کی نماز واجب نہیں۔[۵]

صدقۂ فطر کے احکام

۱۔ جو مسلمان اتنا مالدار ہو کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہو، یا اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے لیکن ضروری اسباب سے زائد اتنی قیمت کا مال و اسباب ہے جتنی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، یعنی ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت کا مال و اسباب ہے تو اس پر عید الفطر کے دن صدقہ دینا واجب ہے، چاہے وہ سوداگری کا مال ہو یا سوداگری کا نہ ہو۔ اور چاہے اس پر سال گزر چکا ہو یا نہ گزرا ہو۔ اس صدقہ کو شریعت میں ''صدقۂ فطر'' کہتے ہیں۔[۶] البتہ اگر وہ قرض

---

[۱] درمختار [۲] درمختار و شامی [۳] شامی: ۱/۸۳۷

[۴] درمختار [۵] شامی بحوالہ مبسوط [۶] درمختار

دار ہے تو قرضہ مجرا کر کے دیکھا جائے گا، اگر اتنی قیمت کا اسباب بچ رہے جو اوپر مذکور ہے تب تو صدقۂ فطر واجب ہے ورنہ نہیں۔ جس طرح مال دار ہونے کی صورت میں مردوں پر صدقۂ فطر واجب ہے اسی طرح اگر عورت کے پاس کچھ مال اس کی ملکیت میں ہو جس کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر ہو۔ مثلاً: اس کے پاس زیور ہے جو اس کے والد کی طرف سے اس کو دیا گیا ہے یا خاوند نے زیور دے کر اس کو مالک بنا دیا ہے، تو عورت پر بھی اپنی طرف سے صدقۂ فطر واجب ہے۔

۲۔ مگر عورت پر کسی اور کی طرف سے ادا کرنا واجب نہیں، نہ بچوں کی طرف سے، نہ ماں باپ کی طرف سے نہ شوہر کی طرف سے۔[۱]

۳۔ البتہ مردوں پر جس طرح اپنی طرف سے صدقۂ فطر دینا واجب ہے، اسی طرح نابالغ اولاد کی طرف سے بھی صدقۂ فطر دینا واجب ہے۔ اگر اولاد مال دار نہ ہو تو پھر باپ کے ذمہ اپنے مال میں سے دینا واجب نہیں بلکہ اولاد کے مال میں سے ادا کرے اور بالغ اولاد کی طرف سے بھی دینا واجب نہیں۔ البتہ اگر کوئی بالغ لڑکا، لڑکی مجنون ہو تو اس کی طرف سے اس کا والد صدقہ ادا کرے۔[۲]

وقت وجوب صدقہ:

۴۔ عید کی صبح صادق کے وقت یہ صدقہ واجب ہوتا ہے۔ تو اگر کوئی شخص فجر کا وقت آنے سے پہلے فوت ہو گیا ہو اس پر صدقۂ فطر واجب نہیں،[۳] اس کے مال میں سے نہ دیا جائے۔ اسی طرح جو بچہ صبح صادق کے بعد پیدا ہوا ہو اس کی طرف سے صدقۂ فطر واجب نہیں ہے۔[۴] یہی حکم ہے اس شخص کا جو صبح صادق سے پہلے فقیر ہو گیا ہے کہ اس شخص پر صدقۂ فطر واجب نہیں۔[۵]

۵۔ مستحب یہ ہے کہ عید کے دن نماز سے پہلے یہ صدقہ دیا جائے اور اگر عید کے دن نہ دیا جائے تو معاف نہیں ہوا۔ اب کسی دن اس کی قضا کرنی لازمی ہے۔ اور اگر اس کو

---

[۱] درمختار و شامی [۲] درمختار و شامی [۳] ہاں جو بچہ صبح صادق سے پہلے پیدا ہوا اس کی طرف سے صدقۂ فطر واجب ہے۔
[۴] درمختار [۵] شامی

رمضان المبارک میں ہی ادا کر دیا گیا تب بھی ادا ہو گیا۔

۶۔ جس شخص نے کسی وجہ سے رمضان المبارک کے روزے نہیں رکھے اس پر بھی یہ صدقہ واجب ہے۔[۱]

صدقۂ واجب کی مقدار:

۷۔ صدقۂ فطر میں اگر گیہوں یا گیہوں کا آٹا، ستو دیا جائے تو نصف صاع یعنی پونے دو سیر بلکہ احتیاطاً دو سیر دے دینا چاہیے۔ اور اگر گیہوں اور جو کے علاوہ کوئی اور غلّہ دینا چاہے، جیسے: چنا، چاول، تو اتنا دیوے کہ اس کی قیمت نصف صاع گندم یا ایک صاع جو کے برابر ہو جائے۔ اور اگر غلّہ کی بجائے اس کی قیمت دی جائے تو سب سے افضل ہے۔[۲]

۸۔ ایک آدمی کا صدقۂ فطر کئی فقیروں کو اور کئی آدمیوں کا صدقۂ فطر ایک فقیر کو دینا جائز ہے۔[۳]

صدقہ کے مستحق:

۹۔ صدقۂ فطر کے مستحق بھی وہی لوگ ہیں جو زکوٰۃ کے مستحق ہیں، یعنی ایسے غریب لوگ جن کے پاس اتنا مال نہیں ہے جس پر صدقۂ فطر واجب ہوتا ہے۔

۱۰۔ صدقہ دینے میں اپنے غریب رشتہ داروں اور دینی علم کے سیکھنے سکھانے والوں کو مقدم رکھنا افضل ہے۔[۴]

۱۱۔ جن لوگوں سے یہ پیدا ہوا ہے، جیسے: ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی، اور اس طرح جو اس کی اولاد ہے، جیسے: بیٹا بیٹی، پوتا پوتی، نواسا نواسی، ان کو صدقۂ فطر نہیں دے سکتا۔ (ایسے ہی بیوی اپنے شوہر کو اور شوہر اپنی بیوی کو بھی صدقۂ فطر نہیں دے سکتا)۔[۵] ان رشتہ داروں کے علاوہ، جیسے: بھائی بہن، بھتیجا بھتیجی، بھانجا بھانجی، چچا چچی، پھوپھا پھوپھی، خالو خالہ، ماموں مامی، ساس سسر، سالہ، بہنوئی، سوتیلی ماں، سوتیلا باپ سب کو صدقۂ فطر دینا درست ہے۔[۶]

۱۲۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور حضرت عقیل رضی اللہ عنہ اور

---

[۱] عالمگیری [۲] درمختار [۳] درمختار [۴] درمختار [۵] درمختار [۶] شامی

حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ یا حارث بن عبدالمطلب کی اولاد کو صدقۂ فطر دینا درست نہیں ہے۔[1]

۱۳۔ صدقۂ فطر سے مسجد، مدرسہ، اسکول، غسل خانہ، کنواں، ناکا اور مسافر خانہ، پل، سڑک، غرضے کہ کسی طرح کی عمارت بنانا یا کسی میت کے کفن دفن میں خرچ کرنا یا کسی میت کی طرف سے اس کا قرضہ ادا کرنا، درست نہیں ہے۔ البتہ اگر کسی غریب کو اس کا مالک بنا دیا جائے، پھر وہ اگر چاہے تو اپنی طرف سے کسی تعمیر یا کفن دفن وغیرہ میں خرچ کر دے تو جائز ہے۔[2]

۱۴۔ کسی نوکر، خدمت گار، امام مسجد، وغیرہ کو ان کی خدمت کے عوض تنخواہ کے حساب میں صدقۂ فطر دینا درست نہیں ہے۔

۱۵۔ جب تک کسی شخص کے صدقۂ فطر کے مستحق ہونے کی تحقیق نہ ہو جائے اس وقت تک اس کو صدقہ نہیں دینا چاہیے۔ اگر بے تحقیق دے دیا پھر معلوم ہوا کہ وہ غریب ہی ہے تب تو ادا ہو گیا، ورنہ دیکھو کہ دل کیا گواہی دیتا ہے، اگر دل اس کے غریب ہونے کی گواہی دے تو ادا ہو گیا ورنہ پھر سے ادا کرے۔[3]

۱۶۔ ایک شہر سے دوسرے شہر میں صدقۂ فطر بھیجنا مکروہ ہے۔ ہاں اگر دوسرے شہر میں اس کے غریب رشتہ دار رہتے ہوں، یا وہاں کے لوگ زیادہ محتاج ہوں۔ یا وہ لوگ دین کے کام میں لگے ہوئے ہوں، تو ان کو بھیج دیا تو مکروہ نہیں، کیوں کہ طالب علموں اور دین دار غریب عالموں کو دینا بڑا ثواب ہے۔[4]

احکامِ عید الاضحیٰ

قربانی کے احکام:

۱۔ جتنے مال پر صدقۂ فطر واجب ہوتا ہے اتنے مال پر بقر عید کے دنوں میں قربانی کرنا بھی واجب ہے۔[5] اور اگر اتنا مال نہ ہو تو اس پر قربانی واجب تو نہیں ہے لیکن اگر پھر بھی

۱۔ درمختار ۲۔ درمختار ۳۔ شامی ۴۔ درمختار ۵۔ درمختار

کردے تو بہت ثواب ہے۔

فائدہ: قربانی کے دنوں میں جانور کے ذبح کرنے سے ہی قربانی ادا ہوتی ہے، جانور کے زندہ صدقہ کرنے یا اس کی قیمت کو خیرات کرنے سے قربانی ادا نہیں ہوتی، کیوں کہ قربانی ایک مستقل عبادت ہے اور صدقہ، خیرات علیحدہ ثواب کا کام ہے، اور ظاہر ہے کہ ایک عبادت کے ادا کرنے سے دوسری مستقل عبادت ادا نہیں ہوا کرتی، اس لیے صدقہ خیرات کرنے سے قربانی بھی ادا نہیں ہوتی۔ جیسے: صدقہ یا زکوۃ ادا کرنے سے نہ حج ادا ہوتا ہے نہ نماز ادا ہوتی ہے۔

۲۔ مسافر شرعی جو اڑتالیس میل کی مسافت کے ارادہ سے سفر شروع کر چکا ہو اس پر قربانی واجب نہیں ہے۔[1]

۳۔ اتنا مال جس پر قربانی واجب ہوتی ہے اگر کسی کی ملکیت میں بقرعید کی بارہ تاریخ کے سورج غروب ہونے سے پہلے ہی آیا ہو تو اس پر بھی قربانی واجب ہے۔ البتہ اگر اس نے اتنے مال کے ملکیت میں آنے سے پہلے قربانی کر دی تھی اور پھر بارہ تاریخ کے غروب سے پہلے مالدار ہو گیا تو بھی پہلی قربانی ہی کافی ہے۔[2] اسی طرح کوئی مسافر بارہ تاریخ کو غروبِ آفتاب سے پہلے اپنے گھر آ گیا ہو یا کسی جگہ اس نے پندرہ روز قیام کا ارادہ کر لیا ہو تو اس پر بھی قربانی واجب ہو جائے گی۔[3]

۴۔ قربانی جس طرح مردوں پر واجب ہوتی ہے اگر کسی عورت کی ملکیت میں اتنا مال ہو جس پر قربانی واجب ہوتی ہے تو عورت پر بھی قربانی واجب ہے۔

۵۔ جو مسلمان مرد یا عورت اتنے مال کا مالک ہو جس پر قربانی واجب ہوتی ہے جب تک اتنا مال اس کی ملکیت میں رہے گا اس پر ہر سال قربانی واجب ہوگی، صرف ایک سال قربانی کر دینا کافی نہیں ہے۔

۶۔ اگر کئی بھائی مشترک کاروبار کرتے ہوں اور ان کا کھانا پینا اور اخراجات بھی مشترک ہوں تو جو کچھ مال اس مشترک کاروبار سے حاصل ہو اس میں سے اگر ہر بھائی کے حصہ میں اتنا مال آتا ہو جس پر قربانی واجب ہوتی ہے تو ہر بھائی کے ذمہ جدا جدا قربانی واجب ہوگی، اور اگر

[1] درمختار [2] شامی [3] شامی

اتنے مال سے کم حصے میں آتا ہو تو کسی کے ذمہ بھی واجب نہیں ہے۔[1]

۷۔ اگر والد کی موجودگی میں اس کے ساتھ شریک ہو کر کئی بیٹے کاروبار کرتے ہوں اور کھانا پینا سب کا ایک جگہ ہو تو یہ کل مال والد کا ہوگا اور اسی کے ذمہ قربانی واجب ہوگی۔ ہاں اگر کسی بیٹے کی ملکیت میں کسی اور ذریعہ سے بقدر نصاب مال ہو یا کسی بیٹے کی بیوی کی ملکیت میں بقدر نصاب ہو تو اس بیٹے یا اس بیٹے کی بیوی پر علیحدہ قربانی واجب ہوگی۔[2]

قربانی صرف اپنی طرف سے کرنی واجب ہے، اولاد یا بیوی کی طرف سے قربانی کرنی واجب نہیں ہے۔ اگر ان کی ملکیت میں بقدر نصاب مال ہوگا تو ان پر بھی اُن کے مال میں سے قربانی واجب ہوگی۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی یا بالغ اولاد کی طرف سے قربانی کرنا چاہے تو جب تک ان کی اجازت نہ ہو ان کی طرف سے واجب قربانی ادا نہ ہوگی۔ ہاں، اگر وہ ہمیشہ ان کی طرف سے قربانی کیا کرتا ہے تو عادتاً ان کی طرف سے اجازت سمجھی جائے گی۔[3]

قربانی کا وقت:

۸۔ بقر عید کی دسویں سے لے کر بارہویں تاریخ کے سورج غروب ہونے سے پہلے تک قربانی کا وقت ہے، ان دنوں میں جس وقت چاہے قربانی کرے۔ مگر رات کو ذبح کرنا بہتر نہیں ہے اور سب سے افضل بقر عید کا دن ہے، پھر گیارہویں، پھر بارہویں تاریخ ہے۔ لیکن شہروں میں بقر عید کی نماز سے پہلے قربانی کرنی درست نہیں ہے اور دیہات میں دسویں کی صبح صادق کے بعد بھی قربانی کر دینا درست ہے۔[4]

۹۔ شہر میں اگر کسی نے بقر عید کی نماز سے پہلے قربانی کر دی تو اس کو دوبارہ قربانی کرنا ضروری ہے۔[5]

۱۰۔ جس شہر میں عید کی نماز کئی جگہ پڑھی جاتی ہو وہاں قربانی کے صحیح ہونے کے لیے صرف ایک جگہ نماز کا ادا ہو جانا کافی ہے۔[6] شہر میں نماز عید کے بعد قربانی کی گئی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ عید کی نماز کسی وجہ سے نہیں ہوئی، مثلاً: امام بغیر طہارت تھا، تو قربانی ہوگئی۔[7] اگر

[1] از فتاویٰ دار العلوم: ۲/ ۲۳۰ [2] از فتاویٰ دار العلوم: ۲/ ۲۳۰ [3] شامی

[4] درمختار [5] شامی [6] شامی [7] درمختار

گواہی کی بنا پر عید کی نماز پڑھی گئی اور قربانی کی گئی پھر ظاہر ہوا کہ گواہی غلط تھی اور وہ نویں کا دن تھا تو قربانی درست ہوگئی۔[۱] اگر کسی عذر سے پہلے دن شہر میں بقرعید کی نماز نہیں پڑھی گئی تو نماز کا وقت گزرنے پر زوال کے بعد قربانی جائز ہے اور گیارہویں اور بارہویں کے دن زوال سے پہلے بھی قربانی کرسکتے ہیں۔[۲] قربانی کا جانور اگر شہر میں ہے تو پھر چاہے قربانی کرنے والا گاؤں میں ہو نماز عید سے پہلے ذبح کرنا درست نہیں ہے اور اگر قربانی گاؤں میں ہو تو اس کا نماز عید سے پہلے صبح صادق کے بعد ذبح کرنا جائز ہے۔[۳] اگر قربانی کی تاریخ میں شک واقع ہو جائے تو مستحب ہے کہ تیسرے دن سے پہلے قربانی کرلے اور تیسرے دن ہی قربانی کی تو پھر مستحب یہ ہے کہ وہ قربانی ذبح کر کے مسکینوں کو تقسیم کردی جائے اور اس میں سے خود نہ کھایا جائے۔[۴]

قربانی کا جانور:

۱۱۔ بکری، بکرا، بھیڑ، دُنبہ، گائے، بیل، بھینس، بھینسا، اُونٹنی، اُونٹ، صرف ان جانوروں کی ہی قربانی جائز ہے۔ مرغی یا مرغا قربانی کی نیت سے ذبح کرنا مکروہِ تحریمی ہے۔

قربانی کی عمر:

۱۲۔ بکری، بکرا سال بھر سے کم، اور گائے، بیل، بھینس، بھینسا دو سال سے کم، اور اونٹ، اونٹنی پانچ سال سے کم عمر کا جائز نہیں ہے۔ اور بھیڑ، دُنبہ چکتی دار ہو یا بے چکتی ہو، اگر ایسا فربہ ہو کہ سال بھر کا معلوم ہوتا ہو تو چھ مہینے کا بھی جائز ہے۔[۵] اور اگر ایسا فربہ نہ ہو تو پھر سال بھر سے کم کا جائز نہیں۔[۶]

۱۳۔ بکرا، بکری، بھیڑ، دُنبہ کو صرف ایک شخص کی طرف سے قربانی کیا جاسکتا ہے، اور گائے، بیل بھینس، بھینسا، اونٹنی، اونٹ میں سات آدمی تک شریک ہوسکتے ہیں، اس سے زیادہ شریک نہیں ہوسکتے، اور سات سے کم دو، چار، چھ، جتنے بھی ہوں کچھ حرج نہیں، بشرطے کہ کسی کا حصّہ ساتویں حصّہ سے کم نہ ہو، اور سب کی نیت یا تو قربانی کرنے کی ہو پھر چاہے سب حصّہ داروں کی نیت واجب قربانی کی ہو یا بعض کی نفلی اور بعض کی واجب کی نیت ہو، یا بعض کی قربانی

۱۔ درمختار ۲۔ درمختار ۳۔ شامی ۴۔ عالمگیریہ ۵۔ درمختار ۶۔ شامی

کی نیت ہو اور بعض کی عقیقہ یا ولیمۂ نکاح کی نیت ہو۔[1] واجب قربانی کی ادائیگی کے لیے تو ہر شخص کا پورا بکرا وغیرہ یا گائے وغیرہ کا ساتواں حصہ ہونا ضروری ہے، لیکن ایصالِ ثواب کے لیے ایک قربانی کر کے اس کا ثواب کئی شخصوں کو پہنچایا جا سکتا ہے۔

۱۴۔ بہتر یہ ہے کہ قربانی کے جانور کو تمام حصہ دار مل کر خریدیں یا پھر ایک حصہ دار دوسرے حصہ داروں کی اجازت حاصل کر کے خریدے۔[2] اگر کسی شخص کا حصہ اس کی اجازت کے بغیر مقرر کر لیا گیا ہو تو اگر ذبح کرنے سے پہلے اس کی اجازت حاصل کر لی گئی تب تو قربانی درست ہو جائے گی ورنہ دوسرے حصہ داروں کی قربانی بھی صحیح نہ ہوگی، ہاں اگر کسی کی طرف سے قربانی کر کے اُس کو ثواب پہنچانا چاہے تو اس کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ دوسرے کی طرف سے واجب قربانی ادا ہونے کے لیے اس کی اجازت شرط ہے۔[3]

۱۵۔ جو جانور کسی کو حصہ پر پرورش کے لیے دیا گیا ہو تو یہ جانور اس پرورش کرنے والے کی ملک نہیں ہے، اس لیے اس کو پرورش کرنے والے سے نہ خریدا جائے بلکہ اصل مالک سے خریدا جائے۔[4]

۱۶۔ قربانی کا جانور خریدتے وقت اگر اوروں کو بھی شریک کرنے کا ارادہ ہو تو دوسروں کو شریک کر سکتا ہے اور اس میں کراہت بھی نہیں ہے، اور اگر خریدتے وقت صرف اپنی طرف سے ہی ذبح کرنے کا ارادہ تھا تو اب امیر کے لیے جس پر قربانی واجب ہے دوسرے کو شریک کرنا مکروہ ہے، اور غریب کے لیے جس پر قربانی واجب نہیں تھی دوسرے کو شریک کرنا درست نہیں۔ لیکن اگر وہ دوسرے کو شریک کرے گا تو شریک کرنے والے کی قربانی درست ہو جائے گی۔ مگر اس غریب پر واجب ہے کہ جتنے حصہ دوسروں کو دیے ہیں اتنے حصے کسی دوسرے جانور میں سے قربانی کرے، اگر قربانی کے دن باقی ہوں، ورنہ اتنے حصوں کی قیمت مسکینوں کو خیرات کر دے۔[5]

۱۷۔ اگر کوئی شخص اپنے مملوکہ جانور میں اپنے لیے ساتواں حصہ رکھ کر دوسرے حصوں کو فروخت کرنا چاہتا ہو تو اس کے لیے یہ بھی جائز ہے۔

۱۔ درمختار و شامی ۲۔ شامی ۳۔ شامی ۴۔ شامی ۵۔ شامی

۱۸۔ اگر قربانی کے تین دنوں میں خرید کر جانور کو قربانی کے لیے متعین کر دیا گیا ہو اب اس کے بدلہ میں دوسرا جانور اتنی ہی قیمت سے خرید کر قربانی کرنا بھی مکروہ ہے۔ اور اگر اس سے کم قیمت پر خریدا ہو تو باقی رقم صدقہ کرے۔[1]

۱۹۔ قربانی کی نیت سے خریدا ہوا جانور اگر مر گیا تو غریب پر جس پر قربانی واجب نہیں تھی دوسرے جانور کی قربانی لازم نہیں، اور امیر جس کے ذمہ قربانی واجب ہے اس پر دوسرا جانور خرید کر قربانی دینا واجب ہے۔[2]

۲۰۔ یہی حکم ہے ایسے جانور کے گم ہو جانے یا چوری ہو جانے کی صورت میں۔ یعنی غریب پر دوسرے جانور کی قربانی نہیں اور امیر پر دوسرے جانور کی قربانی واجب ہے۔ لیکن اگر غریب نے دوسرا جانور خرید لیا تو اس پر خریدنے کی وجہ سے دوسرے جانور کی قربانی ضروری ہو جائے گی۔ غریب کو اگر پہلا گم شدہ جانور بھی مل جائے تو وہ دونوں کی قربانی کرے گا۔ بخلاف امیر کے کہ پہلے جانور کے مل جانے کی صورت میں بھی اس پر صرف ایک ہی جانور کی قربانی واجب ہے۔ پھر اگر دونوں کی قیمت برابر ہے تو جس ایک کو چاہے ذبح کر دے اور اگر دونوں کی قیمتوں میں کمی بیشی ہے تو اگر پہلے جانور کی قربانی کی تو چاہے اس کی قیمت دوسرے سے کم ہو، اس صورت میں صدقہ لازم نہیں ہے، اور اگر دوسرے جانور کو ذبح کیا اور اس کی قیمت پہلے جانور سے کم تھی تو جتنی قیمت کم تھی اتنی قیمت کا صدقہ دے۔ یہ صدقہ کرنے کا حکم اس وقت ہے جب کہ وہ گم شدہ جانور دوسرے جانور کے ذبح کرنے سے پہلے مل گیا ہو، اور اگر دوسرا جانور پہلے ذبح کر دیا گیا ہو بعد میں گم شدہ ملا ہو تو یہ صدقہ کا حکم نہیں ہے، اگرچہ دوسرے جانور کی قیمت پہلے سے کم ہی کیوں نہ ہو۔[3]

اگر فقیر نے بکری قربانی کی نیت سے نہیں خریدی بلکہ اس کی گھر کی تھی یا کسی اور طریقہ سے اس کو حاصل ہوئی تھی، پھر اس نے قربانی کی نیت کر لی تو اس نیت سے قربانی واجب نہیں ہوتی۔ خریدتے وقت اگر قربانی کی نیت ہو تو واجب ہوتی ہے۔

۲۱۔ جو شخص قربانی کے لیے جانور متعین کر کے یا کسی جانور میں حصہ خرید کر فوت ہو گیا ہو

[1] شامی [2] در مختار [3] در مختار و شامی

اب اگر اس کے سب وارث بالغ ہوں تو سب کی اجازت سے قربانی جائز ہے۔ اگر ایک وارث بھی اجازت نہ دے گا تو قربانی نہ ہوگی، کیوں کہ اب وہ جانور یا حصّہ متوفی کے سب وارثوں کی ملکیت میں آگیا ہے۔ اور اگر اس کے وارثوں میں کوئی فرد نابالغ بھی ہے تو اب اس جانور کی قربانی نہ کی جائے، کیوں کہ نابالغ کی اجازت معتبر نہیں ہے۔[۱]

۲۲۔ جانور کے خریدتے وقت قربانی کی نیت تھی مگر ذبح بغیر نیت کے کر دیا تو قربانی ہو جائے گی۔ خریدتے وقت جو نیت تھی وہی کافی ہے۔[۲]

اگر جانور کا فروخت کرنے والا اس کی عمر پوری بتلاتا ہے اور ظاہری حالات اس کے بیان کو جھٹلاتے نہیں تو اس کا اعتبار کر لینا جائز ہے۔

۲۳۔ قربانی کے جانور پر بوجھ نہ لادے، سواری نہ کرے اور اس کو کرائے پر نہ دے، اس کا دودھ استعمال نہ کرے بلکہ اس کو صدقہ کر دے۔ اسی طرح اس کے بال اور اُون کا کترنا مکروہ ہے۔ اگر قربانی کرنے سے پہلے کتر لیے تو صدقہ کر دے۔[۳] ہاں اگر دودھ اور اُون بیچ کر اسی جانور کے لیے چارہ اور گھاس وغیرہ خرید لیا تو جائز ہے۔[۴]

قربانی کے عیب:

۲۴۔ جس جانور کے پیدائشی سینگ نہ ہوں یا بعد میں ٹوٹ گئے ہوں تو اس کی قربانی جائز ہے۔ ہاں اگر بالکل جڑ سے ٹوٹ گئے ہوں تو جائز نہیں۔[۵]

۲۵۔ جس جانور کے چھوٹے چھوٹے کان ہوں اس کی قربانی جائز ہے اور اگر ایک یا دونوں کان پیدائشی نہ ہوں یا ایک کان پورا کٹا ہوا ہو تو جائز نہیں ہے۔[۶]

۲۶۔ جس جانور کے دونوں کان تھوڑے تھوڑے کٹے ہوئے ہوں کان میں کئی سوراخ ہوں جو جمع کرنے سے تہائی سے زیادہ ہو جاتے ہوں تو احتیاط یہ ہے کہ اس جانور کی قربانی نہ کرے۔ اسی طرح کان یا دُم تہائی سے زیادہ کٹی ہو تو قربانی ناجائز ہے۔[۷]

۲۷۔ جو جانور اندھا یا اس کی ایک آنکھ کی بینائی تہائی سے زیادہ جاتی رہے تو اس کی

---

[۱] در مختار و شامی [۲] عالمگیریہ [۳] در مختار [۴] عالمگیریہ
[۵] در مختار [۶] در مختار و شامی [۷] شامی

قربانی جائز نہیں۔[1] اور اگر آنکھ کی نگاہ ترچھی ہو تو قربانی جائز ہے۔[2]

۲۸۔ جس جانور کی ناک کٹی ہوئی ہو اس کی قربانی ناجائز ہے۔[3]

۲۹۔ جس جانور کے دانت بالکل نہ ہوں اس کی قربانی ناجائز ہے اور اگر اس قدر باقی ہیں کہ گھاس وغیرہ چر سکتا ہے تو جائز ہے۔[4]

۳۰۔ جس جانور کی زبان تہائی سے زیادہ کٹی ہوئی ہو اس کی قربانی جائز نہیں۔[5]

۳۱۔ مخنث جانور کی قربانی جائز نہیں۔[6]

۳۲۔ جس جانور کا آلۂ تناسل کٹا ہوا ہو اور جماع کرنے سے عاجز ہو اس کی قربانی جائز ہے۔[7]

۳۳۔ خصی جانور کی قربانی درست بلکہ افضل ہے۔[8]

۳۴۔ جس جانور کے تھن بالکل کٹے ہوئے ہوں یا ایک تھن تہائی سے زیادہ کٹا ہوا ہو اس کی قربانی جائز نہیں اور اگر بیماری کی وجہ سے بھیڑ، بکری کا ایک تھن یا گائے اور بھینس اور اُونٹنی کے دو تھن سوکھ گئے ہوں تو قربانی جائز نہیں۔[9]

۳۵۔ جس جانور کا پاؤں کٹا ہوا ہو اس کی قربانی جائز نہیں۔[10]

۳۶۔ جو جانور ایسا لنگڑا ہو کہ فقط تین پاؤں سے چلتا ہو، چوتھا پاؤں زمین پر نہیں رکھ سکتا یا رکھ سکتا ہے مگر اس کے بل چل نہیں سکتا تو اس کی قربانی جائز نہیں۔ اور اگر چوتھا پاؤں ٹیک کر چل سکتا ہے تو جائز ہے۔[11]

۳۷۔ ایسے دُبلے کمزور جانور کی قربانی ناجائز ہے جس کی ہڈی میں گودا نہ رہا ہو، اگر اتنا کمزور نہ ہو تو جائز ہے۔[12]

۳۸۔ مجنون جانور اگر چل پھر کر چر سکے اور جس جانور کو خارش (کھجلی) ہو اور موٹا ہو تو اس کی قربانی جائز ہے۔[13] اور اگر دونوں اتنے کمزور ہو گئے ہوں کہ ان کی ہڈی میں گودا نہ رہا

---

[1] فتاویٰ قاضی خان [2] عالمگیریہ [3] عالمگیریہ [4] درمختار وشامی
[5] شامی [6] درمختار [7] شامی [8] شامی
[9] شامی [10] شامی [11] شامی [12] درمختار [13] درمختار

ہوتو پھر قربانی جائز نہیں ہے۔[1]

۳۹۔ جو جانور زیادہ عمر ہونے کی وجہ سے بچہ دینے کے قابل نہیں ہے، اور جس کو کھانسی ہو، اور جس کے بدن کو گرم لوہے سے داغ دیا گیا ہو، اور جس کا کان چرا ہوا ہو، یا اس میں سوراخ ہو بشرطے کہ سوراخ کان کی تہائی سے کم ہو، ان کی قربانی جائز ہے۔[2]

۴۰۔ مستحب یہ ہے کہ قربانی کے جانور میں جائز عیبوں میں سے بھی کوئی عیب نہ ہو۔[3]

۴۱۔ اگر قربانی کے جانور کو خریدنے کے بعد کوئی ایسا عیب لگ گیا کہ جس سے قربانی نہیں ہوسکتی تو قربانی کرنے والا اگر غنی ہے جس پر قربانی واجب ہے تو دوسرا جانور خرید کر قربانی کرے اور اگر غریب ہے تو اسی کو ذبح کردے۔[4]

۴۲۔ اگر خریدتے وقت وہ جانور عیب دار تھا تو غریب کے لیے اسی حالت میں اس کی قربانی جائز ہے اور امیر کے لیے اس وقت جائز ہے جب کہ اس کا عیب جاتا رہا ہو۔ مثلاً: پہلے بہت کمزور اور لاغر تھا بعد میں موٹا ہو گیا ہو۔[5]

مسائل ذبح:

۴۳۔ اگر جانور کو ذبح کرتے وقت گرنے یا تڑپنے سے کوئی ایسا عیب لگ گیا جو قربانی کو مانع ہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔[6]

۴۴۔ حاملہ جانور کی قربانی درست ہے۔ البتہ جو جانور بچہ دینے کے قریب ہو اس کو ذبح کرنا مکروہ ہے۔[7]

اگر قربانی کے جانور کے بچہ پیدا ہو جائے تو اس بچہ کو زندہ ہی صدقہ کر دینا مستحب ہے اور اگر ذبح کر دیا تو اس کا گوشت نہ کھائے بلکہ صدقہ کردے اور ذبح کرنے سے اُس کی اس قیمت میں جو زندہ ہونے کی صورت میں تھی، جو کمی واقع ہوئی اتنی رقم بھی صدقہ کردے۔ اور اگر گوشت کھالیا تو اس کی قیمت بھی صدقہ کرے۔ اور اگر اس بچہ کو اس خیال پر رکھ لیا کہ آئندہ سال قربانی کروں گا تو یہ ناجائز ہے۔[8]

---

[1] شامی [2] شامی [3] شامی [4] درمختار

[5] شامی [6] درمختار [7] شامی [8] شامی

۴۵۔ مستحب ہے کہ قربانی کا جانور اپنے ہاتھ سے ذبح کرے اور اگر خود ذبح نہ کر سکے تو دوسرے کو حکم کرے اور خود ذبح کے وقت حاضر رہے۔[۱]

فائدہ: اگر وہاں کوئی غیر محرم نہ ہو تو عورت کو بھی اپنی قربانی کے پاس کھڑا ہونا مستحب ہے ورنہ پردہ ضروری ہے۔[۲]

۴۶۔ قربانی کی کھال اور گوشت وغیرہ سے قصاب کو اُجرت دینا منع ہے۔[۳]

۴۷۔ قربانی کرنے والے نے ذبح کرنے والے کے ساتھ ذبح کے لیے چُھری ہاتھ میں پکڑی۔ اب ذبح کے وقت ان دونوں میں سے اگر ایک نے بھی دانستہ بِسْمِ اللّٰہِ چھوڑ دی تو جانور حرام ہو جائے گا۔[۴]

۴۸۔ مستحب یہ ہے کہ قربانی کے جانور کو پہلے چند روز گھر باندھ رکھے اور اس کو جھول پہنائے اور اس کے گلے میں قلادہ یعنی چمڑے وغیرہ کا کوئی ٹکڑا لٹکائے اور ذبح کرتے وقت اسے آرام اور نرمی کے ساتھ لٹائے۔ چھری کو پہلے اچھی طرح تیز کرے اور ذبح کے بعد جب جانور ٹھنڈا ہو تب اس کی کھال اُتارے۔ اس سے پہلے کھال اُتارنا مکروہ ہے۔ اسی طرح جانور کو لٹا کر اس کے سامنے چھری تیز کرنا یا اور کوئی بے ضرورت تکلیف دینا مکروہ ہے، اور روح نکلنے سے پہلے حرام مغز تک چُھری پہنچا کر سر الگ کرنا مکروہ ہے۔[۵]

۴۹۔ ذبح کرنے والے کو ذبح کرتے وقت قبلہ کی طرف منہ کرنا سنتِ مؤکدہ ہے۔ اس کا ترک بغیر عذر مکروہ ہے۔[۶]

تنبیہ: مرتد، زندیق، قادیانی کا ذبیحہ حرام ہے۔ ان سے ذبیحہ نہ کرائیں نہ قربانی کے موقع پر نہ اور کسی وقت۔

قربانی کا گوشت اور کھال:

۵۰۔ قربانی کے گوشت کا خود کھانا اور رشتہ داروں، مال داروں میں تقسیم کرنا اور فقیروں

---

[۱] درمختار [۲] إفادة العوام مؤلفہ حضرت مفتی عبدالکریم صاحب گمتھلوی رحمۃ اللہ علیہ
[۳] درمختار [۴] درمختار [۵] عالمگیریہ [۶] درمختار

محتاجوں کو خیرات کرنا سب جائز ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تہائی گوشت سے کم خیرات نہ کرے، لیکن اگر کسی نے تہائی سے کم خیرات کیا تو بھی کوئی گناہ نہیں ہے۔[1] البتہ منت (نذر) کی قربانی کا سب گوشت فقیروں کو خیرات کرنا ضروری ہے، اس میں سے نہ خود کھا سکتا ہے نہ امیروں کو دے سکتا ہے۔[2]

۵۱۔ کسی نے میت کو ثواب پہنچانے کے لیے اپنے مال کی قربانی کی تو اس گوشت میں سے کھانا کھلانا تقسیم کرنا سب درست ہے۔ اور اگر میت کی وصیت پر اس کے ترکہ میں سے قربانی کی گئی ہو تو اس قربانی کے تمام گوشت وغیرہ کا خیرات کر دینا واجب ہے۔[3]

۵۲۔ اگر کسی شخص نے پچھلے سال کی فوت شدہ قربانی کی نیت سے کسی جانور میں شرکت کی تو اس قربانی کا سارا گوشت خیرات کرنا واجب ہے، کہ نہ اس شخص کو اس کا استعمال کرنا جائز ہے نہ اس کے دوسرے حصہ داروں کو جائز ہے۔

۵۳۔ قربانی کا گوشت بیچنا مکروہ ہے۔[4] اسی طرح قربانی کے سری، پائے اور اس کی چربی کا بیچنا حلال نہیں۔ اگر کسی نے ان چیزوں کو بیچ دیا ہو تو ان کی قیمت کو صدقہ کرے۔[5]

۵۴۔ قربانی کے ذبح ہو جانے کے بعد اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اپنے حصہ کے دام کسی سے لے کر اپنا حصہ اس کو دے دے تو یہ جائز نہیں۔

۵۵۔ قربانی کی کھال کا بعینہٖ ڈول، مصلّی وغیرہ بنا کر خود استعمال کرنا بھی جائز ہے اور کسی امیر کو دے دینا بھی جائز ہے، اور اگر اس کھال کو ایسی چیز سے تبدیل کر لیا کہ بعینہٖ اس چیز کے وجود سے کچھ مدت تک نفع حاصل ہو سکتا ہو، جیسے: مشک، چھلنی، جائے نماز، کپڑا وغیرہ، تو یہ بھی جائز ہے۔[6] لیکن اگر کسی ایسی چیز سے تبدیل کیا ہے جس کے وجود سے بعینہٖ نفع حاصل نہیں کیا جا سکتا یا اس کو روپیہ پیسے کے ساتھ فروخت کر دیا گیا تو اب اس کی قیمت کو خود استعمال نہیں کر سکتا نہ کسی امیر کو دے سکتا ہے، بلکہ اس کو صدقہ کر دیا جائے۔[7]

۵۶۔ اس صدقہ کے مستحق وہی لوگ ہیں جن کا ذکر صدقۂ فطر کے بیان میں ہو چکا ہے،

۱۔ درمختار ۲۔ درمختار ۳۔ درمختار ۴۔ درمختار

۵۔ فتاویٰ دار العلوم بحوالہ عالمگیری ۶۔ درمختار ۷۔ درمختار

وہاں دیکھا جائے۔

جس جانور میں کئی حصہ دار ہوں تو اگر تقسیم کرنا چاہیں گوشت کو وزن کر کے تقسیم کیا جائے، اندازہ سے تقسیم نہ کیا جائے۔ اور اگر تقسیم نہ کرنا چاہیں کہ ایک جگہ ہی فقرا کو تقسیم کرنا اور پکا کر کے کھانا کھلانا چاہیں تو یہ بھی جائز ہے۔[۱]

فائدہ: مدارس اسلامیہ کے طلبا اس صدقہ کے بہترین مصرف ہیں، اس میں صدقہ کا ثواب بھی ہے اور علم دین کا اِحیا بھی۔ مگر کسی خدمت اور معاوضہ میں اس کا دینا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح قربانی کے جانور کی رسی وغیرہ سب کو صدقہ کردے۔[۲]

تنبیہ: بعض لوگ چرم قربانی کی قیمت بیوہ عورتوں کو دے دیتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ ان کے پاس سونا، چاندی کا زیور یا نقدی تو بقدر نصاب نہیں ہے، اسی طرح یہ دستور ہے کہ اس کی قیمت کو بہنوں وغیرہ کا حق سمجھا جاتا ہے اور مال دار بہنوں بیٹیوں کو بھی دے دیتے ہیں، یہ درست نہیں، البتہ بیوہ عورت یا بہن اگر غریب ہو تو اس کو دے سکتے ہیں۔

قربانی کی قضا:

۵۷۔ اگر کسی شخص نے پچھلے سالوں کی واجب قربانی ادا نہ کی ہو تو اس کو ہر سال کی قربانی کے عوض قربانی کی قیمت کا صدقہ میں دینا واجب ہے۔ قربانی کے ایام گزرنے کے بعد قربانی نہیں کرسکتا۔

۵۸۔ اگر کوئی شخص قربانی کے دنوں میں مال دار تھا لیکن اس نے قربانی نہیں کی، پھر ان دنوں کے گزرنے کے بعد وہ شخص غریب ہوگیا۔ اب اگر اس نے قربانی کا جانور خریدا تھا تو اس کو صدقہ کردے ورنہ اتنی رقم خیرات کرے جس سے قربانی ہوسکتی ہے۔[۳]

۵۹۔ اگر کوئی شخص مال دار ہو اور اس نے قربانی نہ کی ہو اور نہ ہی قربانی کے دنوں کے گزرنے کے بعد اتنی رقم قربانی کے عوض خیرات کی ہو جس سے قربانی ہوسکتی ہو، تو اس پر واجب ہے کہ وہ وصیت کرے کہ اس کی طرف سے اس کے وارث قربانی کی قیمت صدقہ کریں۔[۴]

---

[۱] شامی [۲] شامی [۳] قاضی خان [۴] فتاویٰ عالمگیریہ

اگر قربانی کے لیے جانور خریدا اور قربانی کے دنوں میں ذبح نہ کیا ہو تو اب اس قربانی کی قضا کے ارادے سے اس کو آیندہ سال ذبح کرنا جائز نہیں، بلکہ اس جانور کو زندہ صدقہ کرنا واجب ہے۔ اگر ذبح کرلیا تو اس کا گوشت کھانا اسے جائز نہیں بلکہ ذبح کرنے سے جانور کی قیمت میں جو نقصان ہوا وہ رقم اور اس کا تمام گوشت پوست خیرات کردے۔[1]

عشرۂ ذوالحجہ کے متفرق مسائل

۱۔ جو شخص قربانی کا ارادہ رکھتا ہو اس کے لیے مستحب یہ ہے کہ وہ ذوالحجہ کا چاند دیکھنے کے بعد بال، ناخن کٹانے اور حجامت بنوانے سے دسویں تاریخ تک رُکا رہے۔

۲۔ بقرعید کی پہلی تاریخ سے لے کر نو تاریخ تک ہر دن کا روزہ رکھنا، ایک ایک دن کا روزہ ثواب میں سال بھر کے روزوں کے برابر ہے، اور نویں تاریخ یعنی عرفہ کے دن کے روزہ کا ثواب دو سال کے روزوں کے ثواب کے برابر ہے، پھر دسویں سے لے کر تیرہویں تک روزہ رکھنا حرام ہے۔

فائدہ: ذوالحجہ کی نو تاریخ جس دن عرفات کے میدان میں حاجی حج کے لیے جمع ہوتے ہیں اس دن کو عرفہ کہتے ہیں۔ شریعت میں سال بھر کے اندر بس یہی دن عرفہ ہے، کم علم لوگوں نے اور بھی کئی دنوں کا نام اپنی طرف سے عرفہ رکھ لیا جو کہ غلط ہے۔

تکبیرِ تشریق: تکبیرِ تشریق نویں ذوالحجہ کی نماز فجر کے بعد سے تیرہویں تاریخ کی عصر کی نماز کے بعد تک ہر فرض عین کا سلام پھیرتے ہی ایک مرتبہ بلند آواز سے کہنا واجب ہے۔ البتہ عورتیں آہستہ آہستہ سے کہیں۔[2]

تنبیہ: بہت سے لوگ اس میں غفلت کرتے ہیں، اس تکبیر کو پڑھتے نہیں یا آہستہ پڑھ لیتے ہیں، حالاں کہ اس کا درمیانہ طریقہ پر بلند آواز سے پڑھنا واجب ہے، اس کی اصلاح ضروری ہے۔

فائدہ: ماہ ذوالحجہ کی گیارہویں، بارہویں، تیرہویں تین تاریخوں کو ایامِ تشریق کہتے ہیں۔

---

۱ شامی ۲ شامی

تشریق کے معنی ہیں گوشت کو دھوپ میں ڈالنے کے۔ چوں کہ ان دنوں میں قربانی کا گوشت سکھایا جاتا ہے اس لیے دسویں تاریخ کے بعد ان تین دنوں کو ایام تشریق کہا جاتا ہے۔

۳۔ تکبیرِ تشریق یہ ہے: اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ.

۴۔ نمازِ جنازہ اور وتروں، سنتوں کے بعد یہ تکبیریں نہ کہی جائیں۔

۵۔ تکبیرِ تشریق امام، مقتدی اور منفرد (تنہا نماز پڑھنے والا) عورت، مرد، مسافر، مقیم، شہر والوں اور گاؤں والوں سب پر واجب ہے۔[1]

۶۔ اگر امام نے یہ تکبیر نہ کہی ہو خواہ قصداً خواہ بھول سے تو مقتدیوں کو پھر بھی تکبیر کہنا ضروری ہے۔

۷۔ جن دنوں میں یہ تکبیر کہی جاتی ہے اگر ان دنوں کی کوئی نماز رہ گئی ہو اب اگر اس کی قضا اسی سال کے ان ہی دنوں میں کی جائے گی تب تو یہ تکبیر کہی جائے گی ورنہ نہیں۔ مثلاً: نویں تاریخ کی نماز کی قضا اسی سال کی دسویں کو کی جائے تو تکبیر بھی نماز کے بعد کہی جائے، اور اگر اس کی قضا ان دنوں کے گزرنے کے بعد یا اگلے سال کے ان ہی دنوں میں کی جائے، اسی طرح ان دنوں سے پہلے کی قضا نماز اگر ان دنوں میں پڑھے تو یہ تکبیر نہ کہے۔

۸۔ مسبوق جس کی رکعت رہ گئی ہو وہ بھی اپنی رکعت پوری کرنے کے بعد یہ تکبیر کہے گا۔ لیکن اگر بھول کر امام کے ساتھ تکبیر تشریق کہہ لے تو بھی نماز ہوگئی اور لاحق جس کی رکعت امام کی اقتدا کرنے کے بعد رہ گئی ہو اس پر بھی یہ تکبیر واجب ہے۔

۹۔ نماز کا سلام پھیرنے کے بعد جب تک قبلہ سے سینہ نہ پھیرا ہو اور نہ کوئی ایسا کام کیا ہو جس سے نماز کی بنا ممنوع ہو جاتی ہے، اس وقت تک یہ تکبیر کہنا ضروری ہے۔ نماز کے سلام کے بعد اگر کسی نے قہقہہ لگایا، یا عمداً حدث کیا، یا کلام کیا تو اب یہ تکبیر نہیں کہہ سکتا۔ البتہ اگر سلام کے بعد خود بخود حدث ہوگیا ہو تو یہ تکبیر کہہ لے کیوں کہ ان کے لیے وضو شرط نہیں ہے۔[2]

---

[1] در مختار [2] مراقی

الحمدللہ کہ آج ۲۹ ذوالقعدہ ۹۲ھ بروز جمعہ أحکام العیدین کا مسودہ پورا ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو قبول اور نافع بنائیں۔ آمین!

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَیْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِیْنَ.

مطبوعات البشریٰ

اردو و فارسی مطبوعات درس نظامی

- خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی
- معین الفلسفہ
- معین الاصول
- فوائد مکیہ☆
- آسان منطق
- علم الصرف (اولین، آخرین)
- عربی صفوۃ المصادر
- جمال القرآن☆
- نحو میر
- میزان و منشعب
- آسان نحو (اول، دوم)
- تعلیم الاسلام☆
- عربی زبان کا آسان قاعدہ
- پنج گنج
- پند نامہ☆
- بہشتی زیور (تین حصے)
- حیات المسلمین
- آداب المعاشرت☆
- تعلیم الدین☆
- لسان القرآن (اول، دوم، سوم)
- مفتاح لسان القرآن (اول، دوم، سوم)

- خیر الاصول☆
- آسان اصول فقہ
- تیسیر المنطق
- فصول اکبری
- تاریخ اسلام
- علم النحو
- جوامع الکلم☆
- صرف میر
- تیسیر الابواب
- آسان صرف (اول، دوم، سوم)
- بہشتی گوہر
- تسہیل المبتدی
- فارسی زبان کا آسان قاعدہ
- کریما☆
- تیسیر المبتدی
- عربی کا معلم (اول تا چہارم)
- تکمیل جدید (مفتاح عربی کا معلم) (اول تا چہارم)
- تعلیم العقائد☆
- سیر صحابیات
- الانتخابات المفیدۃ

دیگر اردو مطبوعات

نماز

- آسان نماز☆
- نماز مدلل☆
- نمازیں سنت کے مطابق پڑھیے☆
- مسنون نماز کی چالیس حدیثیں☆

- نماز حنفی
- آئینہ نماز☆
- اپنی نمازیں درست کیجیے
- رسول اکرم ﷺ کا طریقۂ نماز

علم حدیث

- حدیث رسول ﷺ کا قرآنی معیار
- امام ابن ماجہ اور علم حدیث

- امام اعظم اور علم حدیث
- راہ سنت

حدیث

- ترجمان السنۃ
- معراج کی باتیں

- منتخب احادیث
- جواہر الحدیث

تجوید

- تسہیل القواعد
- قواعد مخارج تجوید

سیرت رسول اللہ ﷺ

- النبی الخاتم ﷺ
- جامع الاخلاق
- خطبات مدراس
- نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب ﷺ

- سیرت سید الکونین خاتم النبیین ﷺ
- رسول اللہ ﷺ کے مکتوبات شریفہ
- سیرۃ الرسول ﷺ

حج و عمرہ

- فضائل حج
- کتاب الحج☆
- حج کا طریقہ قدم بہ قدم

- معلم الحجاج
- مسائل و معلومات حج و عمرہ

عقائد

- تعلیم العقائد☆
- اسلام اور عقلیات
- عالم برزخ

- تعلیمات اسلام
- اکابر علماء دیوبند اور ان کے عقائد

فضائل

- فضائل اعمال (اردو) (پشتو)
- فضائل صدقات
- فضائل علم
- فضائل استغفار☆
- فضائل قرآن
- فضائل ذکر

- فضائل درود شریف
- فضائل تجارت☆
- فضائل امت محمدیہ ﷺ☆
- فضائل نماز
- فضائل رمضان
- فضائل تہجد

فضائل ندامت
فضائل توبہ و استغفار
حیاۃ الاعمال ☆
فضائل مسواک
فضائل زبان عربی
بارہ مہینوں کے فضائل و احکام

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

حیاۃ الصحابہ رضی اللہ عنہم
خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم
کرامات صحابہ رضی اللہ عنہم
سوانح ابی ذر غفاری رضی اللہ عنہ

صحابیات رضی اللہ عنہن

سیر صحابیات
نیک بیبیاں
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیاں
امت مسلمہ کی مائیں رضی اللہ عنہن
سیرت عائشہ رضی اللہ عنہا

فقہ

بہشتی زیور مدلل (مکمل)
دلیل الخیرات فی ترک المنکرات
وصیت اور میراث کے احکام ☆

معاشرت

حقوق الوالدین ☆
صفائی معاملات
اصلاح النساء
پردہ کے شرعی احکام
اکرام المسلمین مع حقوق العباد کی فکر کیجیے
تحفۃ النکاح
حقوق العلم ☆
آداب معیشت ☆
اصلاح خواتین
شرعی پردہ
اکرام مسلم
کسب حلال و ادائے حقوق

مسنون علاج

الحجامہ (جدید ایڈیشن مع اضافہ مفیدہ)
مختصر الحجامہ

دعوت و تبلیغ

اصول دعوت اسلام
تبلیغی تقریریں
مکاتیب مولانا الیاس رحمہ اللہ
قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟
انسانیت کا امتیاز
فضائل تبلیغ

اصلاحی کتب

آداب المعاشرت ☆
تعلیم الدین ☆
تبلیغ دین امام غزالی رحمہ اللہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحتیں ☆
حیلے اور بہانے
روضۃ الادب
علیکم بسنتی ☆
زندگی سے بیزاری کیوں؟ ☆
موت کی یاد ☆
سال بھر کے مسنون اعمال ☆
اخبار الزلازل
کامیابی
تقلید و اجتہاد
اصلاح انقلاب امت
انفاس عیسیٰ
ہوم مسکراؤ تو سب مسکرائیں
ترقی
التبلیغ فی الاسلام
افادات العوام
آداب المتعلمین
حیات المسلمین ☆
مرحبا بطالب العلم
مجموعہ وصایا امام اعظم رحمہ اللہ
علامات قیامت ☆
خطبات الاحکام ☆
اسلامی سیاست مع تکملہ
ایک مسلمان کس طرح زندگی گزارے؟ ☆
مرنے کے بعد کیا ہوگا؟
شوق وطن
اعجاز القرآن ☆
اجتہاد اور تقلید
افادات محمود
دنیا و آخرت
اصلاح الرسوم
فروع الایمان
تحفۃ المسلمین (مکمل)
تحفہ خواتین
حقوق الاسلام
حقوق الوالدین (تھانوی رحمہ اللہ)
حقانیت اسلام
داڑھی کا وجوب مع داڑھی کی قدر و قیمت مع داڑھیاں بڑھانے کا حکم

جس کتاب کے ساتھ ☆ کی علامت ہے اس کا جیبی سائز بھی دستیاب ہے۔

www.maktaba-tul-bushra.com.pk
al-bushra@cyber.net.pk


فضائل علم
تجارت
الوالدین
سیاست
حیاۃ الصحابہ
تبلیغ دین
اصلاح الرسوم
جواہر الحدیث